

بنا ۲۱ گانہ
 خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
 آہ کس دن کے لئے با حق پرستی کیجئے

ایمان و حیدر

(جدید)

امام الغزل
 میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی
 مع محاضرات

میرزا مراد بیگ حقانی
 حسب فرمایش جناب میرزا آغا جان صبا چنگیزی
 (اعظم اسٹیٹ پریس حیدر آباد دکن میں چھپی)

۱۹۷۵ء

نہایت (محبوب) عالی

ایاتِ جدید

(جدید)

امام الغزل

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

(قیمت ۱۳ روپے)

Scanning Project 2015

Book No.54

Donated By:
Shabnam Aman

Special Courtesy :
Salman Siddqui

Managed By:
Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com
www.wadi-e-urdu.com



Meerza Yagana, the Arch-Artist Poet of India
with his son, Meerza Aghajan Changezi

۸۶
دلِ طوفانِ تشنگین نہا جو آگے تھا سوا ب بھی ہے
بہت طوفانِ بخند پرے آگے ملک کے ساحل سے
منیر چغتائی

تبصرہ

(پروفیسر مجنوں گورکھپوری۔ بھکار چوری ۱۹۲۷ء)

میرزایا سینگانہ اردو غزل میں پہلے شخص ہیں جن کی شاعری میں وہ کس بل محسوس ہوتا ہے جس کو ہم صحیح اور توانا زندگی سے منسوب کرتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی میں کسی موقع پر کہہ چکا ہوں کہ یگانہ پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی کا حیرتوںی رخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ غزل کو جواب تک صرف حسن و عشق کی شاعری سمجھی جاتی رہی ہے یگانہ نے زندگی کی شاعری بنادیا اور انسان اور کائنات کی ہستی کے رموز و اشارات کو اپنی غزلوں کا موضوع قرار دیا۔ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ ان کے ہاں حسن و عشق سے متعلق اشعار نہیں ملتے ہیں مگر ان میں بھی حسن و عشق کا احساس عام اور عالمگیر زندگی کے احساس میں سمویا اور کھویا ہوا ہوتا ہے۔

یگانہ اس کشاکش اور تضاد کا احساس ہمارے اندر بڑی سہولت اور کامیابی کیسا بھید کر دیتے ہیں جو زندگی کا اصل راز ہے اور جس کا احساس عصر جدید کا سب سے بڑا اکتساب ہے۔ مگر وہ اس احساس ہمیں

میرا سیر نہیں کرتے۔ اُن کی غزلوں کی سب نمایاں خصوصیت 'مردانہ عزم و اعتماد' ہے۔ انہوں نے غزل میں واقعی بے شکستی کی ہے۔ روایتی موضوعات اور اسالیب دونوں سے انحراف کر کے ہم کو غزل کی امکانی وسعتوں سے آگاہ کر دیا ہے۔ پھر چونکہ بیکانہ نے اور شعر کی طرح زبان کو کبھی توڑا ٹوڑا نہیں بلکہ اک واقف کارانہ اعتماد ایک ماسرہ و ثوق کے ساتھ قاعدے اور ضابطے کے ساتھ اجتہادات کئے اس لئے ٹھٹھے کڑ زبان کا تقاد بھی اُن کے اکتسابات کو بدعت نہ کہہ سکا۔ اسالیب و موضوعات دونوں میں اُن کے اجتہادات تسلیم کر لئے گئے۔ اُن کے ہاں ماضی کے بہترین عناصر پائے جاتے ہیں مگر وہ مستقبل کی تعمیر میں کام لے رہے ہیں۔ بیکانہ ان لوگوں میں ہیں جن کے کلام کی پہنائی میں غزل کی ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو سکتی ہے جو اس قابل ہو کہ زندگی کے نئے میلانات اور نئے مطالبات سے عہدہ بردار ہو سکے۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اُن کا کلام اب منظر عام پر بہت کم آتا ہے معلوم نہیں کہتے ہی کہتے ہی اور اشاعت کے روکے رہتے ہیں۔ وجہ کچھ بھی مگر یہ بات ہے قابل افسوس۔ آخر میں اک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ بیکانہ کی غزلوں میں زندگی کی جو قوت ہلکومتی ہے اور جدوجہد کا جو احساس ہمارے اندر پیدا کرتے ہیں اس کو اُن کے ذاتی مزاج کے اس عنصر سے زیادہ تعلق نہیں ہے جو اک عرصہ تک اُن کے چنگیزی معرکوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے بلکہ جب بھی اوچلے کہیں شعری یا شعری طور پر چنگیزی عنصر اُن کی شاعری میں داخل ہو گیا ہے تو بجا ہے قوت جبروت کے خیموں اور اور خشتی کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ بیکانہ کی شاعری ہمارا اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ زندگی اک جدلیاتی حقیقت اور تصادم و پیکار اسکی نمود اور بالیدگی کے لئے ضروری ہے۔

میرزا بیکانہ چنگیزی

میرزا واجد حسین بیکانہ ابن میرزا پیارے صاحب ابن میرزا آغا جان ابن میرزا احمد علی ابن میرزا روشن علی ابن میرزا حسن بیگ چغتائی ابن ابن
ابن چغتائی قاتل ابن حضرت چنگیز خاں اعظم قہر اللہ۔
میرزا حسن بیگ چغتائی اور میرزا مراد بیگ چغتائی یہ دونوں بھائی ایران سے ہندوستان آکر شاہان مغلیہ کے دامن دولت سے وابستہ ہوئے اور حُر خدمت کے سلسلے میں جاگیریں پاکر عظیم آباد میں جا بسے۔

سلسلہ نسب

میرزا اسد علی	میرزا واجد علی	میرزا حسن بیگ چغتائی
شہزادی خانم	میرزا امیر جان	میرزا روشن علی
میرزا امیر حسین	میرزا غلام حسین	حاجی میرزا احمد علی
عرف میرزا لادے جبا	عرف میرزا پاپے جبا	میرزا نواز علی
میرزا واجد حسین	میرزا بیکانہ	میرزا حسن بیگ
میرزا حاجی بیگ	میرزا آغا جان	میرزا نواز علی
میرزا حاجی بیگ	میرزا آغا جان	میرزا نواز علی
میرزا حاجی بیگ	میرزا آغا جان	میرزا نواز علی

بی بی مغل جان صاحبہ (میرے پردادا حاجی میرزا احمد علی صاحب کی بڑی صاحبزادی) کی زبانی میں نے سنا ہے کہ اُن کے بزرگ دہلی سے میدانی پور آئے اور وہاں سے عظیم آباد جا کر رہے۔ غالباً شہنشاہ اورنگ زیب کا زمانہ ہو گا۔ کیونکہ میدانی پور صوبہ اتریسہ کا علاقہ تھا جسے شہنشاہ کے اک پہ سالار خان دوران خان نے فتح کیا تھا۔ غالباً خان دوران خان کی ماتحتی میں میرے مورث اعلیٰ میرزا حسن بیگ چغتائی نے کوئی نمایاں خدمت کی ہوگی جس کے صلے میں وہ جاگیر ملی جو نسل بعد نسل عظیم آباد میں اُن کی اولاد منتقل ہوتی رہی۔ جس کا بچا کچھ حصہ میرے والد کو بھی ملا تھا۔ چنانچہ منجملہ اور مواضع کے اک موضع فہیم پور بھی تھا جسے بی بی مغل جان فرماتی تھیں کہ شاہی عطیہ ہے۔ اس موضع میں میرے والد کا بھی حصہ تھا جسے وہ میرے لڑکپن ہی میں فروخت کر چکے تھے۔ بی بی مغل جان اور شہزادی خاتمہ صبا دونوں بہنوں نے اپنا اپنا حصہ تبرک کی طرح جگو کر رکھا تھا کہ شاہی عطیہ تھا۔ مگر آخر میں بھائی بھتیجوں کی ناعاقبت اندیشی اور بچپن سنگم ٹھیکہ دار کی دغا بازی سے مقروض و مجبور ہو کر دونوں بہنوں کو اپنا اپنا حصہ حق ٹھیکہ دار مذکور بیع کر دینا پڑا۔ جب سب رجسٹر صاحب بیع نامہ کی رجسٹری کرنے کے لئے میرے گھر پر آئے تھے مجھے خوب یاد ہے کہ اس شاہی عطیہ کے تلف ہونے پر ان بہنوں میں کھرام برپا تھا۔ اگرچہ خاص میرزا احمد علی صاحب کے حاصل کئے ہوئے بعض مواضع مثلاً محمد پور۔ رسول پور۔ دھول پور۔ مری وغیرہ میں تھوڑے تھوڑے حصے موجود تھے۔ مگر شاہی عطیہ کے تلف ہو جانے کا بہت غم تھا۔

موضع فہیم پور میں میرے والد کا حصہ جب تک سلامت تھا تو ایک دفعہ

میرا بھی اپنے بچپن کے زمانہ میں وہاں جا کر کچھ دنوں رہا تھا۔ اس وقت میرا سن چار سال سے ہرگز زیادہ نہ ہو گا۔ وہاں مجھ پر اک واقعہ گزرا جو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ گاؤں ایک ندی کے کنارے آباد تھا جس کا نام پُن پُن ہے جو عظیم آباد سے جانب مشرق گنگا میں گرتی ہے۔ میں روزانہ اس ندی میں نہایا کرتا تھا کبھی اپنے والد کے ساتھ کبھی اور کسی کے ساتھ نہانے چلا جاتا تھا۔ اتفاق کی بات ایک دن میں اکیلا نہانے چلا گیا۔ نہاتے نہاتے دوباؤ تک پہنچ کر بے قابو ہو گیا اس وقت اسی لمحہ پر کوئی خوف غالب نہ ہوا کیونکہ ابھی تک ڈبکیاں نہیں کھائی تھیں۔ ہاتھ پاؤں اتر رہے تھے۔ اتنے میں خدا کی قدرت دیکھئے اک کسان کا لڑکا مجھے اس حال میں دیکھ کر دوڑ پڑا۔ آج میرا اندازہ یہ ہے کہ اس لڑکے کا سن بارہ برس سے زیادہ نہ ہو گا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اس نے مدد کے لئے کسی کو پکارا نہیں۔ اس کم سنی میں یہ سمجھتا تھا کہ خود ندی میں پھانسی پڑا فوراً میرے قریب آکر آہستہ آہستہ مجھے نکال لے گیا۔ خدا جانتا ہے کہ اس لڑکے کے بھیس میں کوئی فرشتہ تھا یا کیا؟ وہ اس وقت پہنچ نہ جاتا تو آج نہ میرا بچکانہ چنگیزی ہوتے نہ آیات و معجزاتی کا وجود ہوتا۔ غالباً سن کا۔

میرے ناہالی بزرگ لکھنؤ سے عظیم آباد میں جا بسے تھے اور مرشد آباد سے بھی ان لاگوں کے تعلقات تھے۔

ناہالی سلسلہ
نواب میرزا آغا جان

نواب میرزا علی حسن خان
عرف بڑے بابو صاحب

نواب میرزا علی حسین خان
عرف چھوٹے بابو صاحب

میرزا احمد حسین — میرزا جعفر حسین — منیر بیگم — عشت فاٹہ بیگم — میرزا یگانہ چلی بیگم —

میری والدہ عسرت فاطمہ بیگم صاحبہ سب بھائی بہنوں میں بڑی تھیں۔ اس وجہ سے میری نانی اماں جناب میرزا فی صاحب میری والدہ کو بہت زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ اور اسی محبت کا تقاضا تھا کہ ایک دن نانی اماں نے مجھے خود اپنا دودھ پلایا۔ اس وقت تک میرے چھوٹے ماموں میرزا محمد حسین عرف اچھے صاحب کا دودھ چھوٹا نہیں تھا۔ کمترین کو فخر ہے کہ میں نے اپنی نانی اماں جناب میرزا فی صاحب کا دودھ پیسا ہے۔ آج یہ بھتی بیوی مرشد آباد کی سرزمین پر محو خواب ہیں۔ میرے بڑے ماموں جو میری ماں کی پیٹھ پر کے تھے اپنی ماں سے تھا جو مرشد آباد چلے گئے تھے۔ ماں بیٹے کو منانے کے لئے مرشد آباد گئی تھیں گریاں بیٹے دہلے وہیں پیوند خاک ہو گئے۔

میں نے لڑکپن میں اپنے نانا بڑے بابو صاحب کو دیکھا تھا کشیدہ قامت پھریرا بدن۔ سر پر نیچو نیچہ ٹوپی۔ چولی دار انگرکھا۔ برکابریا کجا مہ۔ کوئی ستر برس کا سن ہو گا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ان کی تمام جائیدادیں تباہ ہو چکی تھیں بکھر چکا تھا۔ نواب نصیر حسین خاں عرف چڑیا والے نواب کے لڑکوں کو پڑھانے پر نوکر ہو گئے تھے۔

(یگانہ) یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

میں بھی جب انٹرنس میں پڑھتا تھا تو نواب کاظم علی خاں صاحب رئیس سنگی والاں عظیم آباد کے پوتے نواب ابوالحسن خاں کو (افسوس جوان مر گئے) پڑھانے پر نوکر ہو گیا تھا۔ آہ ہنک اس مٹین و سجدہ نو جوان کی یاد آتی ہے اگرچہ اپنی والدہ سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ سنگی والاں والوں سے ان کی کچھ رشتہ داری

میں ہے مگر میں اس وقت اکٹھے ہوئے گھرانے کا اک غریب نو جوان دو تہندو سے رشتہ داری کا اظہار کیوں کرتا۔ مگر حسن اتفاق سے ایک دن ادھر ادھر کی باتوں میں ذکر چلا اور نواب کاظم علی خاں صاحب کو معلوم ہوا کہ میں بڑے بابو صاحب کا نواسا اور حاجی احمد علی صاحب کا پوتا ہوں تو نواب صاحب نے خود چوڑائی وضع کے سادہ مزاج و مردم شناس رئیس تھے (نہایت کشادہ دلی کے ساتھ میرے بزرگوں کی گزشتہ وجاہت اور ان کی تباہیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کی ناہنال سے تو ہم لوگوں سے رشتہ داری بھی ہے۔ میری پھوپھی آپ کے چھوٹے نانا کو بیابھی ہوئی تھیں۔ پھر نواب صاحب موصوف نے میرے ناہنالی امام باڑہ کی آراستگی وغیرہ کی تعریفیں کیں کہ شہر کے امام باڑوں میں آپ کا امام باڑہ بھی بہت سجا ہوا تھا۔

میری تاریخ ولادت تخمیناً ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء قرار پاتی ہے۔ شہر عظیم آباد (مٹین سنگی) کا محلہ مغل پورہ میرا مولد ہے۔ جو تیموریوں کے قبضے میں تھا اور قزلباشوں کا مسکن تھا۔ جہاں اعلیٰ درجے کے مہذب ائمراء و شرفاء بستے تھے وہاں اول نمبر کے چھٹے ہوئے شریف بد معاش بھی اودھم مچا کرتے تھے۔

میری ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرت عظیم آبادی کے مدرسہ میں ہوئی اس کے بعد عظیم آباد کے محمدن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوا اور اول سے آخر تک نفع اور انعام پاتا رہا۔ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرن پاس کیا۔ علم و ادب خصوصاً انگریزی و فارسی ادب میں سب سے پہلے میرے نازق سخن کی

اصلاح حضرت استاذی مولوی سید علی خاں صاحب بیابان عظیم آبادی نے کی جن کے اعلیٰ
 کیرکٹر نے مجھے بندہ بنالیا تھا۔ بعد ازاں آپ نے مجھے اپنے استاد خان بہادر مولانا سید
 علی محمد صاحب شاد و عظیم آبادی کے سپرد کر دیا۔ جن کی ذات گرامی سے خاکسار کو
 بہت کچھ فیض پہنچا۔ ۱۹۰۷ء میں میں نے کلکتہ اور میٹریج کا سفر کیا، جہاں فرس میرزا
 محمد مقیم بہادر (سلطان عالم حضرت میرزا محمد واجد علی شاہ کے نواسے) کے مرشد نادوں
 یعنی محمد یعقوب علی میرزا اور محمد یوسف علی میرزا کا کچھ دنوں معلّم رہا۔ مگر میٹریج کی آب ہوا
 نے صحت پر بہت خراب اثر کیا۔ سخت علیل ہو کر عظیم آباد واپس آیا مگر یہاں بھی صحت
 درست نہ ہوئی۔ آخر لکھنؤ پہنچا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۵ء کا ہے۔ یہاں کی آب ہوا اور رنگارنگ
 دلچسپیوں نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ یہیں کا ہو رہا۔ وقتاً فوقتاً عظیم آباد جا کر اور جائیداد کا کچھ
 حصہ فروخت کر کے لکھنؤ میں بے فکری سے بسر کرتا رہا۔ جن اتفاق سے ایک سال
 میرے مکرم و محترم نواب سید محمد رضا خاں عرف نواب صاحب تاج عظیم آبادی اپنے علاج
 کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے۔ انھیں کی وساطت سے لکھنؤ کے ایک معزز متوسط
 گھرانے میں میری شادی ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۹۱۳ء کا ہے میرے خسر جناب حکیم میرزا محمد شفیع صاحب
 اور نواب نواب صاحب تاج سے دیرینہ مرام تھے کتنے شایستہ کتنے پاکیزہ خصال لوگ
 تھے خدا جنت نصیب کرے حکیم صاحب قبلہ مرحوم و مغفور لکھنؤ کے طبقہ متوسطین
 میں ایک پرہیزگار مرد صلح شائع جاتے تھے اسی وجہ سے علماء کے دل میں ان
 کی خاص جگہ تھی۔ چنانچہ جب حکیم صاحب قبلہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت
 ناصر الملتہ مجتہد العصر مولانا سیدنا حسین صاحب قبلہ آخر وقت ان کی عیادت کو
 تشریف لائے تھے حکیم صاحب کے منجھلے بھائی حکیم میرزا محمد تقی صاحب شہر کے

ملا اور طبیب اور اک با وضع بزرگ تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولوی میرزا محمد عسکری صاحب
 بھی اک مرد ثقہ تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے کربلا کے معنی میں آرام فرمایا۔ میرے
 خسر حکیم میرزا محمد شفیع صاحب کی پہلی بیوی جناب کینز فاطمہ صاحبہ سے تین بیٹے
 میرزا محمد فصیح۔ میرزا محمد رضی اور میرزا محمد وصی اور دو بیٹیاں کینز رضا اور کینز حسین
 مولا الذکر خاتون میری اہلیہ محترمہ ہیں جن کے پاکیزہ اخلاق و محبت اور وفادارانہ
 دلجوئیوں نے مجھے نازک سے نازک وقت میں ثابت قدم اور زندگی کی سخت کشمکش
 کے باوجود آج تک مجھے زندہ رکھا ہے۔ جن کے دم سے میں انسانیت کی اتنی
 منزل طے کر سکا۔ جن کی ذات سے دنیا ہی میرے لئے جنت ہے۔

حکیم صاحب کی دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ تیسری بیوی
 جناب انجو بیگم صاحبہ سے تین بیٹیاں زاکیہ بیگم۔ دافیہ بیگم۔ ہاجرہ بیگم میری موجودہ
 نو شامین انجو بیگم صاحبہ نے میری اہلیہ محترمہ کو بھی اپنی ہی اولاد کی طرح پالا اور
 انھیں کے ہاتھوں شادی کے حلہ مراسم انجام پائے اور آج تک ہمارے اور
 ہمارے بچوں کے ساتھ بزرگانہ شفقت فرماتی ہیں۔

سلسلہ نسب

میرزا الطف علی بیگ شیلزی عرف غانی صاحب

مولوی میرزا محمد عسکری حکیم میرزا محمد تقی حکیم میرزا محمد شفیع

کینز عباس حکیم میرزا محمد تقی حکیم میرزا محمد ذکی

میرزا محمد فصیح میرزا محمد رضی میرزا محمد وصی کینز رضا کینز حسین بیگم

نام نیک زنگاں ضلع مکن تاباند نام نیکت پاندار

میرزا یگانہ چنگینی لکھنؤی سب رجسٹرار لاہور دکن ۱۹۳۵ء

یگانہ آرٹ

(از میرزا مراد بیگ چغتائی)

(۱) کیا غلط سمجھا جن اہل نظر نے یگانہ آرٹ کو فطرت کی آواز سمجھا؟

"He is one of the few minds, the favourites of Nature."

کس کی آواز کان میں آئی؟

دور کی بات دھیان میں آئی؟

ایسی آزاد روح اس تن میں؟

کیوں پرانے مکان میں آئی؟

ہائے کیا کیا نگاہ بھٹکی ہے؟

جب کبھی امتحان میں آئی؟

یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی؟

کہیں کیا بات دھیان میں آئی؟

علم کیا علم کی حقیقت کیا؟

جیسی جس کے گمان میں آئی؟

آرٹ کی زمین شرطیں آرٹ کی تکمیل کیلئے مجملہ اور شرائط کے تین شرطیں بنائے ہیں۔

(۱) نسبت صحیح یعنی شاعر جس موضوع پر کچھ کہنا چاہتا ہے اسکی صحیح واقفیت رکھتا ہو۔

(۲) خلوص۔ یعنی اس موضوع سے اس کو سچی دلچسپی ہو یا سچی نفرت۔

(۳) طرزِ ادا۔ یہ بھی نہایت اہم شرط ہے یعنی انداز بیان عام انداز سے اچھوتا اور دلکش ہو۔

یہ تمام شرطیں یگانہ آرٹ میں مکمل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یگانہ کی شاعری زندگی کی شاعری ہے اور زندگی اک ایسی عام چیز ہے جسے کون نہیں جانتا؟ پھر بھی زندگی اتنی وسیع اور سیدہ شے ہے جسے کوئی سمجھنا چاہے تو کہاں تک سمجھ سکے گا۔ یگانہ نے زندگی کی ذمہ داریوں کو جس حد تک سمجھا ہے صحیح سمجھا ہے۔ اس وہ اپنے موضوع سے نسبت صحیح رکھتے ہیں۔ اب ہم دوسری شرطِ خلوص اور تیسری شرطِ طرزِ ادا، سوان میں وہ اپنا جواب نہیں دے سکتے۔

خود سر خطا ہے خود مارا تائے

قربان تیری آنکھیلیوں کے

پھلتے نہ دیکھے سارے کے سارے

انف ری مشیت پھولے تو لاکھوں

مشا طہ چاہے جتنا سنو اے

یہی ہے سلی اندھا ہے اندھا

چھڑا ہے ساز ہستی مبتدا ہے بخیر ہو کر

غلامِ معلوم اس آغاز کا انجا کیا ہوگا

کوئی شام اور آجائے نہ شام بے سحر ہو کر

بگوشیاد عدہ فردا پس فردا پیل جائے

پڑے ہیں منرافا نوس پر بے بال پر ہو کر

کہاں بڑا سانی کی ہو روانگی قسمت

"The so-called popular poets have nothing but a wretched love of pleasure or fear of pain. They have only a hunger of..."

کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانا۔ یہ خصوصیت

میں یگانہ ہی میں ودیعت ہوئی ہے کہ ان کے آرٹ کا تھوڑی دیر تک مطالعہ کر کے ہم

اپنے اندر جتنی ترقی جتنی بالیدگی محسوس کرتے ہیں، کثرتِ معانی و مطالب سے دلِ دماغ کو

ہفتی ملاقات اور حیرت انگیز انداز تصرف سے جیسی فرحت پہونچتی ہے اتنی ہی دیریں

کسی بڑے سے بڑے مخور کا کلام پڑھ کر اتنا فائدہ اتنی ترقی محسوس نہیں ہوتی۔
آخر اس کا راز کیا ہے۔ اس کا راز ہے یگانہ کی پر معنی مختصر نگاری۔ یعنی
کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی۔ یوں تو بڑے بڑے ادبی شاہکار موجود
ہیں۔ مگر شاید ہی کوئی ایسا ہو جو یگانہ کی معنی خیز مختصر نگاری کا مقابلہ کر سکے۔

ڈاکٹر جانسن کا یہ قول آج لفظ بہ لفظ یگانہ پر صادق آتا ہے۔
"His art has the highest touch of finish,
significant & condensed to the utmost."

پتے کی کہیے تو ظالم کا رنگ اڑتا ہو
مری نظر کی خطا ہوگی یا کلون کی خطا
نکل ہی جاتا ہو مطلب تہی قسم کھا کر
(۴) تمازگ بھی اور عام فہم بھی۔ ڈاکٹر جانسن گویا میرزا یگانہ کے حق میں فرما گئے ہیں:-
"with all the refinements of subtlety his images
find a mirror in every mind & sentiments
to which every bosom returns an echo."

وقت کی بات اور وقت کے ہاتھ
کیا ٹلے گی مشیت ازلی
صبر اتنا نہ کر کہ دشمن پر
سہو کیا چیز ہے خطا کیا ہے
اک تسلی سی ہو دعا کیا ہے
تلخ ہو جائے لذت بیداد

کو کہن اور کیا بنا لیتا؟
ہنس بھی لیتا ہوں اوپر ہی ل سے
بن کے بگڑے تو کیا کرے کوئی
جی نہ پہلے تو کیا کرے کوئی
(۵) جدت اور اچھٹا نگاری میں فرق ہے۔ بہترے نا شعرا ان ہوتی باتیں بنا بنا کر
لوگوں کو اچھٹے میں ڈال کر فریب دے لیتے ہیں۔ مگر یگانہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے
کہ وہ آفاقی حقایق و معارف پر شاعرانہ انداز سے تصرف کر کے حیرت میں ڈال دیتے
ہیں۔ کہنے والا دوسو برس پہلے گویا یگانہ کے حق میں کہہ گیا ہے۔
"His wit alone is natural & new & acknowledged to be just. His peculiar
power is to astonish by universal truths."

یاد خدا تو دل سے ہر دے زبان تک لے کیوں
اہل نظر کے سامنے انکھ جھپٹ جائے کیوں
مڑے پہ آہی گیا حسن، نارسیدہ سہی
خطائے حسن کہے کون؟ چشم دیدہ سہی
(۶) امیری آرٹ۔ یگانہ آرٹ اک تعمیری آرٹ ہے کوئی تفریحی مشغلہ یا عیش پرستی
کا آلہ کار (auxiliary of vice & pleasure) نہیں ہے۔

انسانیت کی تعمیر و تہذیب اسکا کھلا ہوا مقصد ہے جو ارباب نظر کے نزدیک کلمہ ہی مشتبہ نہیں ہے۔
الہی خیر لو ہے لگ گئے پہلی ہی منزل سے
اُٹکتا جاے رنن جھٹکتا جاے منزل سے
جہاں دو ہونگے بڑھ جائیگا ایک کے مقابل سے
زمانہ وہ جسے مطلب کوئی حق سحر نہ باطل سے
ارادے نے عمل کی راہ پائی کتنی مشکل سے
مشیت اپنی تو جانے کوئی کم نشہ کیا جانے
انسان تو کیا دوبھی برابر ہو نہیں سکتے
ایک زمانہ لوں برق زمانہ ساتھ دے جسکا؟

(۷) زندگی کا کس بل۔ بقول پروفیسر مجنوں گوکھپوری غزل جواب تک حسن و عشق کی شاعری بھی جاتی تھی یگانہ نے اسے زندگی کی شاعری بنا دیا۔ غزل میں وہ کس بل آگیا جسے ہم صحیح اور توانا زندگی سے منسوب کرتے ہیں۔

ناخدا ز من بگزر، سوے دیگران بنگر
صد رفیق و صد ہمدم پر نکستہ دل تنگ
وہ جوانی کی موج وہ منجھد صا
منجھ جو تکتی ہو مرگ دشمن کا
زمین پاؤں تلے سے نکل گئی تو کیا؟
مرد نہ پوچھے واللہ دل دکھانے کا
اتنا تو زندگی کا کوئی حق ادا کرے
رفتار زندگی میں سکون آئے کیا مجال

(۸) طنز اور افس کی افادیت۔ یگانہ آرٹ نتیجہ ہے اکیسی فکر طنائ کا جسے زمانہ بہت جیکر کھا لینے کے بعد پیدا کرتا ہے۔ یہ طنز محض طنز کے لئے نہیں ہے۔ اس کے کچھ اعلیٰ مقاصد بھی ہیں مثلاً غلطیوں کی اصلاح۔ ذہنی تربیت۔ قوت فیصلہ کو پختہ کرنا مزاج و خوش طبعی (Humour) وغیرہ

کرتی کسی کی بھرنی کسی کی
تو کیا ہیں میں گنہگار۔ حسن یا نہیں؟
سلاست آپ کا یہ حسن لازوال، مگر
منجھ جو ذرا نرگیا اور بھی گل میں گل کھلا

(۹) اشارات بلیغ نامحانہ یا دوستانہ انداز میرزا یگانہ کا دھول نہیں وہ اشاروں میں اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ وہ دل نشین اشارے جن میں درس عمل۔ تنبیہ۔ تادیب وغیرہ نہاں ہوتی ہیں، جن کا اثر بالواسطہ پڑتا ہے۔ نہایت گہرا اور مستقل اثر ہے۔
The way of the daisy
suggestions & implications آتا ہے

پیا سا کھڑا ہو دریا کنارے
گو نگا تو گو نگا، کس کو بکار ہے؟
خودی کے نشہ میں کچھ ان کہی نہ کہہ بیٹھے
کہیں کلائی پہ دست ہوس نہ کہہ بیٹھے
اُسی تھے گہر میں یاں دے بکر جو نہ بیٹھے
اے یہ کیا کہ راہ راست مشکل ہوتی جاتی ہے
سراسر موج دریا غرق ساحل ہوتی جاتی ہے

(۱۰) ضرب الامثال شعر تو وہی ہے جو زندگی کی کسوٹی پر سچا ثابت ہو کر رہاں زد ہو جائے۔ یگانہ آرٹ کا اک معقول حصہ ضرب الامثال کی شان رکھتا ہے۔
آہ کس دن کے لئے ناسحق پرستی کیجئے
کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی
انسان آدمی نہ ہو احسا نور ہوا؟
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیائے میں
ولے ناکامی کہ اس پر بھی مسلمان رہ گیا
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھنا کیجئے

دیکھ کے ساتھ دین کی بیگارا الامان؟
کساں کہی کسی کی نہ گزری زمانے میں
خاک چھائی عمر بھر کوئے تباہ میں یا سنے
دیوانہ وار دور کے کوئی لپٹ نہ جائے

جنس و فانی تھی کوئی مفلس کا مال تھا!
 تو نے جانا مجھے تو کیا جانا؟
 چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے
 میں کہاں ہار ماننے والا!
 (۱۱) ایجاد و اختراع - کہنے والا گویا یگانہ کے حق میں پہلے ہی کہہ گیا ہے۔

"He is a genius - a combination of invention, imagination, judgment and mode of expression. His mode of expressing his thoughts are original. He looks round Nature & life with the eye which Nature bestows only on a poet, with a mind that at once comprehends the Vast."

کہاں لیجائے گی یہ وسعت آفاق کیا جانیں؟
 نظر آئیکہ کیا عظمت کہے میں چشم حیراں کو
 یہ کس گرم رفتار کی راہ کھوٹی تھی؟
 گرفتارِ ساحل کو دھڑکتے ڈرنگل جاتا
 گناہ بے حقیقت کو قلم نے کتنا چمکایا؟
 ازل سے سخت جاں آلودہ صدا تھاں آئے
 سکون میدلی میں کیا کہوں کیوں اہر سپاہی؟
 وہی آغوش ساحل اور وہی منجد ہمارے ڈوبے
 حق اپنی دھن کا پتکا باطل اپنی زعمیں پورا

دل کو پہلاتے ہو کیا کیا آرزوئے خام سے
 اور ناممکن میں گویا رنگ امکاں دیکھ کر
 (آرزوئے خام)

کیا عجب ہے بھول جائیں اہل لپٹا بھی درد
 حسن متانہ کو آخر میں پشیمان دیکھ کر
 (حسن پشیمان)

دل ہلا کر دادی غربت کو روشن کر چلے
 لب سو جہی جلوہ شام غریباں دیکھ کر

صبر کرنا سخت مشکل ہے تڑپنا سہل ہے
 (صبر کرنا مشکل تڑپنا سہل)
 اپنے بس کا کام کر لیتا ہوں آساں دیکھ کر

مستعار صورت و معنی سے بیگانہ ہوا
 (مستعار صورت و معنی)
 حیراں کو حیراں دیکھ کر

اندھیری کو ٹھری میں آئینہ دیکھا تو کیا دیکھا
 (ستار یک ماحول)
 یہی دیکھا کہ میں خود ذیذہ بنیا میں باطل تھا

پیشانی پر زہے فیض پشیمانی
 (فیض پشیمانی)
 دل نشہ خودی میں پڑا جھومتا ہے کیا

پیام زیر لب ایسا کہ کچھ سننا نہ گیا
 (پیام زیر لب)
 اشارہ پاتے ہی انگریزانی فی رہا نہ گیا

دل نشہ خودی میں پڑا جھومتا ہے کیا
 (درو کا زور درمائی ام)
 درد آرزوئی کو کوئی درد اٹھ کھڑا نہ ہو

پچھلا ہر بے کاتب اعمال ہو شیار
 (آلودہ گناہ)
 آلودہ گناہ کوئی جاگتا نہ ہو

سہو و خطا و دیعت فطرت سہی مگر
بجھاؤں کیا ضمیر ملامت شعرا کو (سہو و خطا، دیعت فطرت)

بادِ سحر کجا، پر پروانہ شام سے
(ہو اے عشق - پیام موت) بھر دے کار ہے تھے شعلہ بے اختیار
انوکھی معرفت اندھوں کو حاصل ہوتی جاتی ہے
حقیقت تھی جو کل تک آج باطل ہوتی جاتی ہے (انوکھی معرفت)

بلندی کیا ہے پستی کیا ہو اکی کارِ سرِ بانی
(بلند و پستی) سرِ امر موج دریا عرقِ ساحل ہوتی جاتی ہے
نہ کترائے ذبل کھائے تو پھر دھار اکدھر جائے
ارے یہ کیا کہ راہِ راست مشکل ہوتی جاتی ہے (راہِ راست مشکل)

کہاں لیجائے گی یہ وسعت آفاق کیا جانیں
(وسعت آفاق) مکان و لامکان سے دور منزل ہوتی جاتی ہے
یہ ہے اک (صنم) کا انداز فکر اک زندہ دل کا جو
مغموش - اک فلسفی شاعر کا پچاس شور -

(۱۴) کشِ مستقل - یہ بھی تھکانہ آرٹ کی آفاقیت کی دلیل ہے۔ برخلاف اس
ملن کی فردوسِ گم شدہ کا اک بڑا نقص جو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے یہ ہے کہ پڑے
وائے پڑتے ہیں اور تعریفیں کر کے رکھ دیتے ہیں پھر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اس
مطالعہ فرض سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ معلومات حاصل ہوتی ہیں مگر دماغ اتنا تنگ

کہ کپڑا اسکی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

یگانہ آرٹ اردو کا کارنامہ ہے جس کی اک بڑی خصوصیت ہے کشِ مستقل
ار پار پڑھتے ہیں جی نہیں اکتا تانے نئے مطالب واضح ہوتے جلتے ہیں۔ ہر پڑھنے والا
اپنے تجربے کے تحت اسکی نئی تفسیر کرتا ہے اور اس کا حق رکھتا ہے کہ اپنی زندگی کی روشنی
انسانہ طور پر کرے۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ یگانہ آرٹ آفاقی حقائق و معارف کا
مکمل ہے (عبدالمجید) کسی خاص قوم کے لئے مخصوص نہیں ہے

عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسمان کو
کہیں دن وصل جائے نصیب دشناں کو
یہ جتنا کوئی جتنا ہے کہ رہ جائے دھواں کو
کون سا تہا نشینِ حلت سرائے دل میں ہے
ہو نہ ہو کچھ بھیدا اس اندیشہ باطل میں ہے
روئے سیاح جس طرح محملِ محمل میں ہے
ڈوبے لے کا مزہ دریا بے ساحل میں ہے
دل سے جتنا لے لے جی تھکا دشتی محفل میں ہے
منزلِ قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا
بے رابطی نوشتہ تقدیر دیکھنا
فانوسِ آڑے آگیا تقدیر دیکھنا
یگانہ آرٹ کا مستقل موضوع ہے فلسفہ حیات و کائنات

(۱۵) حسن و عشق - حسن و عشق کو یگانہ نے اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا

کہیں کہیں حسن و عشق کی جو چاشنی پائی جاتی ہے وہ محض چاشنی کے لئے ہے۔ مگر جہاں کہیں اس مرقہ کو موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہاں بھی اپنی انفرادیت، دل کی تڑپ اور تھملا ہٹ کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ نظر اور (*how to make a love story*) کا مکمل ثبوت دیا ہے۔ وہ لوگ جو ہر گھڑی حسن و عشق کے راگ لایا کرتے ہیں ان کے ہاں بھی اتنے مکمل نمونے اس موضوع پر مشکل سے ملیں گے۔

دیکھو جو حسن دوست کو شانِ جلال میں مارا فریبِ حسن کا پینے تو جائے ترسی ہوئی نگاہوں پہ اب ہم کیجئے نگاہ شوق کی گرمی، خدا کی قدرت ہے کھٹکتی رہتی ہے دل میں نگاہِ دزیدہ فریبِ نفس کا جب احتمال ہوتا ہے بقدرِ حوصلہ ملتی ہے دادِ عشق و ہوس دید کی التجا کروں تشنہ ہی بٹ جان دو منہ جو ذرا اتر گیا اور بھی گل میں گل کھلا عیبِ خالی کون ہے حسن کے دل سے پوچھئے عشق کا حسن طلب اک معنی بے لفظ ہے محبت کا مزہ بگڑا کر نیت بھر گئی اپنی گناہِ عشق امرِ اضطرابی کے سوا کیا تھا نظر پڑنے لگی میری بھی اپنے شیشہ دل پر

میرے دل میں لگا کر آگ آنکھیں کھینے والے تری چشم توجہ اور قاتل ہوتی جاتی ہے

(۱۴) آپ بیتی اور جگ بیتی۔ ظاہر ہے کہ شاعر کا ہر شعر خود اس کی زندگی اور اس کے عقائد کا آئینہ یعنی قال مطابق حال نہیں ہوتا۔ کچھ آپ بیتی ہوتی ہے کچھ جگ بیتی ہے۔

اے میں نے کیا کیا واہ یہ میں نے کیا کیا عشق میں سب پڑھا لکھا بھول گیا بھلا لکھا ہے کہ یہ شعر میرزا یگانہ کی شخصی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا کیوں کہ وہ کبھی عشق و محبت کے فیشن میں مبتلا نہیں ہوئے۔ یہ شعر بے وقوفوں کی عاشقانہ زندگی کے شاد ہے کا نتیجہ ہے۔

(۱۵) بلندی و عظمت یگانہ آرٹ کی بلندی و عظمت مصنوعی اور غیر طبعی نہیں بالکل نچرل اور سریر الغہم ہے۔ ان کی رفت و فکر میں نہ تو بولکھلا ہٹ ہے نہ اترا ہٹ۔ جوشِ خان کی طرح انگوٹھوں کے بھل کھڑے ہو کر ادب چا ہونے کی کوشش کرنا میرزا یگانہ کا شیوہ نہیں *He does not like to have a stammering dignity, to look taller by walking on his tip-toe.*

سجدہ صبح و شام کیا کرتا غائبانہ سلام کیا کرتا؟
ایسے ہنگامہ زار ہستی میں ایک اللہ کا نام کیا کرتا؟

حاصل نکرنا رسیا کیا ہے ؟
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے ؟
آئی کوٹال دے جیسی جانیں
ملی ہو جن کے وہی چپ کی داو پاتا ہے
کشش دکھائیں تو معراج سے ہیں بالاتر
دیدہ دل سے دیکھ اپنی طرف
نور ہی نور ہے کہاں کا ظہور ؟

تو خدا بن گیا بُرا کیا ہے ؟
 کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے ؟
 دم بخود ہے تو پھر خدا کیا ہے ؟
 پکارتے رہے ناسخ ، پکارے والے
 خدا کو شیشہ دل میں اتارنے والے
 چشم حیران تھے ہوا کیا ہے ؟
 اٹھ گیا پردہ اب رہا کیا ہے ؟

(۱۶) زندگی کی کشمکش اور مہماری ادب کی کیا سچی اور جامع تعریف کی ہے۔
 ادب بہادروں کا زور۔ زندوں کی حیات۔ سوراووں کا حوصلہ اور فرض شناسوں کا فرض ہے۔ یہ کہہ کر حضرت بیتاب نے یگانہ آرت پر نادانستہ اک طرح کی روشنی ڈال دی ہے۔
 منزل کی دھن میں آبلہ پائل کھڑے ہو
 شور جرس سے دل نہ رہا اختیار میں
 زمانہ پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے
 دکھا وہ ترور کہ دنیا میں یادگار رہے
 کہاں تلک دل غمناک پر وہ دار رہے
 زبانِ حال پہ جب کچھ نہ اختیار رہے

۱۷۔ اسے کہتے ہیں ساوگی و عظمت کا امتزاج۔ خدا کیلئے انسان ہی کی فکر رسایا نارسا کا نتیجہ ہے۔ یہ ہے آرٹ کی وہ عظمت وہ صداقت جن کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں ہے جس کے دل کو لگی ہو۔

نظام دہرنے کی کیا نہ کروٹیں بدلیں
اُٹھارتی ہے ہوس تو بے ریائی کی
یکانہ حال تو دیکھو زمانہ سازوں کا
دور تھا سجدہ شام و سحر تیسے لئے
دور دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
کس محنت سے دل گم گشتہ دیتا ہے صدا؟
ازم و دیا میں یگانہ ایسی بیگانہ روی؟
دل بلب جلوہ اُمید دکھاتا ہے مجھے
دل کو لہراتا ہے ہنگامہ زندانِ بلا
اُٹھ اُڑا رہے زندان کے چلن سے باہر
سچی کہتا ہے کہ گھر اپنا قفس کو سمجھو
جہنم و دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کول روغن تو ہو دل کا پیام ناگہان لئے
حق اپنی دُشمن کا پکا باطل اپنے زعم میں
اُٹھ اُٹھ سونے والو سر پہ دھواؤ آئی قیامت کی
ایک دھماکا کن تنہا ہو آگے تھا سواب بھی ہے

مگر ہم ایک ہی پہلو سے بے قرار رہے
کہ دل کے ساتھ زبان کیوں نہا ہنگام رہے
ہوا میں جیسے بگو لا خواب و خوار رہے
در دول ٹھہرا دو اے در دوسرے لے لے
زندگی پھر کیوں ہوئی ہے در دوسرے لے لے
آدھر - پھرتا ہے آوارہ کدھر میرے لے لے
میں نے مانا عیب لیکن ہنر میرے لے لے
شام سے یاس سویرا نظر آتا ہے مجھے
شور ایذا طلبی و جد میں لاتا ہے مجھے
بیڑیاں کیوں کوئی دیوانہ پختا ہے مجھے
سبق الٹا ماصیاد پڑھاتا ہے مجھے
کس قدر واعظ مکار ڈراتا ہے مجھے
بلا سے شامت پر وائے آتش بجاں لے لے
ابھی گفتگو سے صلح کیونکر درمیاں آئے
کہیں یہ دن نہ ڈھل جائے نصیبِ شمنان ہو کر
بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے مگر کس سائل
کا زور - ذمہ داروں کی فرض شناسی

برائی میں بھلائی کا پہلو نکال لینا۔ اس مقام پر یگانہ کار و قلم حیرت میں ڈال دیتا
 مگر اے دیکھیں تم کیا ہو اے ہم کیا ہو
 بحر ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے؟
 نظر آئے گا کیا ظلمت کے میں چشم حیراں کو
 مبارک ہو مبارک ساحل حجت یہ دم لینا
 گرفتار ان ساحل کو پڑتے ڈر نکل جانا
 ممکن کی آرزو میں مئے کتنے نامراد
 جفا کے پتھر خوشوار سے جو بس نہ چلے
 علاج اہل حسد زہر خستہ مردانہ
 چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے
 چاروں کی زندگی ہو کاٹ دھنوں لولہ
 کیا سمجھتے تھے کہ دل سا شیشہ نازک راج
 ہوتا ہو بند ایک در۔ کھلتے ہیں ہزار در
 بہار زندگی نادان بہار جاوداں کیوں
 زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنی اندھیر میں
 دل جلا کر وادی غربت کو روشن کر چلے
 بیگانہ وار ایک ہی رخ سے نہ دیکھے
 دل نے بزدل عشق لگایا ہے راہ پر
 بہار عمر گزشتہ یہ بھیجے صلوات

خزاں کی ضد یہ یہ باندھی ہو باغبانِ محرم چمن کو آگ لگا کر نہال ہوتا ہے

(۱۸) ناقابل تقلید یگانہ آرٹ اتنا سچا آرٹ ہے جسے دیکھ کر یاروں کو رشک
 ہوتا ہے کہ وہ کیوں نہ ایسا کہہ سکے اور عام اہل ذوق کا دل گدگدائے لگتا ہے، نقل اتارنا
 چاہتے ہیں سچی موسیقی اور سچے شعر کا قدرتی اثر یہی ہوتا ہے کہ سننے والا مزے
 میں آکر نقل اتارنے لگتا ہے مگر ملک کو اس امر کا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ یہ آرٹ
 کتنا ناقابل تقلید ہے۔ یگانہ کے شعر کی نقل اتارنا تو بڑی بات ہے غزل پڑھنے کی نقل
 اب تک کسی سے بن نہ پڑی ہے

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا کیجئے
 سزا کے بعد خطا پر ابھارنے والے
 بلا سے نخلِ تمنا خزاں رسیدہ سہی
 ستم رسیدہ سہی پیر ہن دریدہ سہی
 دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
 مٹنے پہ بھی اک ہستی برباد رہے گی
 انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی
 شاید یہ زبان تشنہ فریاد رہے گی

(۱۹) فلسفہ خود پرستی میرزا صاحب کی عملی زندگی کا نہایت روشن پہلو ہے اور
 یہ بھی یگانہ آرٹ کا اک اہم موضوع ہے۔ جذبہ خود شناسی

ذاتی جو ہر جو اکتسابی چیز نہیں ہے۔ کتابوں سے نہیں حاصل کیا گیا بلکہ زندگی کے ناموا
حالات میں یہ ذاتی جو ہر اور نکلتا گیا۔ اس موضوع پر یگانہ کے جتنے شعر ہیں ان پر غور کرنے
سے یہ بات سمجھ میں آئے لگتی ہے کہ واقعی فلسفہ خود پرستی پر اتنی نیچرل اتنی اچھوتی فکر
اوس کی ہو سکتی ہے جس میں طبعی طور پر سچا جذبہ خود شناسی موجود ہو۔ کسب و
اقتساب سے اتنا شدید جذبہ پیدا نہیں کیا جاسکتا۔

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
آہ کس دن کے لئے نا حق پرستی کیجئے
خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں
خود اپنی ذات یہ شکل میں کیا کیا
سر پارازہوں میں کیا بتاؤں گے کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

یگانہ تو ہی جانے اپنی حقیقت

تجھے کون تیرے سوا جانتا ہے

(۲۰) مجاہدانہ زندگی - ظاہر ہے کہ یگانہ آرٹ کسی فراری ذہنیت کی پیداوار
نہیں ہے۔ زندگی کی معرکہ آرائیوں سے بھاگنے والا
گوشہ عافیت میں پناہ لینے والا۔ بچانے والا ادب نہیں ہے اک ذمہ دار دنیا
ہونے کے علاوہ یگانہ کی ادبی زندگی ایک مجاہدانہ زندگی ہے۔

بجھائے کون تو جس کو جلائے
پتنگوں کی چسٹھائی ہو چکی بس
رفقار زندگی میں سکون آئے کیا مجھ
طوفان ٹھہر بھی جائے تو دریا بہا کے
دل طوفان شکن تنہا جو آگے تھا آٹھو بھی
بہت طوفان ٹھنڈی پرگہ کھڑا کے ساحل
عجب کیا ہی ہم ایسے گرم رفتاروں کی جھوکت
زمانے کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا

یہاں اور کہاں کے پست بلند
ایک ٹھوکر میں تھا بکھیرا پاک
ہوش کیا پائے گا پست میرا
لے اڑا دور جو ہر اور اک
جس کی توار کا ہو لوہا تیسرا
جھٹت نامتھام کیسا کرتا
نکرا کے پلٹ آئیں موصیٰ لبریت

مثلت

اللہ اے کم ہمت ہاتھ پاؤں مار آیا
تہ کی کیا خبر لاتا۔ حوصلہ بھی ہار آیا
پار اتارنا کیسا بار بار
کئی جہات اپنی جارہی تھی دھار پر
سنگدل تماشا ئی ہنستے تھے کنارے
دل وہی شکستہ دل پھر بڑکا رہا

(۲۱) گریز ناممکن - کسی اور کے لئے جو کچھ کہا گیا تھا وہ یگانہ پر صادق
آتا ہے لفظ بہ لفظ

"He displays everywhere the quality of a
powerful manly character, a typical gentleman
strenuous & true hearted. A man in art as
in life incapable of subterfuge and
intolerant of untruth."

حرارت ہے دل کی ابھی تک رہی
زمانے نے اتنا سمو یا تو کیا

نی ہے وہی موج تختِ ژان مجھے ناخدا نے ڈبویا تو کیا
 ارے یہ کیا کہ چاہوں بھی تو حق سے پھر نہیں سکتا (کشش حق)
 خود اپنے ہاتھوں گمراہی کی کوشش راہیگا کیوں ہو
 زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
 (خود شناسی) کوئی صاحبِ نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو
 بشرہوں میں فرشتہ کیوں بنوں جیسا ہوں چھا ہوں
 بغاوت اپنی فطرت سے نصیب دشمنوں کیوں ہو (بشریت کا مرتبہ)
 پرچکے بہت پالے ڈس چکے بہت کالے
 (موزیوں کا موزی) موزیوں کے موزی کو فکرِ نیشِ عقب کیا ہے
 میرزا یگانہ واہ، زندہ باد زندہ باد
 اک بلائے بے درماں جب تم کیا تھے اور اب کیا

اردو میں میرزا غالب کی فارسی ترکیبوں کی
 (۲۲) فارسی ترکیبوں کا اعتدال - معنویت جتنی مسلم ہے اوس سے زیادہ انکا
 غایت و ثقالت نے اردو کو نقصان پہونچایا۔ میرزا یگانہ ٹھیکہ اردو کے شاعر ہیں مگر
 فارسی کا اتنا صحیح ذوق، تخلیق و تجدید کا ایسا زبردست ملکہ رکھتے ہیں کہ ان کے
 کلام میں تازہ اور معنی خیز فارسی ترکیبیں، اپنا جواب نہیں رکھتیں اتنی سلیس اور سہل
 کہ نہ تلفظ میں کوئی دشواری محسوس ہوتی ہے نہ سماعت پر گرانی۔

کس کے دم کی روشنی زندانِ آب و گل میں ہے
 (جلوہ روح) کون سا تنہا نشین وحدتِ برائے دل میں ہے
 باز آ ساحل پہ غوطے کھائے والے باز آ
 (ارادہ خام) ڈوب مرے کامزہ دریا گئے بے ساحل میں ہے
 (فیضِ پشیمانی) اے حسنِ گنہگارِ زہے فیضِ پشیمانی
 (کعبہ خانہ ساز) زحمتِ سجدہ ہے فضولِ بنگدہ مجاز میں
 (حسنِ خوب و زشت) ہوگی ناز کیا قبولِ کعبہ خانہ ساز میں
 (بندہ خود شناس) بندہ خود شناس ہے اپنے ہی پیر میں مست
 (بندہ بے نیاز) بوندہ نامیسا اور بندہ بے نیاز میں
 (بندہ بے نیاز) عشق کا حسنِ طلب، اک معنی بے لفظ ہے
 (معنی بے لفظ) سانس لیتا ہوں تو آتی ہے صدائے بازگشت
 (گرفار حال) اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے حال میں
 کوئی حیرانِ خزان کوئی پشیمان بہار

رنگ و بوتے عارضی سے دل پہنے کا نہیں
فکر فردا ہے نظریں خار و امان بہار (خلش فردا)

چشم پر خوں نے مجسم کر دیا موہوم کو
ورنہ بے تعبیر تھا خواب پریشان بہار
پیرہن کیا گھر بھی خوش وقتی کے مارے تنگ ہے
آشیاں ہے اپنے حق میں طرفہ زندان بہار (خوش وقتی دیکھیے)

قافلہ کا قافلہ مارا ہوا ہے دہرے
(سوتے کے سوتے رہ گئے) رہ گئے سوتے کے سوتے سب حسینان بہار

(۲۳) عیبناہی کلام میں ترنم پیدا کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ مگر نازک و
دقیق معانی و مطالب کی ہم آہنگی کے ساتھ الفاظ کے فن کارانہ
رابط و انتخاب سے کلام میں ترنم پیدا کرنا وہ کمال ہے جہاں تک پہنچنا تو کیا
اس کا گرجھنے والا بھی آج یگانہ کے سوا کوئی نہیں۔

زمین کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر
عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہو کر (انقلاب)

پر اے درد کی کوئی نگہبانی کرے کب تک
حقیقت کھل نہ جائے اضطرابِ اذداں ہو کر (مازاداری شکل)

پلٹتی ہے بہت یاد وطن جب دامن دل سے
پلٹ کر اک سلام شوق کر لیتا ہوں منزل سے (یاد وطن)

کہاں تک پردہ فانوس سے سر کی بلالتی؟
ازل سے لاگ تھی باد فنا کو شمع محفل سے (فلسفہ موت)

منگہ برنجی تاہم درد زیتن تنہا
(ورنہائی) صبح دم چنان بینم، شمع انجن تنہا

ہر گلے و ہر خارے فتنہ باہر انگیزد
الغدر دل حیران، صد بہار و من تنہا (کیا کیا دیکھوں)

تا کجا امان یا بد از ہجوم جانبازان
(ہجوم پروانہ) گوشہ گیر فانوسے، بہرہ سوختن تنہا۔

چارہ پشیمانی خوش دلی و خوش کامی

تو پر از ریاکاران، خند باز من تنہا (چارہ پشیمانی)
صدر رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ
(جذبہ ایشار) داور انجی زبید، بال و پر بر من تنہا

(۲۴) غلط ارادہ و امکانا غالب پرستی کے فیشن اور اس کے بعد جھوٹے
ترقی پسندوں کی بڑھونگ نے کسی کو اس

ادب پر غور کرنے کا موقع ہی نہ دیا کہ سادہ اور ٹھیکھ اردو میں کتنی جان ہے اس کے
کیا کیا امکانات ہیں بیسویں صدی میں میرزا یگانہ ہی کی ذات و احد نے اپنے
آرٹ کے ذریعہ سے عملی طور پر ثابت کر دکھایا کہ کیسے کیسے نازک و پیچیدہ حقائق زندگی
کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی و مطالب، کس سادگی و پیرکاری اور آرٹ کی

کی تمام پابندیوں کے ساتھ سادہ اور ٹھیکہ اردو میں بیان کئے جاسکتے ہیں۔

کس کی آواز کان میں آئی
ایسی آزاد روح اس تن میں
ہائے کیا کیا رنگا ہٹکی ہے
یہ کنارہ چلا کر ناؤ چلی
علم کیا علم کی حقیقت کیا
حسن کیا خواب ہو ابیدار
آپ کی یہ اکڑا رہے توبہ
آنکھ نیچی ہوئی ارے یہ کیا
بات ادھوری مگر اثر دونا
میں پیمبر نہیں، یگانہ سہی
امانت میں تیری خیانت کی
یہاں کیا دھڑا ہے جو ہاتھ آئے گا
بہائے گیا گھر بھی ابر کرم !
پتھر کیوں نہ ہو جائے مانگنے کی آنکھ
تو دل سے ہو کچھ تو اک بات ہے
سر بزم پیاسے ہی مر جائے
نہا لیتے گنگا بکھیرا تھا پاک
حسن کے ہتھکھنڈے ارے توبہ
دور کی بات دھیان میں آئی
کیوں پرانے مکان میں آئی
جب کبھی امتحان میں آئی
کہنے کیا بات دھیان میں آئی؟
جیسی جس کے گمان میں آئی
جان تازہ جہان میں آئی !
کب کسی نوجوان میں آئی؟
کیوں غرض درمیان میں آئی؟
اچھی لکنت زبان میں آئی !
اس سے کیا کر شان میں آئی؟
مگر مفت کا بوجھ ڈھویا تو کیا
کلیجے میں پنجہ گڑ دیا تو کیا
جو بویا تو کیا اور نہ بویا تو کیا
کہ عینک سے دھکا پڑیا تو کیا
ہنسا میں تو کیا اور رویا تو کیا
کہ تلچٹ سے دامن جگھو یا تو کیا
گناہوں کو زمرم سے دھویا تو کیا
درو کیا چیز ہے، دو ایک ہے

زہر مٹھانا ہو تو زہری کیا؟
ہنے دے حسن کا ڈھکا پردہ
عکس میرا بھی پڑ گیا ناگاہ
بلند ہو تو کھلے تجھے زور سستی کا
بہار کاٹنے فالے زمین سے ہار گئے
گڑ کے آپ ہم آپ تک پہنچ تو گئے
خوشی میں اپنے قدم چمکوں تو زیبا ہے
چلو بھروسہ متوالی دہی گھوٹ میں خالی
کار برگ کے دنکا ہتھوڑی دیر کا جھگڑا
نشاط آگئی آخر کہہ گیا خدا لگتی
اٹھ سیدھی مستارہ اپنی کہہ تو الٹی کہہ
پڑ چکے بہت پالے دس چکے بہت کالے
کوئی گیری ہے اک انوکھا سانگ
شع کی کون سی ہے کل سیدھی
دوست جب بے تو پوچھنا کیا ہے
وقت بے وقت جھانکنا کیا ہے
ارے آئینے کی خطا کیا ہے
بڑے بڑوں کے قدم دنگا ہیں کیا کیا
اسی زمیں میں دریا سسائے ہیں کیا کیا
مگر خبر بھی ہو کچھ پھیر کھائے ہیں کیا کیا
وہ لغزشوں پہری مسکرائے ہیں کیا کیا
یکہری جوانی کیا - جذبہ لبالب کیا؟
دیکھنا یہ ناوان جینی کا ہے کرتب کیا
راستی کا پھل یا تباہندہ مقرب کیا
سادہ ہو تو کیا چاہا بھانپنے کا ہر ڈھب کیا
موزیوں کے موزی کو فکر غش غروب کیا
مانگنا ہے کھلے خزانے مانگ
ارے جو بات ہے سواوٹ پٹانگ

۳۲
۱۔ ایک عجیبہ ذائقہ پر اتنا حوصلہ نہایت ہو گا کہ یہ کوئی عاشقہ شاعری نہیں ہے بلکہ شاہدہ حسن کے
۲۔ تاثرات کا فلسفیانہ مطالعہ ہے۔ لہٰذا کیا جگہ جو شکر موصی مارے چلے جاتے تھے مگر میں سب
۳۔ گائی، کہ زندہ رہنے کے لئے ہنر چاہیے۔ لہٰذا بھانپنا بمعنی تاثر لینا۔ قرینے سے سمجھ جانا۔
۴۔ سانگ یا سوانگ بمعنی روپ۔ دونوں روزمرہ میں داخل ہیں۔

کس طلب میں چلا ہے بے اکل
صلح ٹھہری تو ہے برہمن سے
ایک اور ایک دو کسے سمجھائیں
اڑ چلے کیا فرشتہ انسان سے؟
پھرتے ہیں بھیس میں جینوں کے
کون دیتا ہے ساتھ مردوں کا
خوالہ پیالہ ہو یا نوالہ ہو

آنکھ والوں سے پہلے آنکھیں مانگ
کہیں مذہب اڑانے کو کوئی ٹانگ
ان کے منے کی ہے وہی اک ٹانگ
سوار ان اسکی اس کی ایک بھلا ٹانگ
کیسے کیسے دُکیت تھا ٹانگ کی تھا ٹانگ
حوصلہ ہے تو باندھ ٹانگ سے ٹانگ
بن پڑے تو جھپٹا بھیک نہ مانگ

(۲۵) شعر کی تشریح ممکن
ذیل کے اشعار میں حقائق زندگی جو ہیں سو ہیں غور طلب
امر یہ ہے کہ آیا یہ اشعار ہیں یا سیدھی سادی شراک منکر
یہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر یہ اشعار ہیں تو ان کی شراک ہوگی

کارگاہ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
بیدلوں کی ہستی کیا، جیتے ہیں نہ مرنے ہیں
کیمیاء دل کیا ہے؟ خاک ہو مگر کیسی؟
ترک لذت دنیا کیجئے تو کس دل سے؟
کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
چوتوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
یہ سب پڑھ جانے کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ کوئی ذہنی تفصیلت و نسبت
کا نتیجہ ہے یا قلم برداشتہ سہل نگاری۔ پہلے بھی بہت سے اشعار گزر چکے ہیں جن کی نسبت

اک طرف اُجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے
خواب ہے نہ بیداری، ہوش ہو نہ مستی ہے
لیجئے تو ہنسکی ہے لیجئے تو سستی ہے
ذوق پار سالی کیا؟ فیض ننگدستی ہے
فکر کی بلندی یا حوصلہ کی پستی ہے
چال سے تو کا فر پر، سادگی برستی ہے
یہ سب پڑھ جانے کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ کوئی ذہنی تفصیلت و نسبت
کا نتیجہ ہے یا قلم برداشتہ سہل نگاری۔ پہلے بھی بہت سے اشعار گزر چکے ہیں جن کی نسبت

سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ شریعے یا شعر؟
(۲۶) جدت تصرف۔ یہ بھی میرزا یگانہ کی اجتہادی قوت کی دلیل ہے کہ پیش پا
آدہ باتوں میں تجدید کرتے ہیں۔

"He has given most ordinary words & phrases new
& operations never heard before. He has given most familiar
ideas their first poetical life. In his works are exhibited
the two most engaging powers of a poet; new things are
made familiar & familiar things are made new."

نظر اپنی پیرائی ہو چکی بس! -
آرہ یہ کیا لڑائی ہو چکی بس؟ -
ادبی دن سے جدائی ہو چکی بس! -
پتنگوں کی چڑھائی ہو چکی بس!

کارگاہ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
بیدلوں کی ہستی کیا، جیتے ہیں نہ مرنے ہیں
کیمیاء دل کیا ہے؟ خاک ہو مگر کیسی؟
ترک لذت دنیا کیجئے تو کس دل سے؟
کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
چوتوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
یہ سب پڑھ جانے کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ کوئی ذہنی تفصیلت و نسبت
کا نتیجہ ہے یا قلم برداشتہ سہل نگاری۔ پہلے بھی بہت سے اشعار گزر چکے ہیں جن کی نسبت

میرزا صاحب نے زندگی بھر میں ایک
شعر بھی امرا۔ حکام یا تاجروں کی فزائش
کے لئے نہیں لکھا۔ محض اپنے شوق کا نتیجہ ہے۔ اس کے لئے

therefore found that naked excellence was not sufficient for its own support. The ill-will practised against him & his works never disheartened him or lessened his confidence in himself. His opponents neither awed him to silence nor to compliance. While the distributors of literary fame were endeavoring to depreciate & degrade him, he went on without fear & never turned aside to quiet them by civility. "He was a peculiar sort of man who instead of wishing to seem better, delighted in seeming worse than he was. He was not only careful to hide the good he did, but willingly incurred suspicion of evil which he did not

"He has the conscious satisfaction in acting right, in feeling himself true & unpretending; So he

کسی گواہ کی ضرورت نہیں۔ آیات و حقائق اور ترانہ خود اس امر کے شاہد عادل ہیں کہ یہ خلوص یہ دل گری یہ *finish* کسی اجرت کسی قیمت پر نہیں آسکتی۔ البتہ بغض و حسد ہی ایسے *genius* کو حد کمال تک پہنچا دیتا ہے۔ دوسو برس پہلے کی یہ تحریر آج بیکانہ پر لفظ بہ لفظ صادق آ رہی ہے۔ He never exchanged praise for money, nor opened a shop of condolence or congratulation. He suffered all the noble marriages to pass without a song and derived no opportunities from the accidental disposition of the people. He is one of the few who never stooped to flattery. One who has flattery ready for all whom the vicissitudes of the world happen to exalt must be scorned as a Prostituted Mind that may retain the glitter of wit but has lost the dignity of virtue."

Though his want of complaisance made him enemies, yet the better part of mankind was obliged by the freedom of his reflections. He trusted entirely on his own merits; he ensured no band of applauders, nor used any artifice to force success, and

پہچان ہے۔ اب کون سمجھے کہ فطرت نے میرزا یگانہ چنگیزی کو کس طور پر وضع کیا تھا؟
 یگانہ تو وہی جانے اپنی حقیقت
 سمجھے کون تیرے سوا جانتا ہے

(۲۹) فکرِ ملیخ اور مرکزِ نظرِ ثانی کا کرشمہ

By his wonderful command over language, his poetical prudence and systematic diligence he has been acknowledged the most correct of all poets. He never sacrifices accuracy to haste, nor indulges himself in contemptuous negligence or impatient idleness. He knew that mind is always enamoured of its own productions and did not allow his first fondness to deceive him. He always consulted himself and let nothing pass against

So he lives with that secret yet sufficient contentment which has done much to prolong his life in spite of adverse circumstances."

(History repeats)

میرزا یگانہ کو یہ معلوم کر کے خوش ہونا چاہیے کہ یہ تو انھیں کے کیر کڑ کی تصویر ہے جو دوسو برس پہلے کہنچ گئی تھی ایک تو وہ ہیں جو فی الواقع نیک ہیں اور وہ نیکوں کی رکھتے ہیں۔ دوسری وہ کہ وضع تو نیکوں کی سی اور کرتوت بُرے تیسری وہ جو فی الحقیقت ایسے بُرے نہیں ہوتے جیسا وہ اپنے تئیں ظاہر کرتے ہیں اس طرح لوگوں کو دکھایا بنا کر تاشاد دیکھتے ہیں یہ یوا لبعجبی genius

his own judgment. The rectitude of his mind is apparent from the fact that not a single line of his contains any unnatural thought."

بقول پروفیسر مجنوں زبان کا کٹر سے کٹر نقاد بھی یگانہ کے اجتہادات کو بدعت نہ کہہ سکا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ گزشتہ چھتیس سال کی مدت میرزا یگانہ کے کسی ایک شعر پر کسی سے کوئی سچا اور جاننا اعتراض نہ نہ پڑا۔ ہزاروں زخم خوردہ دلوں نے یگانہ کے کلام کا بار بار مطالعہ کیا ہو گا (دشمن کی نظر سے) مگر کسی کا قلم اٹھ نہ سکا۔ جب یہ حقیقت عام طور پر آشکارا ہو گئی اور یہ سوال کانوں کو تکلیف پہنچانے لگا کہ کیا واقعی یگانہ پر کوئی فیج اعتراض ہو نہیں سکتا تو دو ایک کی رگ پھٹک اٹھی۔ خیر لکھا دونوں نے، لڑکھڑاتے قلم سے جو کچھ لکھ سکتے تھے مگر یہ سمجھتے تھے کہ وہ خود اپنے دل کو جھوٹی تسلی دے رہے ہیں۔ بھلا جھوٹ کے کہیں پاؤں ہوتے ہیں۔ ایک جنبش قلم میں ساری بکواس ہوا ہو گئی۔ کوئی اعتراض سچا نہ نکلا۔!

In his descriptions of life & Nature (۳۰) یگانہ آرت شعرو حکمت کا مجموعہ the poet & philosopher happily co-operate"

خدا را میرے ان کے اور کوئی درمیاں کیوں ہو پیغمبر کیوں بنے آخر کسی کا راز داں کیوں ہو

کبھی جلوہ دکھاتے ہو تو آئینہ در آئینہ (آئینہ کا پردہ) کھلا پردہ ہی پھر بھی یہ پردہ درمیاں کیوں ہو

مرے دل میں سا کر دیکھا اپنے حُسن کا عالم (حُسن کی کسوٹی دل) کو آئینہ خانے پر نگاہ امتحاں کیوں ہو مرے ہوتے غریبوں کو ستانا اور پچکانا (درد ویشیانی) تمہیں درد ویشیانی نصیب دشمنان کیوں ہو

وہ جب ہے کہ رفتہ رفتہ امیدیں پھلین پھولیں (رفتہ رفتہ پھولنا پھلنا) اگر نال کوئی فضل الہی ناگہاں کیوں ہو اک آنکھیں ہیں کہ تکتی ہیں کسی کو ٹنگلی باندھے (فلسفہ عبادت) یہاں سر پہ نہ سودا ہے تو سجدوں کا نشان کیوں ہو

کہیں کچھ نہیں آتا پڑھے جاؤں تو کیا حاصل (نماز نربان غیر کیا معنی؟) ماروں کا ہے کچھ مطلب تو پر دیسی زبان کیوں ہو کہیں رسمی عبادت روح کو بیدار کرتی ہے (رسمی عبادت بے سود) نماز بے عمل سے حق مذہب راہیگاں کیوں ہو

اُمی سے اڑ چلے ہیں پر لگا کر خاک کے پتلے (کرشمہ ارتقا) خداوند زمین سے نیست اتنا آسمان کیوں ہو کہاں خواب و خیال اتنے حقائق ہر طرف جتنے؟ (Facts stranger than fiction) نگاہ نارسا، یہ نقد فطرت راہیگاں کیوں ہو

ہاں آپ کا دنیا سے کچھ کشیدہ ہے (فریب پر فریب کھانا) فریب کھاؤ گے پھر بھی، فریب دیدہ ہے

(فریب ہستی)
یہ سبز باغ کا عالم یہ رنگِ لیل و نہار
بہل ہی جائے گا دل آپ سے دیدہ ہستی

(خطائے حسن)

کھٹکتی رہتی ہے دل میں نگاہِ درویدہ
خطائے حسن کہے کون؟ چشمِ دیدہ ہستی

(نگاہِ شوق کی گرمی)
نگاہِ شوق کی گرمی خدا کی قدرت ہے
فرے پہ آہی گیا حسن، نارِ سیدہ ہستی

دیکھا آج یہ ہیں چند خصوصیات جو میرزا یگانہ میں نہایت صاف اور روشن نظر آتی ہیں آئندہ
جب کوئی متبصر تحقیق کی کسوٹی پر کسے کا توجہ اور زیادہ ثابت ہونا چاہئے گا۔
(میرزا مراد بیگ چغتائی)

(رباعی)

فانوسِ خودی میں آپ مستور ہیں ہم
دیکھا تو ہستی تو نے مگر کیا دیکھا؟
پردہ یہ اٹھے تو نور ہی نور ہیں ہم
جتنے نزدیک آئے ہی دور ہیں ہم

(رباعی)

اللہ رحمی تصور کی یہ رنگین نظری!
کروٹ کروٹ ہے اہل ہستی جنت
غربت میں بھی دل جلوں کی کہتی ہو ہری
جبتنگ ہے ہوائے لکھنؤ میں بھری

(رباعی)

دُنیاے ادب کی ایسی کایا پلٹی
دیکھو تو علی گڑھ کی یہ بالغ نظری
کالا گوا بھی بن گیا شیرازی!!
چیل اڑتے جو دیکھیں تو کہیں بھین اڑی

ایکادِ وحیدانی

جنہیں ذوقِ حضوری خوابِ بیداری میں حاصل تھا
خداوندِ اوہ آنکھیں کون سی تھیں کون سا دل تھا
وہ قرب وہ حضوری کہ حجاباتِ نظر اٹھا بھی دئے جاتے تو یقین میں کوئی اضافہ
نہ ہوتا۔

خدا یاد آ گیا واللہ وہ جلوہ بھی دیکھا ہے
خدا جانے وہی حق تھا کہ حق کا عکس باطل تھا
مشاہدہ جلال و جمالِ فطرت کا طبیعت پر اثر۔ پھر اس کے بعد تخیل کا عمل
دل و دماغ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔
تماشا گھرِ حیرت میں کہاں کا تو کہاں کا میں
بس اتنا تھا کہ آئینے سے آئینہ مقابل تھا
روشنی سے روشنی ٹکرائی۔ نتیجہ معلوم۔

"He works wonder by the subtlety of his
mind & gives delight by its fertility."

اندھیری کو ٹھہری میں آئینہ دیکھا تو کیا دیکھا
یہی دیکھا کہ میں خود دیدہ بینا میں باطل کھلا تھا

تنگ و تاریک ماحول میں انسان خود کو بھول جائے دیکھتی آنکھوں سے اپنے متیں
نہ دیکھ سکے تو کیا عجب مگر یہ یگانہ ہی تھے کہ سوسائٹی کے تاریک ماحول میں بھی اپنے
متیں فراموش نہ کر سکے آرٹ کا یہ حیرت انگیز نمونہ یگانہ ہی جیسے خود متنا سس
genius کے قلم سے نکل سکتا تھا۔

"He can invest himself with grace
when he likes, but his natural tendency is
the loftiness of thought. He can please when
pleasure is required, but it is his peculiar
power to astonish by universal truths."

(فلف نے ایسی کروٹ لی کہ تڑکا ہو گیا ظالم
آہ یہ مہنہ کیا کیا واہ یہ مہنہ کیا کیا
قیامت ہی جبرائیل حسن کا ۶ نور ہو جائے
عشق میں سب پڑھا لکھا بھول گیا بھلا دیا)

زہے حسن گنہگاری، زہے فیضِ ایشیانی
جسے ٹھنڈا پسینا آگیا جنت میں داخل تھا

سچی مذمت کا لازمی نتیجہ ہے ٹھنڈا پسینا آجانا۔ پھر کمپوں نہ رحمت جوش میں
آئے۔ اب حسن گنہگاری اور فیضِ ایشیانی کی (جو بظاہر الٹی اور بے معنی سی بات معلوم

ہوتی تھی) حقیقت پایہ ثبوت کو پہنچ گئی۔ کتنی سچی انوکھی اور حیران کر دینے والی
مدت ہے بیسویں صدی میں ہندوستان کا کوئی سخنور شعر کو اس منزلِ اتقا
پر پہنچا نہ سکا
"of happy & judicious irony by which the
reader is surprised into substantial
improvement."

نگاہِ شوق کی دنیا خدا جانے کہاں تک ہے
جہاں دیکھا وہی حسنِ یگانہ شمع محفل تھا

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

خدا کی مالک بن جانا بھی کوئی آسان بات نہیں ہے مگر بنے رہنا اور زیادہ
مشکل ہے بڑا ظرف بڑا دل چاہیے۔ غور کا علاج میٹھی باتوں سے نہیں ہوتا۔ ہاں
طنز بہت جلد کارگر ہوتا ہے۔ یہاں اس طنز میں ایک اور حکمت پوشیدہ رکھی گئی
ہے یعنی مغروروں پر قلم کھلا طنز نہیں کیا گیا ہے بلکہ خود اپنی ذات کو (خدا بنے
تھے یگانہ) نشانہ طنز بنا کر پتے کی بات کہہ دی جو کبھی بھول نہیں سکتی شعرِ ایشیانی
کی حد کو پہنچ گیا۔

پیام زیر لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا
جذباتِ شوق کی شاعرانہ مصوری اپنی حد کو پہنچ گئی ہے۔

genius has clothed for us in melodious words
which bring melody into our hearts— is not the
essentially of the nature of worship?"

کروں تو کس سے کروں دردِ نارِ سا کا گلہ
کہ مجھ کو لے کے دل دوست میں سمائے گیا
سبحان اللہ دردِ نارِ سا سے کتنی تلخی احساس پیدا ہے۔ اپنا دردِ دل کمال کو
پہنچا ہی نہیں تو دل دوست تک رسائی کیونکر ہو۔ دردِ کامل ہوتا تو دل دوست
میں سا کر آسے بھی تڑپا تا رہتا۔ میری یاد آسے بھی چین نہ لینے دیتی۔ اس
شدتِ احساس کو بیان کرنے کے لئے یہ اندازِ بیان رکھ مجھ کو لے کے دل دوست
میں سمائے گیا کتنا اچھوتا ہے۔ یہ ہیں وہ حقایقِ زندگی جن کا تجربہ پاک و پاکیزہ زندگی بسر
کرنا والوں کو اسی دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔

پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی اڑے آنے گیا
ایک نہیں تین سو ساٹھ خدا مگر کوئی بھی فرما دیکو نہ پہنچا
(دم بخود ہے تو پھر خدا کیا ہے)

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو بھانا
خدا کے گھر تو کوئی بندہ خدا نہ گیا

اک سادہ سے سادہ انسان بھی خدا پر یقین رکھتا ہے مگر کیونکر؟

ہنسی میں وعدہ فردا کو ٹالنے والو
لو دیکھ لو وہی کل۔ آج بن کے آنے گیا
وعدہ فردا کو ہنسی میں ٹال دیا تھا شاید اس خیال سے کہ کل آنے ہی نہ پائیں گے
مگر ایسا نہ ہوا۔ وہی کل جو بہت دور نظر آتا تھا "آج" بن کر سامنے آگیا۔ قیامت
آگئی۔ کہو اب کیا کہتے ہو۔

گناہ زندہ دلی کہئے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لئے اتنا کہ پھر مہمانہ گیا
"گناہ زندہ دلی" کتنا اچھوتا کتنا شدید احساس ہے۔ جوانی اور زندگی کی ترنگ
میں ہنس ہنس کے کسی غریب کا دل دکھاتے رہے اور وہ بچہ چپکا سنتا رہا۔ آخر ہنستے ہنستے
تھک گئے۔ اب احساس ہوا کہ یہ کتنا بزرگناہ کر بیٹھے۔ اسکا ردِ عمل یہ ہوا کہ پھر کسی پر مہمانہ گیا
گویا ہنسنا ہی بھول گئے یہ ہے وہ رشد وہ کلچر جو اک شریفِ نفس ہی کو حاصل ہو سکتا ہے
سہو و خطا کی منزلوں سے گزرنے کے بعد یہ ہے تعمیری ادب۔ انسانیت کی تعمیری تہذیب
کے لئے سچا رہنا۔

کچھ کیا تھے مگر سُنتے تھے ترانہ درد
نہج میں آنے لگا جب تو پھر سُنانے گیا

مرتبہ رشد پر پہنچنے کے بعد یہی گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر سچی تان پر دل ہاتھ سے
نکل جاتا ہے۔ یہی حال ہے سچے شعرا کا۔ یہی وجہ ہے کہ جھوٹی تمناؤں سے سچے شعرا مطالعہ
بہت کچھ معنی رکھتا ہے۔ سوز و گداز اور معرفتِ بخشا ہے اور یہی عین مقصد ہے عبادت کا۔

"The noble sentiments which the gifted soul of a"

بتوں کو دیکھ کر یہاں بتوں کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔ یعنی آثار قدرت کے مشاہدے سے پاک طینت پاک سیرت انسانوں کے دیدار سے دل و دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ انھیں آثار قدرت کو (جن میں انسان بھی شامل ہے) بت یا خدا نامہ یا وجہ الشہادہ وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شان خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

کون ایسا ہے جاننے والا
جان کر تجھ کو ماننے والا
خدا کو یا میرزا غالب کو جاننے کی طرح کون جانتا ہے گمراہی سب میں یہ بھی
فیض وہ بھی فیض۔ شعر اس اعتبار سے بھی لا جواب ہے کہ ایک منکر اسے شعر تسلیم
کرتے سے انکار کر دے گا کیونکہ یہ بالکل نثر ہے اس کی نثر ہو نہیں سکتی۔ مگر ایسی نثر
جس میں وزن بھی ہے قافیہ اور ردیف بھی۔ معانی و مطالب بھی۔

پہلے اپنی تو ذات پہچانے
راز قدرت بکھانے والا
کتنا سچا طنز ہے کہ حکمت و معرفت کا پہلا ذمہ ہے خود شناسی پہلے اُن حقایق
کو سمجھنا چاہیے جو اپنی ذات میں موجود ہیں بعد ازاں موجودات عالم بکھاننا
کھینچ اہل زبان کا روزمرہ ہے جس کے معنی ہیں کھول کھول کے بیان کرنا۔
طنز کی راہ سے فلسفی کو راز قدرت بکھاننے والا کہا ہے جو کائنات پر

اے کتنا معنی خیز قافیہ ہے مگر شاید ہی کسی کے ذہن میں آیا ہو حالانکہ عین روزمرہ ہے کوئی
متروک یا بھول لفظ نہیں ہے۔ چونکہ اہل زبان کا روزمرہ ہے۔ ”ترقی پسند“ اسے گوارا نہیں
کر سکتے۔ اردو خصوصاً کھینچ اردو کی مخالفت تو اُن کا مشن ٹھہرا۔

گہری نظر رکھتا ہے مگر اپنی خبر نہیں رکھتا۔

جان کر اور ہو گیا انجان
ہو تو ایسا ہو جاننے والا
بڑھنے والا یہی محسوس کرے گا کہ ایسا شعر تو میں بھی کہہ سکتا تھا۔ بظاہر اتنا آسان
جس کی کوئی قیمت نہیں، پھر بھی اتنا مشکل ایسا سہل محتج کہ آج تک کوئی نہ کہہ سکا۔
مگر نگاہ خدا سادگی و پیرکاری میں بھی عیب نکالنے سے باز نہ آئے گی یعنی یہ کوئی
کمال نہیں ہے فقط نثر کی عبارت کو نظم کر دیا ہے۔ خیر جو چاہو کہو مگر شعر اتنا سچا اتنا
مکمل ہے کہ بھلا ناچا ہو بھی تو بھول نہیں سکتا۔ ضرب المثل کی حد کو پہنچ گیا۔ اپنے
اکثر اشعار کے بارے میں خود مصنف کی بھی یہی رائے ہے۔

انگریزی زبان کے نقادوں میں اس مسئلہ پر بحث ہو چکی ہے کہ آیا شاعر خود اپنے
کلام پر معیج محاکمہ کر سکتا ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ میں ڈاکٹر جانسن نے ڈرائڈن کی رائے
کو تسلیم کیا ہے۔ وہ یہ کہ جہاں فن شعر کے اصول و ضوابط کا تعلق ہے شاعر اپنی
سازش پر بھروسہ کر سکتا ہے (مگر شاعر پر فنیسی غالب آجائے تو خود پسندی کا بڑا احتمال ہو)
اور جہاں کلام کے اچھے یا بُرے ہونے کا معیار دوسروں کی پسند ہے تو پھر کوئی کلام اس
وقت تک اچھا نہیں کہا جاسکتا جب تک دوسروں کو پسند نہ آئے۔

گزشتہ چھتیس سال کے اندر آج تک یگانہ آرٹ کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کسی
جماعت کی طرف سے نہیں کیا گیا۔ اور یہ ممکن بھی نہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ملک اس آرٹ
کی طرف سے انجان ہو گیا اور اس کے خاص اسباب میں معقول ہوں یا نامعقول۔
وہی یگانہ کو مغرور سمجھ لینا۔ غالب کا دشمن سمجھ لینا۔ اور جو غالب کا دشمن وہ ادب کا
دشمن وغیرہ وغیرہ۔

most animated nature imaginable. You are not coldly informed of what was said or done by a third person; the reader is hurried out of himself by the force of the poet's imagination."

دنگوں سمجھے اور نہ را نگورات وقت کی قدر جاننے والا
شعرا تنہا سادہ اتنا برجستہ کہ ضرب المثل کی حد کو پہنچ گیا۔ بظاہر تنہا آسان مگر
یگانہ کے سوا اور کسی کے حصہ میں نہ آیا۔ "He has given most familiar ideas their first poetical life."

میں سمجھ لو نگاہ دوست تو کون؟ مجھے رہ رہ کے تانے والا!
لگائی بچھائی کرنے والوں کو کس زور سے ڈانٹا ہے۔ حساب دوستاں دڑوں
ہم آپس میں سمجھ لیں گے۔ آپ کون ہوتے ہیں اُس نے والے بھر کانے والے۔ دیکھتے قافیہ
کی موسیقیت اور معنویت "sense & sound" کے توازن سے کلام
میں کتنی ردائی کتنی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ فتنہ پردازوں کے ہتھکھنڈوں پر دل
میں جوش و جذبہ نفرت پیدا ہوا ہے اس کے اظہار کے لئے بولب لہجہ اختیار کیا
گیا ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی موثر طریقہ ممکن ہی نہ تھا۔ جذبہ نفرت جتنا شدید
تھا۔ زبان نے بھی ویسی ہی دلخراش صورت اختیار کی۔ آرٹ کی تمام نزاکتوں کے
ساتھ شعر حد کمال کو پہنچ گیا ہے۔ سبحان اللہ۔

Sentiment + Expression - It is the sentiment that swells & fills out the Diction, which rises with it for in the same degree that a thought is warmer, an

حالانکہ ان باتوں میں سے کوئی بھی ممکن نہیں۔ اک سچا شاعر ہرگز کسی کے کمال کا منکر نہیں ہو سکتا۔

پریٹ کے ہلکے لاکھ بڑیاں کوئی کھلتا ہے جاننے والا؟
محرم اسرار اور نامحرمان کم حوصلہ کی نفسیاتی کیفیت دکھائی ہے۔ جاننے والے تو
ایسی چپ سادہ لیتے ہیں جیسے کچھ جانتے ہی نہیں اور کم ظرف ہیں کہ لبلبہ تے پھرتے ہیں
کیا کیجئے یہاں اک محاورہ آگیا جسے عجیب ٹھہراتا ترقی پسندوں کا بند بھاری وگرام ہے
دیو زادوں کی زبان اختیار کی جاتی تو شاید یہ نفسیاتی حقیقت جو شعر میں بیان کی گئی ہو
یاروں پر واضح ہو سکتی تھی محاورے نے پریٹ کے ہلکے لاکھ بڑیاں شعر کو گویا اپنے مرتبہ
سے گرا دیا۔ یہ ہے "ترقی پسندوں" کی ذہنیت یا مصلحت۔ افسوس۔ مگر آقا یوں کی سمجھ میں
کبھی نہ آئے گا کہ یہاں میرزا صاحب نے پریٹ کا ہلکا کیوں کہا۔ یہ نتیجہ ہے اس طنز و ذہنیت
اس طنز و انداز فکر کا جو یگانہ کا جو خصوصیت ہے جس نے جنگ خفوں کے لئے پریٹ
کے ہلکے کی بھینٹی کہلوادی۔ یہ محاورہ بازی کا خبط نہ تھا طنز یہ انداز بیان کا اقتضا تھا۔
سادہ اور ٹھیکہ اردو سے عداوت جو نام نہاد ترقی پسندوں کے لئے بایہ فخر و ناز ہے اس کا
سبب غفلت یا نارسائی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جی ہاں انگور کھٹے ہیں۔ مگر
انگور کھٹے ہوں خواہ میٹھے بے دسترس کی طعنہ زنی کیا؟

خاک میں مل کے پاک ہو جاتا چھانٹا کیا ہے چھانٹنے والا؟
شعر کا توازن اتنا درست ہے کہ ایک بار سن لینے کے بعد شعر بھول ہی نہیں سکتا۔
"No man of a true poetical spirit is master of himself while he reads the poet. What he writes is of the

expression will be brighter; as that is more strong, this will become more perspicuous like a gem in the furnace, which grows to a greater magnitude and refines to a greater clearness, only as the breath within is more powerful & the heat more intense."

چیت بھی اپنی سے پٹ بھی اپنی ہے
میں کہاں ہار ماننے والا ہے
حسن کا فرگناہ کیا پیا
بے گناہوں کو سامنے والا ہے
تو نے جانا مجھے تو کیا جانا ہے
تجھ سے اچھا نہ جاننے والا ہے
کیوں نہ ماننے یگانہ کو یکتا
اصل کو ایک جاننے والا ہے

کیا معنی کہ ذات تو وہی ایک ہے (واجب الوجود) وہی روح سنسار میں دوڑ رہی ہے شہر بھر میں بجلی کے قمعے تو ہزاروں روشن ہیں مگر ان سب میں وہی ایک روح بجلی کی وہی ایک لہر دوڑ رہی ہے۔

تو نے جانا مجھے تو کیا جانا؟ غلط جانا۔ اس سے نہ جانا اچھا تھا۔ ملک میں تین قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو یگانہ کو صحیح روشنی میں دیکھتے اور صحیح طور پر جانتے ہیں۔ دوسرے یہاں یہ بھی یاد دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کا نقاد اعظم ڈیڑن اپنی بھی تعریف کرتا ہے خود شناسی کی بنا پر اور امریکی تعریف بھی کرتا ہے بطور تجارت۔ وہ تھا ڈیڑن اور یہ ہیں میرزا یگانہ کہ خود شناسی اور خود پرستی کے سوا زندگی بھر میں کسی امیر کسی رئیس کی تعریف میں ایک مصرع بھی نہیں کہا۔ نہ اپنی شاعری کا ناجائز مصرف لیا۔ اے بھلا اللہ سلام ہو ایسے بہادروں پر۔

وہ جو یگانہ کو نہ جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں معذور ہیں۔ تیسرے وہ جو یگانہ کو جانتے ہیں مگر نہیں جانتے یعنی غلط جانتے ہیں۔ ایسوں سے یاروں کو نفرت ہے اور ہونی چاہیے۔ یہ حقیقت کتنی عجیب ہے کہ حُسن خود گناہ کا پیا سا ہے۔ بے گناہوں کو خود سان لیتا آلودہ کر لیتا ہے۔ کتنا تازہ اور معنی خیز قافیہ ہے۔ گناہوں میں سان لینا، اس کی لذت ہی اٹھا سکتے ہیں جو اردو بولتے ہیں معترض اس کی لذت کیا اٹھائے گا؟ وہ تو آٹا سان لینا یا کچر سان لینا جانتا ہے۔ اس قافیہ کا یہ انداز نصف اتنا نادر ہے کہ لہلہ بان شعر میں کچھ رک اٹھتے ہیں۔ آرٹ کے نکتہ داں سمجھ سکتے ہیں کہ یہ انداز نصف قوت اختراعی کا آگ ثبوت ہے، زندگی کے حقایق و معارف جو ہیں سو ہیں پیدا نہیں کئے جاتے۔ انہیں حقایق پر تازہ انداز نصف کو *سبکدوش* یا اختراع کہتے ہیں اچھا اب آئیے۔ چیت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے۔ یہ تصویر ہے ان پختہ کاریوں اور شاعریوں کی (خصوصاً سیاسی شاعری) جو زبردست حریف کو اپنی حکمت عملی سے اتنا عاجز کر دیتے ہیں کہ اس کی فتح بھی ہو تو شکست سے بدتر ثابت ہو۔ جو ہارتے بھی ہیں تو اپنے فائدے کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ یہ ہے مردان سیاست کی عملی زندگی۔ چیت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے کے یہ معنی ہیں۔ اس شعر پر معترض کہتا ہے کہ جس نے ایسے شعر کہے (یعنی یگانہ نے) کہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے، تعجب ہے اب ایسا کہے۔ مگر بندہ نواز ایسا کیوں نہ کہے۔ آخر یہ شعر کیسا ہے؟ کچھ فرمائیے تو سہی۔ آپ اس شعر کا مطلب کیا سمجھے؟ اگر دل میں کوئی چور ہے تو اندر ہی اندر پالتے کیوں ہو نکال دو۔ بھرتا کیوں؟ ظالم جا کر کیا ہے؟ سچھی میں چور ہو رہا نہ یگانہ کیوں؟

میرزا صاحب پر نو آموز معترض نے بڑی جرأت کے ساتھ یہ اعتراض کیا ہے کہ بے گناہوں کو سانسے والا بکھانے والا۔ حافظ پر بارہیں سماعت پر ضرب لگاتے ہیں گو اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے کی عادت میرزا کی گناہ پرانا جوہر ہے مگر اب اس کی کثرت نے اشعار میں ثقل پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ غیر مانوس الفاظ جنہیں غزل کی لطیف زمین قبول کرنے کو تیار نہیں استعمال کرنا اپنے آپ کو گرا کر لے۔ خدا کرے تاریخ اپنے آپ کو دھرائے اور میرزا کی گناہ پھر اپنے پڑائے رنگ میں کہنے لگیں۔

”یہ دعا قبول نہیں ہو سکتی کہ جگنا پھر اپنے پڑائے رنگ میں کہنے لگیں۔ زمانہ آگے بڑھ کر عجب نہیں ہوتا۔ ان کا کوئی پڑانا رنگ نہیں ہے۔ ایک ہی رنگ ہو جو رفتہ رفتہ پختہ ہوتا گیا۔ ان کی رفتار قدرتی ہے نقلی نہیں ہے۔ میرزا کی گناہ غزل کی حدود سے خارج ہیں۔

ملک کے گراہ نو جوانوں کی یہ ذہنیت افسوسناک ہے کہ خود اپنے جہل مرکب کے زعم میں وہ جگنا جیسی شخصیت کے سامنے اس طرح بڑھ بڑھ کے باتیں کریں۔ ثقل و غیر مانوس کا صحیح احساس لکھنؤ اور دہلی کے سوا اور کبے ہو سکتا ہے۔ غزل کی لطافت سے بیکانہ بے خبر تو نہیں ہیں۔ لطافت و کثافت کے پرکھنے کا معیار اس بیسیویں صدی میں بیکانہ آرٹ سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

سکھایا تو کوئی شخص پیدا نہیں ہوا۔ جو بیکانہ کو اس بے ادبی کے ساتھ یاد کرنے کا اہل سمجھا جاسکے۔ کوئی دشمن بھی جائز طور پر یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ بیکانہ نے کسی مقام پر اپنے کو گرا لیا ہو ہاں ملک کی ذہنیت عامہ سے بے پروا ہو کر اپنے تئیں مٹا میرزا کی گناہ کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو مٹاتے رہتے ہیں اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کہاں تک مٹ سکتے ہیں؟

اپنے فن کے مجذوب ہیں۔ اپنی حدیں پہناتے ہیں۔ معترض کو بھی اپنی حدود میں رہنا چاہیے۔ غزل کی لطافت یا کثافت کا وہ مفہوم جو عوام کے ذہن میں ہے (عاشقانہ یا اواباشانہ) وہ بیکانہ کے ہاں متروک ہے۔ سانسے اور بکھانا جسے ثقل اور غیر مانوس معلوم ہوں اسے اردو زبان سے کوئی واسطہ رکھنا نہیں چاہیے۔ یہ الفاظ لکھنؤ کے عام روزمرہ میں داخل ہیں۔ ثقالت و غرابت کی تلاش ہے تو غالب کے گھر جاؤ۔ اردو کے ٹھیکھے الفاظ جو روزمرہ میں داخل ہیں انھیں مجتہدانہ انداز سے برت کر میرزا کی گناہ نے دکھا دیا کہ ٹھیکھے اردو کے امکانات کتنے وسیع ہیں کیا کیا معانی ناز و بلند ٹھیکھے اردو میں آسانی سے ادا ہو جاتے ہیں۔ سادگی کو اس بلند ہی پر پہنچا دیا جس کا تصور بھی غالب کے لئے ناممکن تھا۔

کون جانے وعدہ فردا وفا ہو جائیگا؟ جسے کل تک خدا معلوم کیا ہو جائیگا؟ فطرت نے سچا شاعرانہ شعور بخشا ہو تو روزمرہ زندگی کے واقعات شعر کے سانچے میں ڈھل کر شاعر کو معلوم نہ ہوتا دیتے ہیں اور عرض بالمثل ہو جاتا ہے اعتبار وعدہ واجب بدگمانی کفر ہے کفر سے باز آئیے وعدہ وفا ہو جائیگا بدگمانی بے فائدہ پیدا ہو جانا لازمی بات ہے۔ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کسی شخص کا وعدہ کے وعدہ پر تنگ کیا جائے تو اس کا رد عمل یہ ہو گا کہ وعدہ کرنے والا اپنے قول سے پھر جانے میں کوئی ندامت محسوس نہ کرے گا۔

اس کے برعکس بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنی سادہ دلی سے کسی کے جھوٹے وعدہ پر بھروسہ کر بیٹھے اور آخر آخر تک امیدوار رہے تو جھوٹا وعدہ کرنے والا اپنے جھوٹ کو سچ کر دکھاتا ہے۔

درد مندوں کی کہانی پر دل بے دستر ہاتھ ملکر فرض سے اپنا ادا ہو جائیگا
دل بے دستر سنا زہ ترکیب ہے فصیح و بلیغ انسان کتنا مجبور ہے نیکی کرنا چاہتا ہے
اور نہیں کر سکتا۔ ہاتھ مل کر رہ جاتا ہے شیت الہی کو کون سمجھے؟ نیکی کا جذبہ تو بخشتا مگر عمل خیر
سرا انجام دینے کے لئے جو اسباب ضروری ہیں ان پر دسترس نہ بخشتا۔ یہ جلیغ فصدین کیا ہے؟
کیا خیر بھی مل سنا ہنساہ آخر ایک دن عشق کے ہاتھوں گداؤ کا گدا ہو جائیگا؟
بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستر ہوا گھٹے گھٹے ایک دن دستر عا ہو جائیگا
تو تمل جب تک تھی دنیا کو زور بازو سے سخر کر لیا۔ پرایا ملک مال تمھیا لیا۔ مگر کب تک؟
وہی دستر تصرف جو حد سے تجاوز کر گیا تھا شل ہو گیا۔ بس اب عا میں مانگتا ہے۔ واہ
آئینہ ہے وہ زیارنگاہ جس کے سامنے خود پرستوں کیلئے سجدہ روا ہو جائیگا
کیا عجب ہے آئینہ میں جس نے اپنی شان جلال و جمال دیکھ کر سجدے میں جھک جائے۔ یہ شعر
مومن کی حدوں میں داخل ہو گیا ہے جو میرزا بیگانہ کے طبعی مذاق (حقیقت نگاری) سے
بعید ہے۔

عشق کا حُسن طلب اک معنی در لفظ ہو ٹکٹکی بندہ جاسکی مطلب ادا ہو جائیگا
"His art has the highest touch of finish, significant
and condensed to the utmost."

یہاں حقیقت نگاری و مختصر نگاری حد کو پہنچ گئی ہے جس کی مثال نایاب ہے عشق
کے حُسن طلب کو معنی بے لفظ کہنا جو دت ذہنی کی روشن دلیل ہے۔ بیگانہ کی فکر نہیں پر ختم
نہیں ہو جاتی۔ وہ آرا گے بڑھتے ہیں ۵

ٹکٹکی بندہ جائے گی مطلب ادا ہو جائیگا

اس طرح معنی بے لفظ کا کل ثبوت دیدیا۔ زندگی بھر میں ایسا ایک شعر بھی کوئی
کہ لے تو بجا طور پر کہہ سکتا ہے کارے کر دم۔

ہو ذرا سی ٹھیس کا ہماں جیا جیا لب اک اشار میں ہوا کے دم فنا ہو جائیگا
ذرا سی ٹھیس کا ہماں جیا جیا شدت احساس ہے۔ یہی نہیں بلکہ جاب جاب بلب او
اک اشار میں دم فنا ہو جائے گا، شدت احساس کی ترقی پر ترقی۔ دو مصرعوں میں یہ
کلیجہ معانی ہماں جیا جیا۔

سانس لیتا ہوں تو آتی ہو صد بار گشت کون ہوں گا کہ ال نالہ رسا ہو جائیگا
ہر سانس صد بار گشت بنکر لپٹ آتی ہے۔ لے کاش وہ دن بھی آچکے کہ اپنا کوئی نالہ
دال مقصود تک پہنچ جائے اور پھر لپٹ کر نہ آئے۔ بیسیوں صدی میں کسی کو اتنا سچا
ال نالہ شعور ہی نہیں ملا جو حقائق عالیہ کو اس شدت کے ساتھ محسوس کر سکے اور ایسی الہامی
ان میں ادا کر سکے۔ جل جلالہ۔

کیا سمجھتے تھے بیگانہ محرم راز فنا
غرق ہو کر آپ اپنا نا خدا ہو جائیگا
مگر آجکل تو مسٹر دوار کا داس خلعہ کا یہ شعر ۵

نا خدا ہونہ میسٹر تو سفینہ کیا ہے؟ تم میرے پاس نہیں ہو تو یہ جینا کیا ہے؟
میرزا صاحب پر دو متضاد کیفیتیں پیدا کر رہا ہے۔ یعنی واقعات کے لحاظ سے
"صرع غلط ثابت ہو کر قدرے سکون کا باعث ٹھہرا ہے اور دوسرا مصرع صحیح

Mr Dwarka Das Shola of Lahore,
the great & the only friend of Meerza Yagana
who has always strongly felt for him

ثابت ہو کر دل کو تڑپا تا رہتا ہے۔ اس تڑپٹھ برس کے سن میں بھی اسی اقتصادی کشمکش نے میزبان گمانہ کو لکھنؤ کا درد مفارقت برداشت کرتے پر مجبور کیا ہے۔ ایسے نازک وقت میں شعلہ کا آڑے آ جانا اور انسانیت کا حق ادا کرنا تاریخ میں یادگار ہے گا۔ یہ رہا رام اور کرشن کے اک بچاری کا برتاؤ اک مسلمان کے ساتھ۔ آدمی آدمی انٹو کوئی ہیرا کوئی کنکریا

کس دل مقیر کو تو نے یہ دلولہ دیا؟ دینا نہ دینا ایک ہنر ظرفیت کا ہے دیا! فطرت کی بوالعجبی دیکھتے تھوڑے سے ظرف میں اتنا دلولہ بھر دیا جو وبال ہو گیا۔ احسان تو کیا مگر رائگاں۔ شاعر کے زور قلم نے اس احسان بے حاصل کا پردہ فاش کر دیا۔ یعنی دینا نہ دینا ایک تھا۔ دیکھو قضا و قدر پر کتنی سچی تنقید ہے جس کا لازمی اور فوری اثر ہے انبساط و حیرت دیکھ کے مجھ کو دل زدہ دور سے منہ چڑھا دیا حسن نے سب مال درج چمکیں نہیں اڑا دیا بن و غم کا پہاڑ جو انسان کو پس ڈالتا ہے حسن کی معجز نائی سے چمکیوں میں اڑ جاتا ہے اک درسا منہ چڑھا دیا اور سارا بن و غم کا فور کتنی عجیب و غریب حقیقت ہے۔ اور کس سادگی و پرکاری سے ٹھٹھ اُردو میں بیان کر دی گئی ہے کیفیت زندگی سے اتنا لبریز شاید ہی کوئی شعر اس دور میں کہا گیا ہو۔

"He has the peculiar power to astonish by universal truths."

آہ یہ میں نے کیا کیا۔ واہ یہ میں نے کیا کیا عشق میں سب پڑھا لکھا بھول گیا مجھ لا دیا جذبہ ندامت کے ساتھ اک عجیبہ ظرافت اور پھر اس کی تیر میں دانش و حکمت۔

یہ ملکہ اک ایسا مجموعہ صداقت بن گیا کہ ایک بار سن لینے کے بعد بھول نہیں سکتا۔ آہ یہ میں نے کیا کیا۔

"What a feast of reason & a flow of witty common sense is always at the disposal of his rich genius."

ہائے یہ روشنی طبع، اُف یہ بیکار نگ بُو چشم ہو س پرست نے پھر سے جواں بنا دیا بوالہوسوں پر کتنا پیارا طنز ہے۔ کچھ تو اپنی حماقت (روشنی طبع) اس پر ماحول (بلائے نگ بُو) کی کار فرمائی جس نے گویا پھر سے جواں بنا کر اک تماشا بنا دیا حقیقی شاعر کے لئے زندگی کے حقایق کیا کم ہیں کہ انھیں چھوڑ کر رومال کی طلسم بندیوں سے دل سلایا جا "When truth is sufficient to fill the mind, fancy is worse than useless; the counterfeit debases the genuine art." کا تو نہیں آرہی ہے کیا دور کٹے ماحول کی صداہ خواب نظر فرستے سر تو نہیں پھر ا دیا؟ اپنے ماحول کے طبعی اقتضا پر غور تو کرتے نہیں۔ جھوٹی تر قیوں کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ آزادی کی ہوس میں پر چھائیں گئے ساتھ دوڑتے جاتے ہیں۔ نتیجہ معلوم۔ یہ ہے ادب جدید الفاظ پرا لٹنے۔ ادب نیا۔

حسن چمک گیا تو کیا، بوئے وفا تو اڑ گئی اس نئی روشنی نے آہ دل کا کنول مجھ لا دیا نئی تہذیب کی برکت دیکھئے۔ چمک مک تو بڑھ گئی مگر دل و دماغ کا سکون اور سچی مسرت فائز۔ Family کا مزہ ہی جاتا رہا۔ جن گھروں میں وفا و محبت کا راج تھا وہاں بات بات پر بدگمانی۔ نکتہ چینی اور بغاوت ہونے لگی۔ افسوس!

ایک سے بڑھکے ایک سے واہر ملطف زندگی تھو نوش و نیش نے خوب مزہ چکھا دیا
دل زندہ ہے تو راحت کیا بچ میں بھی اک مزہ ہے۔ زندگی کے سر دو گرم کا تجربہ۔
بجائے خود اک لذت ہے جب تک نہ سہیں بچ تو راحت معلوم
حسن کی آنکھیں کھل گئیں اس میں بُرائی کیا ہوئی؟ روئے سیاہ کار سے پردہ اگراٹھا دیا
حسن کو دام فریب سے آگاہ کر دینا مقصود ہو تو ریا کاروں یا سیاہ کاروں کا پردہ
فاش کر دینا کوئی جرم تو نہیں ہے۔
جاگتے کو جگا لے کون ایسے کو گدگدائے کون؟ لیجے آگئی ہنسی، دیکھے وہ جگا دیا!
سچ محسوس تو رہے نہ تھے۔ (تنا کہتے ہی) ایسے کو گدگدائے کون؟ ہنسی آگئی۔ وہ مارا
داوڑ شتر کچھ نہ پوچھ دو ریشاب کا مزہ شہد بہشت تھا مگر دستِ بخیل کا دیا
شباب کا استعارہ شہد بہشت سے کتنا اچھوتا استعارہ ہے جس کا جواب نہ اردو
ادب میں ہے نہ فارسی میں۔ داوڑ شتر سے خطاب ہے کہ دو ریشاب کا مزہ کیا بیان کرو
لذت تو شہد کی سی اور شہد بھی کون سا؟ بہشت کا! مگر دستِ بخیل کا دیا۔ رسکتے ہاتھ
سے اک ذرا سا دیدیا۔ دینا نہ دینا برابر تھا۔ یہاں دل لگی تو یہ ہے کہ دینے والا وہی تھا
جس سے یہ گفتگو ہو رہی ہے۔ وہی داوڑ شتر وہی بخیل۔ *subtle humour*
یہاں حد کو پہنچ گیا ہے۔ سبحان اللہ۔ تازگی و قدرت کی یہ کثرت، پھر بھی ترقی پسندوں
کی حاسدانہ ذہنیت اسے پرانی شاعری کہہ کر ٹالنا چاہتی ہے۔ شرم۔
ہوتی ہو کب عاقبول حسن کی بارگاہ میں دیکھے بہشت خاک کو وقت کیا بنا دیا
حسن بہشت خاک کو وقت لے کیا بنا دیا۔ کیسی الہامی فکر ہے۔ فکر کے ساتھ
اندازِ بیان لگتا مترنم ہے۔ *Impassive diction sound & sense*

'sound & sense', fruitful invention & useless invention
make great difference."

His measures (وزن عروضی) instead of being fetters to his
sense, were always in readiness to run along with
the warmth of his rapture"

جنبہ عاشقانہ دیکھ، حکمتِ زندگانہ دیکھ جسکے لگانے میں نے خود نقشِ دوئی مٹا دیا
سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا
سر کھرا دے انسان کا ایسا خبطِ مذہب کیا

ہر زمانے میں روزِ مزہ زندگی کے تلخ تجربے ثابت کرتے رہے ہیں کہ مذہب کتنے
فسادوں کی جڑ ہے۔ مختلف اقوام میں باہمی عداوت پھیلانے والا۔ بنی آدم کو ایک
دوسرے کی نگاہ میں کافر اور کچھ ٹھہرانے والا آزادی فکر و عمل کا دشمن بھلا یہ مذہب
ہے یا خبطِ مذہب؟

عمل تو امرِ آخر ہے غضب تو یہ ہے کہ آزادی فکر، سوچنے اور سمجھنے کا حق بھی
مذہب نے چھین لیا۔ وہ یوں کہ مذہب نے اپنی اپنی کتابوں میں جس بات کو جس
طور پر بجا دیا ہے اس کے علاوہ نہ کچھ سوچو نہ سمجھو ورنہ کافر ہو جاؤ گے۔ مذہب نے
کہہ دیا کہ سودِ حرام ہے اور اس کا ہر حکم اتنا اٹل ہے کہ زمانہ کتنا ہی بدل جائے۔ دنیاوی
کار و بار کے لئے سود کتنا ہی ضروری اور مفید ٹھہرے مذہب کا حکم بدل نہیں سکتا۔

۱۵ آرٹ و مذہب کے عنوان سے ۱۹۴۴ء میں مصنف کا یہ مضمون رسالہ چمنستان دہلی
میں شائع ہو چکا ہے جس میں یہ غزل زیر بحث آگئی ہے۔

مذہب نے بنادیا کہ مقدس کتابوں میں جو کلام درج ہے وہ خدا ہی کا کلام ہے خدا کی زبان سے۔ اب اگر کوئی اس بات پر غور کرنا چاہے کہ خدا کی مادری زبان کیا ہے۔ انگریزی۔ فارسی۔ سنسکرت؟ تو اسے کچھلے پڑا گئے ہوئے سبق سے آگے بڑھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس طرح غور و فکر کرنے کا حق بھی چھین لیا گیا۔ یہ تو رہی ذہنی غلامی۔ اور انسان کے جسم کو غلام بنالینے کے تو باقاعدہ احکام موجود ہیں اور ان پر عمل بھی ہوتا رہا ہے۔ یہ بات تو خدائی مذہب کی شان سے بعید ہے۔ فکر و عمل کی آزادی انسان کا فطری حق ہے جس سے کسی کو محروم نہ کرنا چاہئے۔ مگر انسانیت جب تک زندہ ہے کچھلے سبق سے آگے بڑھنے کی کوشش ہوتی ہی رہے گی۔

انسانیت ہی وہ برکت ہے جو مختلف اقوام میں موانست پیدا کر کے بنی آدم کی زندگی کی رفتار کو ہموار و خوشگوار بناتی ہے۔ مذہب خدا عتدال سے بڑھ کر تمام بنی آدم کو کافر سمجھ کر اون کا خون حلال ٹھہرا لے تو یہ مذہب ہے یا ضبط مذہب؟

ملہ بھرا دے انسان کا ایسا ضبط مذہب کیا؟
مذہب کے مقابلہ میں آرٹ پر نظر کیجئے کہ اس نے خاموشی کے ساتھ کشت و خون کے بغیر بنی نوع انسان میں کتنی موانست پیدا کی ہے۔ آرٹ کوئی سا ہوا موسیقی ہو یا شاعری تمام انسانوں میں خواہ وہ مذہبی۔ سیاسی۔ قومی نقطہ نظر سے کتنی ہی مغایرت رکھتے ہوں اور اتفاق سے کسی وقت یکجا ہو جائیں تو کم از کم ذوق و وجدانی اعتبار سے ان میں ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ موسیقی خواہ کسی ملک کی ہو سچی اور مکمل ہے تو سامعین پر اپنا اثر کر کے رہے گی۔ شاعری میں بھی یہی کشت ہے خواہ وہ کسی زبان کی ہو شاعری اگر حقیقی اور مکمل ہے تو مختلف افراد سامعین میں ایک احساس مشترک اک

لذت مشترک کی لہر دوڑا کر ہم آہنگی پیدا کر دیتی ہے۔ ان میں پہلے سے کوئی بیگانگی یا عداوت بھی ہو تو شعر کے اثر سے دفع ہو کر محبت و موانست سے بدلجاتی ہے۔ چند آدمی جب ایک دوسرے کے ہم خیال ہم مذاق ثابت ہوتے ہیں تو اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے کے دل سے نزدیک ہو جاتے ہیں خواہ مذہب انھیں کتنا ہی الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کرے۔

آرٹ کی کیشش فقط زندوں ہی میں موانست نہیں پیدا کرتی بلکہ مردوں سے ارادت و محبت کا رشتہ قائم کر دیتی ہے۔ اکبر جہانگیر شاہجہاں میں فنون لطیفہ کا اعلیٰ مذاق پاکر ان سے محبت و موانست ہو جانا اک فطری امر ہے۔ برخلاف اس کے فنون لطیفہ سے اورنگ زیب کی نفرت دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ مذہب ان کا مذاق خراب کر دیا تھا۔ اس معیار پر نگاہ آرٹ کو جان کر دیکھئے اس کی افادیت کیا ہو؟ رنگ لاتی ہو آخر ایک جنبش لب کیا دیکھئے دکھاتا ہے وعدہ مذہب کیا؟ شرک امید افزا منظر جنبش لب (اک امید دار کی ذہنی کیفیت) امید و انتظار کا آئینہ ہے جس میں ہر امید وار کو اپنی صورت نظر آتی ہے۔ وہ کیفیت جو اک وعدہ مذہب سے پیدا ہو جاتی ہے وہ وعدہ مذہب جو صاحب کی ایک جنبش لب ثابت ہو جاتا ہو سب جہاد ہیں دیکھ سب دہیں دیکھئے بیداروں کا مطلب کیا اور ترک مطلب کیا؟ یہاں جہاد سے شاعر کا مطلب مذہبی جنگ نہیں ہے بلکہ جد و جہد کوشش و کاوش مقصود ہے یہاں فساد سے مراد ہے قدرت کی بخشی ہوئی وہ تخریبی قوت جو دیانت و عدالت کے ساتھ کام میں لائی جائے تو تعمیر کا حکم رکھتی ہے۔ کیونکہ

بنانا اور بگاڑنا خود فطرت کی عادت میں داخل ہے۔ بشر میں جو قوت خیر و شر و ولایت ہوئی ہے دونوں میں سے کوئی بیکار تو ہے نہیں۔ البتہ ان کے برتن میں عدل و اعتدال واجب ہے۔ نظام قدرت کی طرف سے مجھے پھر کر دینا سے بے نیاز ہو جانا قدرت کے بخشے ہوئے دل و دماغ کو بیکار کر کے دلی اختیار کر لینا کوئی فضیلت نہیں ہے کفران نعمت ہے منشاء فطرت کے خلاف ہے۔ آرٹ کا درس عمل بلا اختیار نسل و مذہب تمام مردان عمل کو ہموار بنا لیتا ہے۔ یہ ہے اسکی افادیت۔

ہوئے گا سجدہ بھی جب کیسی یاد آئی یاد جلتے کب آئے ہر زندہ داری شب کیا؟
شب زندہ داری، رات بھر نمازیں پڑھتے رہنا منہ سے فقط کچھ بول ادا کر لینا اور معنی کچھ نہ سمجھنا، اک مشغلہ تو ہے مگر یہ انھیں حضرات سے ممکن ہے جو انسانی ذمہ داریوں سے غافل یا بے پروا ہوں۔ دنیاوی نظام میں شریک ہو کر جنھیں مصروف کار رہنا پڑتا ہو ان سے مشغلہ شب زندہ داری کیونکر ممکن ہے اور ممکن بھی ہو تو رات بھر جاگتے رہنا قانون قدرت کے خلاف ہے۔ یاد خدا اک وجدانی کیفیت ہے جو کسی کی اختیاری بات نہیں ہے۔ نہ جالتے کب خدا یاد آجائے۔ اک معمولی سا مشاہدہ وجدان میں تلاطم برپا کر دیتا ہے جو سجدہ پنجگانہ یا شب بیداری سے نصیب نہیں ہوتا اور ہو جاتا ہو تو یوں

آپ کیا جانیں مجھ پہ کیا گزری؟
حسن ابتک ہو خواب غفلت میں
دیکھئے ڈاڑا کہاں سے کہاں؟
حسن کیا حسن کی تجلی کیا؟
مجدد دیکھ کر گلوں کا نکھار
دیکھئے کس ہوا سے ہو بیدار؟
نشہ رنگ بوئے رنگارنگ
رنگ لایا ہے جلوہ بزینک
(جل جلالہ)
(الست اکبر)

اس طرح حیات کائنات کا شاہدہ اک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے مگر یہ کیفیت زیادہ دیر تک ٹھہرنے والی چیز نہیں۔ نہ اس کیفیت کا پیدا کر لینا اپنے اختیار میں ہے نہ اس کا قائم رکھنا۔ مذہب کی زبان میں جسے وحی و الہام وغیرہ کہتے ہیں وہ بھی مغیبول کی اختیاری چیز نہیں ہے۔ الغرض شب زندہ داریوں کی ناصیہ ساری ایک طرف اور ارباب ذوق و ارباب نظر کا ایک سجدہ تہ دل ایک طرف۔ مسجد دیکھ کر گلوں کا نکھار، بعض اوقات ایسے واردات و مشاہدات کا سامنا ہو جاتا ہے کہ دل بے اختیار سجدے میں جھک جاتا ہے اور یہی ہے سچی عبادت جو اپنے نفس کی بات نہیں سچی عبادت کی یہ وجدانی حقیقت ہر مذہب والوں کو یکساں متاثر کرتی ہے اور یہی کام ہے آرٹ کا کہ تمام انسانوں کے احساسات میں ہم آہنگی پیدا کر کے وجدانی اعتبار سے انھیں متحد کر دیتا ہے۔

یہ بھری جوانی کیا جذبہ لبالب کیا
چلو بھر میں متوالی دوہی گھونٹ میں خالی
شعر اک عام مشاہدے پر مبنی ہے مگر کتنا دردناک مشاہدہ ہے نفسانی بھوت کے پائے پر کر کسی کیسی چڑھتی جوانیاں دیکھتے ہی دیکھتے اتر جاتی ہیں۔ شباب کا چھلکتا ہوا پیانہ دوہی گھونٹ میں خالی ہو جاتا ہے۔ تنگ ظرفی و بے اعتدالی کی تصویر کس قدر عبرت ناک ہے۔ یہی ہوئی ذہنیوں کو غیرت دلا کر راہ پر لانے بگڑی ہوئی زندگیوں کو سوار نے میں شاعر کا آرٹ جہاد و فساد کے بغیر کامیاب ہو جاتا ہے۔

کسی دل شکستہ کی طرف ہمدردانہ نظر سے دیکھ لینا یا کسی محبوب کو ذرا سا سہارا دے دینا تو اپنے بس کی بات ہے۔ کیا یہ عبادت سے کم ہے؟

ہاں دعائیں لیتا جا، گالیاں بھی دیتا جا تازگی تو کچھ ہو نیچے چاہتا ہوں لب کیا
یہ ہے رفیقاہوں کی علی ظری ماں کے حوصلہ صبر و تحمل، اُن کے جذباتی تار کی
تصویر کہ انسان کی صلاح و فلاح کی خاطر اپنی زندگی بچہ دیتے ہیں طرح طرح کی قربانیاں
کرتے ہیں بلور ان سب کے عوض گالیاں سنتے ہیں اور دعائیں دیتے جاتے ہیں۔ ان
ناروا گالیوں پر بے مزہ نہیں ہوتے بلکہ اک طرح کی تازگی محسوس کرتے ہیں رع
انچہ از دوست میر سدنیکوست۔ سر سید علیہ الرحمۃ کی سرگزشت تو معلوم ہی ہے کہ
انھوں نے قوم کے لئے کیا کچھ کیا اور قوم نے اُن کے ساتھ؟
شامت آگئی آخر کہہ گیا خدا لگتی راستی کا پھل پاتا بندہ مقرب کیا
بارگاہ خداوندی کا سب سے بڑا فرشتہ (معلم الملکوت) کھری بات کہہ کر
راندہ درگاہ ہو گیا آخر شیطان نے یہی تو کہا تھا کہ جس سرگرمی نے تیری حضور
میں جھکا یا اسے آدم خلکی کے سامنے کیونکر جھکاؤں؟ کتنا اعلیٰ کتنا فخر صانع خدیہ
عبودیت تھا؟ مگر خدا صاحب اس جذبہ عبودیت کی قدر تو کیا کرنے لٹی راج ہٹ
پر اتر گئے کہ تو نے نافرمانی ڈسپن کی خلاف ورزی کیوں کی؟ جب عالم بالا کی
قدردانی کا یہ حال ہے تو پھر امیروں کے درباروں میں راست گوئی کا پھل کوئی کیا
پائے گا؟ زمانہ جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے روزمرہ کے معمولات میں جھوٹ اور
سج کا امتزاج خاص تناسب کے ساتھ جائز ہی نہیں ضروری ٹھہرتا جاتا ہے۔
یہ ہے وہ تعمیر آرٹ جس سے انسانی زندگی کے لئے راہ عمل نکلتی ہے کس حال
میں کونسا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔
الٹی سیدھی ستارہ۔ اپنی کہہ تو الٹی کہہ
سادہ ہو تو کیا جانے بھانپنے کا ہڈ دھب کیا

یہ ہے زین اصول زندگی خصوصاً اُن بے چاروں کے لئے جنہیں امیروں کی
دربار داری کرنی پڑتی ہے۔ ایسے ماحول میں دانشمندی کا مقتضایہ ہی ہے کہ سب کی
سنوائی کچھ نہ کہو اور کچھ کہنا ہی پڑے تو الٹی کہو۔ پر ایسا دل ٹٹولنے انداز مزاج بھانپنے
کا بہترین گریہ ہی ہے کہ الٹی کہہ کر فشا و دریافت کر لو بات کی تیز کو پہنچ کر کام کرو۔
کھری کھری کہہ کر آفت میں پڑنا کیا ضرور؟
اندھیان کیس کیونکر نہ لرز لئے تھیں کیونکر کارگاہ فطرت میں پاسبانی رب کیا
آفات ارضی و سماوی تو ہلکہ ڈالتی ہی رہتی ہیں مگر یہ خاک کا پتلا جسے انسان کہتے
ہیں ترقی کرتے کرتے دنیا کو بند کمان خدا کے لئے جہنم بنا دیتا ہے۔ مذہبی کتابوں میں جہنم
کے جو تصورات پیش کئے گئے ہیں سائنس نے انھیں مجسم کر دکھایا۔ مگر وہی خدا جو رحیم و
کریم کہا جاتا ہے دنیا کی تباہی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اُس سے مس نہیں ہوتا۔ ذرا
اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو اور غور کرو کہ بنگال والے جو بھوک کے مارے لالگوں کی
تعداد میں مر رہے ہیں ایسے خدا کو کیا عادت ہے ہوں گے سچ ہے کارگاہ فطرت میں
پاسبانی رب کیا۔ جوش خلائق کیا خوب چھیلی ہے نہ
فاتوں کے شرکار میں کروروں بندہ اللہ کی یہ وعدہ خدائی افسوس!
میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ
آئی کوٹال دسے جی جانیں دم بخود ہے تو پھر خدا کیا ہے
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے کھیل بندے کا ہو خدا کیا ہے
مذہب کی زبان سے جس خدا کی تعریفیں ہم سنتے آئے ہیں وہ کیا ہے؟ انسان
کا تو بنایا ہوا ہے۔ ہر زمانہ میں انسان اپنی فکر اپنی ذہنیت اپنی ضرورت کے

مطابق نیت سے خدایتا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا کوئی کام بے عیب نہیں ہوتا۔
جی بھی تو اپنا بنایا ہوا خدا اپنی مصیبتوں میں ساتھ نہیں دیتا۔ دُور سے جنگ غزیریزی
فائدہ کشی و خود کشی کا تماشا دیکھتا رہتا ہے۔

کارِ مرگ کے دن کا ہتھوڑی دیر کا جھکڑا دیکھنا ہے یہ نادان جینے کا ہو کر تب کیا
جذبہ لوالو العزنی اور موت کا خیال، یہ دونوں باتیں یکجا نہیں ہوں۔ مردانِ عمل
موت کو تھارت کی نگاہ سے دیکھ کر مجھ پھیر لیتے ہیں ۵

فسکرِ امروز نہ اندیشہ فردا کی خلش زندگی اس کی جسے موت کا دن یاد نہیں
موت کا خیال پیش نظر رہے تو پھر کبھی بزرگ کا انجام پانا تو کجا خود زندگی اجیرن
ہو جائے۔ زندہ وہی ہے جسے موت کا خیال آئے بھی تو جھکڑا دے۔ زندگی و موت
کی کشمکش گھڑی دو گھڑی کا معاملہ ہے پھر ایسی بات پر کیوں توجہ کی جائے جس سے
جذبہ عمل کھٹکنا پڑ جائے۔ البتہ زندہ رہنا زندگی بھر کا سوال ہے۔ اس کی دشواریوں پر
غور کرتے رہنا آگ قدرتی فرض ہے۔ روزِ مرہ کے عملی تجربے سے یہ بات سمجھیں آئے
لگتی ہے کہ زندہ رہنے کے لئے اک ڈھب چاہیئے۔ یہ بھی اک کرتب ہے اک ہنر ہے۔
اس ہنر کو حاصل کرنا مقصدِ آفرینش کو پورا کرنا ہے۔ ذرا یہ تو سوچو کہ زندہ رہنے کا ہنر
سیکھنا اچھا ہے کہ فانی خان کی طرح موت کے فلسفہ پر دماغ سوزی کرتے کرتے
جیتے جی مرجاتا؟ زندہ رہنے کے لئے جس قدر جہاد و فساد کرنا پڑتا ہے، یہ جہاد و فساد
اچھا کہ موت کا خیال تو قبل از وقت مردہ بنا دیتا ہے؟ یہ ہے آرٹسکی وہ حقیقت نگاری
جو کالمے گورے سب کو بچال دھنوا بنا لیتی ہے۔

پڑ چکے بہت پالے دس چکے بہت کالے موزیوں کے موزی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا

یہاں میرزا صاحب نے اپنے کھمکٹر کی تصویر کھینچ کر بٹے ٹپے اولوالعزموں کی
پُر آشوب زندگیوں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ صبح تو یہ ہے کہ مسند و کی
برابری کوئی نہیں کر سکتا چاہے کتنی ہی کوشش کرے عجیب غریب شعر کہا ہو زندہ باد
میرزا بیگانہ واہ زندہ باد زندہ باد اک بلا کبیر مال جب تم کیا کھا اور اب کیا

سجدہ صبح و شام کیا کرتا

غائبانہ سلام کیا کرتا

سجدہ صبح و شام کتنا پامال مضمون ہے۔ مگر اک مسند و کی فکر نے
اتنا پیش پا افتادہ بات کو ”غائبانہ سلام“ کی اچھوتی ترکیب سے کتنا تازہ کر دیا۔
ہے عبادت کا سچا فلسفہ کہ جب تک کیفیتِ حضوری حاصل نہ ہو سجدہ و سلام
الحاصل مشاہدہ۔ مطالعہ اور غور و فکر کی عادت ڈالنا ہی عبادت ہے۔ جھوٹی نماز
اس کام کی؟

بندہ بے امام کیا کرتا

دہن بے لکام کیا کرتا

وہ پیام و سلام کیا کرتا

جسے چاہا بنا لیا دیوتا

نہ چلی کچھ تو بد دعا ہی یہی

ہو نہ سمجھے خود اپنا مطلب سون

کتنے معصومانہ احساس ہیں کہ بیان میں نہیں آسکتے۔ اپنا مطلب خود اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔ انسان کی وہ حالت کس قدر قابلِ رحم ہے کہ کچھ بنائے نہیں بنتی تو دعایا بد دعا پرا ترا آتا ہے۔

دقت جس کا کٹے حینوں میں کوئی مردانہ کام کیا کرتا
اُن نو جوانوں کو غیرت پکڑنی چاہیے جن کی رفتارِ گفتار، کردار، تحریر، تقریر، شاعری اور افسانہ نگاری سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سوتے جاگتے عورت اُن کے سر پر سوار ہے۔ بھلا ایسے زن پرستوں سے کوئی مردانہ کام کیا ہوگا۔
جس کی تلوار کا ہولو ہا تیز جھٹکا نہ تھا۔ تمام جھگڑوں کا فیصلہ تلوار سے ہوتا ہے۔
جس کی تلوار میں دم ہے وہ جھٹ نہیں کرتا کھڑے کھڑے جھگڑا چکا دیتا ہے۔
He speaks under the influence of those general passions by which all minds are agitated."

ارے کیسی سزا کہاں کی جزا؟ ہچکچاتا تر کام کیا کرتا؟
کام کرنے والوں کو کام سے مطلب ہوتا ہے۔ سزا و جزا کی پروا نہیں ہوتی۔
غالب شکستہ فرض تھی۔ ادا ہو گئے اس فرض سے۔ حاصل ہو گیا جو مقصد تھا۔ بہکی ہوئی ذہنیں راہ پر آگئیں۔ اب رہا خمیازہ تو اس کے لئے پہلے ہی سے تیار ہو چکا تھا۔
مجھ سے معنی شناس پر جادو حسن صورت حرام کیا کرتا
سناٹے والے مڑتی چڑیا کے پر گن بیٹے ہیں۔ ایسے معنی شناسوں پر فریبِ حسن کیا چلے گا؟ حسن میں سادگی نہ رہی، بھولا پن نہ رہا کائیاں پن آ گیا۔ تو پھر کھرا

نہ رہا بھوٹا ہو گیا۔ اسی کو کہتے ہیں صورتِ حرام۔
ایسے ہنگاموں میں ایک اللہ کا نام کیا کرتا
پر پیغمبر پادری پوپ اپنی اپنی سی کر گزرے مگر اللہ کے نام سے کچھ کام نہ چلا۔
وہی فتنہ و فساد جو آگے تھا سوا اب بھی ہے۔

"He was a hero; heroic in what he said or did."

قطعہ

بندہ خاص پر مامولا نگر فیض عام کیا کرتا
یہ مساوات تحفہ کرنا چیز وہ یگانہ کے نام کیا کرتا
ایسے جنس کے آگے مساوات کا ذکر بے معنی ہے۔ قدرت نے
کہیں مساوات نہیں رکھی۔

محبت نے ایمان کھویا تو کیا پشیمانیوں میں ڈبویا تو کیا
حرارت ہو دلی بھی تک نہیں زلزلے نے اتنا سمویا تو کیا
سچی لکھن زمانہ کے گرم و سرد کو بھاتی ہے؟ طبعی حرارت کبھی ماحول پر بھی
غالب آجاتی ہے۔
He makes Nature predominate over accidents."

بنی ہے دی موجِ تختِ رواں مجھے نا خدا نے ڈبویا تو کیا
فطرتِ اولوالعزموں کا ساتھ دیا کرتی ہے بعض اوقات طوفان میں پڑ کر بھی

لہ دنیاے ادب میں اس طنز یہ شاہکار کا جواب ہی نہیں۔

The fertility of his mind gives novelty to familiar things. - دماغ کے زرخیز ہونے آگیا۔

یہاں لے گیا گھر بھی ایر کر ماس جو بویا تو کیا اور نہ بویا تو کیا
 پہلے تو یہ سمجھا تھا کہ فلاں فلاں کھیت اُفتادہ رہے۔ تردد میں کی راہ گئی۔
 مگر فطرت کی ستم ظریفی دیکھے کہ جو کھیت بویا گیا تھا۔ ایر کر ماس سے بہا لے گیا۔ اور
 اس کے ساتھ گھر بھی۔ بھلا اس احسان بے حاصل اس رحمت بے معنی سے فائدہ؟
 تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ!

نہ بندہ بعد یزید نہ حدہ !
 سرِ نرم پیا سے ہی مر جائیے
 کہ تلچٹ سے دامن بھگوا تو گیا
 نیت نہ بھری تو جھوٹ موٹ کا گناہ کیا
 صورتِ شہیدِ خدیجہ ناکامی ہے ؟
 نہا لیتے گنا بکھٹا تھا پاک
 گناہوں کو نرم زم سے دھویا تو گیا
 شعرا تو ان کو کھاتا سنا سنا
 کہ ضرب المثل کی حد کو پیو پرخ گیا۔

The essence of poetry is invention which produces an expected surprise or delight."

تمہیں بھی مزہ اسکا چکھنا پڑا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ تمہیں اس سے کھوینا تو کیا

مثبت

نا خداے کم ہمت ہاتھ پاؤں مار آیا
تیرے کی کیا خبر لاتا وصلہ بھی مار آیا

"He approximates the remote. انسان بال بال پرچ ٹکلتا ہے
and familiarises the wonderful."

امانت میں تیری خیانت نہ کی
اچھا سوال ہے جس نے شعر کو ضرب المثل بنا دیا۔ اس کہتے ہیں (مضمون)
نہ میں وہ رہا اور نہ تو وہ رہا
یہاں کیا دھڑا جو ہاتھ آئیگا
مثل مشہور ہے دزدان خانہ مفلس خجل آید بیرون۔

"A happy combination of sense & sound."

تہ دل سے ہو کچھ تو اک بات ہے ہنس میں تو کیا اور رو یا تو کیا
ہندوستان میں جھوٹی ہنسی ہنسنے کا بھی اک فیشن نکلا ہے۔ شاید اس سے کچھ
جھوٹی تسلی ہو جاتی ہو مگر ہنسنا یا روننا جب تک نیچرل نہ ہو کس کام کا؟ پیٹ
میں جب تک درد نہ ہو نیچے ہنسنا تو کجارونا بھی نہیں آتا۔

کہاں اُر گئی وہ جوانی کی نیند
اُچھٹی سی اک نیند سو یا تو کیا
کام اور آرام دونوں کا فزہ جوانی میں ہے
شعرِ ضرب المثل کی حد کو پہنچ گیا۔
چشم کیوں نہ ہو جگمانے کی آنکھ؟
کہ عینک سے دھاگا پرو یا تو کیا
اُس بچہ کی حالت کتنی قابلِ رحم ہے
جسے سوئی میں دھاگا پرو نے کسے لئے
آنکھیں اُدھار بانگنی پریں۔ عینک لگانا پڑے۔
اس جھنجھلا ہٹ میں اگر کہتا ہے
کہ ایسی آنکھیں چشم کیوں نہ ہو جائیں۔
بھوٹ کیوں نہ جائیں کہ جھگڑا ہی پاک
ہو جائے۔ پرو یا جیسے ٹھٹھ قلعے سے
اتنا شدید اور تلخ جذبہ شعر کے سانچے میں

کشتی جیات اپنی جا رہی تھی ہمارے پر
سنگ دل تماشائی ہنستے تھے کنارے پر
دل وہی شکستہ دل چہرے روئے کار آیا

نہلنے کا وہ دھارا، سنگ دل تماشائیوں کی وہ شہادت ایک طرف اور ایک ٹوٹے
ہوئے دل کا عزم و استقلال ایک طرف، شاعر نے کوئی درس دینے کی کوشش
نہیں کی ہے، ایک شخصی زندگی کے تلاطم کا نقشہ پیش کر دیا ہے جس سے بالواسطہ دیکھنے
والوں کو سبق مل جاتا ہے۔ اس اجمالی مختصر نگاری کی وسعت دیکھئے کیسے کیسے تاریخی
واقعات پر محیط ہے۔ ترکوں کا بیڑا غرق ہو رہا تھا یورپ تماشا دیکھ رہا تھا کہ ایک
شکستہ خوردہ دل یعنی مصطفیٰ کمال پاشا کے عزم و استقلال نے وہ کمال دکھایا جسے
اس زمانے کا معجزہ کہنے کو کچھ بچا نہیں۔

"He does not preach; his ways of art are suggestions
and implications."

خانہ خدا معلوم۔ شیخ درہمن جھوٹے
اس طلسم حیرت سے کب اسیر غم چھوٹے؟
پائے مضطرب ٹوٹے جب کہیں قرار آیا

دروغ کو کتنا فرغ ہوتا ہے۔ اسے شیخ درہمن سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ ذہنیت
کو اپنا تاراج کر لینے اپنی راہ پر چلانے کے لئے خدا کے نام پر کیا جھوٹ بولتے رہتے
ہیں۔ مگر خدا کسی کو ہاتھ نہ آیا۔ آخر سب تھک کر بیٹھ گئے۔

شام سے بھڑک اٹھی اور بھی لگی دلی
یاس امید فردا نے واہ کیا تسلی دی؟
مضطرب نگاہوں کو حکم انتظار آیا

یہ بے رحمی تو دیکھو بے قراروں کو تسلی بھی دی گئی تو یوں کہ کل تک انتظار کرو۔ اس

حکم انتظار کا اثر یہ ہوا کہ دل کی لگی اور بھڑک اٹھی۔

بڑا کیا ہے لگی میں اپنی حد سے دور ہو جانا
لیٹ کر شمع سے آخر سر پایا نور ہو جانا
شوق وصال میں، دل کی لگی میں اپنی ہمتی کو مٹا کر نور ہی نور ہو جانا۔ خوشا انجام

یہی نشانے فطرت تھا!
دکھائی جلوہ موہوم نے کیا برق رفتاری؟
ایک جھپکاتے ہی حد نظر سے دور ہو جانا!
فریب امید یا فریب نظر کی کرشمہ سازی دیکھئے گا۔

"Vain shadow which doth vanquish quite

Both at full noon & perfect night."

بسی ہے نہج ت آوارہ کن نازک مانگو نہیں
مبارک ہستی برباد پر مغرور ہو جانا
اہل کمال اپنی ہستی کو مٹا دینے کے بعد ہی دلوں میں گھر کرتے ہیں۔ بڑے بڑے
نازک دامنِ نجات باب جو کل تک انھیں دھیان میں نہ لاتے تھے آج ان کے کٹنا کمال
پرورد کرتے ہیں۔ ان کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ ایسے اہل کمال کیوں نہ اپنی بربادی پر فخر کریں۔

"His reputation was making its way secretly
in spite of all drawbacks."

حرارہ لاچکا تھا حُسن کہیے خیریت گزری
مجھے ٹھنڈا سمجھ کر جوش کا کافور ہو جانا
حُسن حرارہ لاچکا تھا یعنی آتش حُسن بھونک ڈالنا چاہتی تھی مگر یہ دیکھ کر کہ اس
میں تو کچھ جان ہی نہیں، بالکل ٹھنڈی مٹی کا بنا ہوا ہے سارا جوش کافور ہو گیا۔ چلو
خیر گزری۔ جان بچی۔

ہو اے پیر میں کا کوئی جھونکا لے اڑا شاید مبارک ہو مبارک بے پیے تھوڑا جانا
اُردو زبان میں لفظ "تھوڑا" لغات اعداد کا حکم رکھتا ہے "نشہ کے معنی میں بھی
بولا جاتا ہے۔ ہوا اے پیر میں کا کوئی جھونکا لے اڑا بے پیے نشہ سا چڑھ گیا پیر میں
عروسی کی رنگ دبو۔ اے صل علی۔

فلک کے اسی کروٹ کی تکرار کا ہو گیا ظالم قیامت ہے چراغِ حُسن کا بے نور ہو جانا
ذوالِ حُسن پر شاید ہی کسی نے اس طرح جلے دل کے پھوپھو لے پھوڑے ہوں گے۔
کس غضب کا طعن ہے آخر ظالم کو یہ دن بھی دیکھنا پڑا۔ فلک نے اسی کروٹ کی کہ
سویرا ہو گیا۔ حُسن پر آخر ذوالِ آہی گیا۔ یہ ہے ٹھٹھکا اُردو کا زور شور۔ یہاں یہ زور شور ہی
کلام کا حُسن ہے غلط سمجھا جن لوگوں نے یہ سمجھا کہ غزل کی زبان میں زری نرغی
ہو گئی نہ ہو۔ "He seems to have due sense to rate his own performances by their just value. There are beauties in his verses which common authors may justly think not only above their attainments, but above their ambition."

دلِ نا محرم فردا خدا کی مار ہو تجھ پر ابھی سے نشہ حُسنِ عمل میں چور ہو جانا
دلِ نا محرم فردا۔ نشہ حُسنِ عمل۔ سچ تو یہ ہے کہ سلف سے آج تک ایسی آواز کاں میں
نہیں آئی۔ ا جی حُسنِ عمل تو جب سمجھا جائے گا کہ انجام بھی بخیر ہو۔ ابھی سے حُسنِ عمل کے
نیشے میں چور اُمید باندھے بیٹھے ہو؟ اور مگر سے حُسنِ قبول عطا ہو جب جانیں۔
علی کا بندہ ہو کر بندگی کی آبرورکھ لی یگانہ کے لے کیا دُور تھا منصوبہ ہو جانا

منصور کا مضمون کتنا پا مال تھا۔ مگر فکر رسائے اس قافیہ کو کتنی بلندی پر پہنچا دیا۔
منصور کی طرح خدا کی کا دعویٰ کر بیٹھنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ البتہ حق کو پہچان کر بندگی
کا حق ادا کرنا بڑی فضیلت ہے۔ علی کا مرتبہ جو ہے سو ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جس نے
بندگی کی آبرورکھ لی وہ کس مرتبہ کا انسان ہے؟

رباعی

دونوں دیوانے ہیں علی کے طالب جان ایک ہے گوجہ جدا ہیں قالب
نذہب من شاعری میں قومیت میں غالب ہیں یگانہ اور یگانہ غالب

اپنی ہستی میں بھی کچھ شک آ پڑا علم کا سودا بڑا مہنگا پڑا
بہت گہرے پانی میں گئے تو پھر اپنا بھی پتا نہ رہا۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔
"Great thoughts are always general - that comprehension & expansion of thought which at once fills the whole mind & of which the first effect is sudden astonishment & the second rational admiration."

آپ سے باہر چلے ہو دھونڈنے آہ پہلا ہی قدم جھوٹا پڑا
یہ ہے فلسفہ خودی۔ یہ ہے سچا جذبہ خود شناسی، ذات میں اپنی کیا نہیں موجود؟
مگر اسوس پہلا ہی قدم غلط پڑا۔ بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔
یہ تو سمجھو خفتہ کیا پیدا کیا ہوش پر جب دہم کا سایہ پڑا
وہ جلالِ میرزائی کیا ہوا آگ ہو کر خاک سے دبنا پڑا

لہ گئی وہ بسندگی بچا رگی
قد ہوا اتنا بڑا تو کیا ہوا ؟
مباہڑا۔ یعنی کھسک گیا۔ نو فٹے نواب دیکھنے میں تو ایسے لمبے ترنگے دانڈے
مگر وقت پڑا تو کھسک گئے۔ کون دیتا ہے ساتھ مردوں کا ؟
راستبازی کی پونیا کے ساتھ ؟ کیوں ٹھم کھائی تھی کیوں مارا پڑا
قول قسم کی پابندی اور راست بازی کس کے ساتھ ؟ دنیا کے ساتھ۔ ایسے
سادہ لوحوں پر خدا رحم کرے۔ یہ ہیں زندگی کے تلخ تجربے !
زندہ رکھا ہو سکتے کے لئے ! واہ اچھے دوست سے پالا پڑا
اس شدت طنز کا کیا ٹھکانا ہے۔ کتنی ظالمانہ سیاست ہے کہ سسکا سسکا
مارنے کے لئے زندہ رکھا ہے۔

آج ہی حق سے ادا ہو جائیے
یہ ہے زندگی کی شاعری۔ یہ ہے زندگی کا دستور العمل۔ آج ہی حق سے ادا ہو جائیے
اب ہوا رنگ نصف دیدنی
روح پر جب جہم کا پردا پڑا
فکر دنیا میں ہے دن بھر خراب
شب ہوئی آنکھوں پر پھر پردا پڑا
واہ کتنے ہی یگانہ کی غزل
اپنی بیگانے کو بھی چسکا پڑا
"We are led to imitate what we believe true."

کہ ہر چلا ہے اور ہر ایک بات بتا جا
گر جینے والے گرجا ہے کیا برستا جا
یہ ہے یگانہ کا زور دشور ناقابل تقلید۔ سواری تو جا رہی ہے کس دھوم دھام ؟

مگر غریبوں کو بھی کچھ فیض پہنچے جب جانیں۔
رلا رلا گئے غریبوں کو منہں چپکا کل تنک
مری طرف سے اپنی دسایہ بتا جا
کل تنک تلخ و سخت کے مالک تھے۔ غریبوں کے ساتھ جو سلوک کیا سو کیا۔ آج
جلا وطن کے جا رہے ہو یہ ہے شعر کا پس منظر، اب میں تم پر کیا ہنسوں۔ تم خود
میری طرف سے اپنی دسایہ پر اپنے حال زار پر ہنستے چلے جاؤ ٹھنڈے ٹھنڈے !
دکھا دے خاک کے پتلون میں زور کتنا ہے ؟ ہوا پر تیر چکا اب زمیں میں دھنستا جا
فلک نور دوں سے خطاب ہے کہ آسمان کو تو اپنا زور دکھا چکے۔ پر لگا کر اتنی
دور جا ہوئے۔ اب اوندھے منہ گرے ہو۔ زمین کو بھی اپنا زور دکھا دو کہا تنک
دھنستے ہو۔ کیا کہنے ہیں اس طنز کے کیوں نہ ہو میزرا یگانہ طنز بات کے امام ہیں
علاج اہل حسد، زہر خند مردانہ
ہنسی ہنسی میں تو ان احمقوں کو دستا جا
ہنستے ہنستے مار ڈالو۔ حاسدوں کا علاج یہی ہے۔ لفظ زہر خند سے قافیہ
اردوستان کا معنوی پہلو کتنا روشن ہو گیا۔ ایسے ٹھیکہ قافے سے نفسیات کا
اک ذریعہ اصول بیان کر دینا یگانہ ہی کا کام تھا۔

"Sometimes the malignity of one is defeated by
the frolic of another."

بقدر ذوق تماشاے حسن ناممکن
ترسے میں بھی ہر اک کیفیت ترستا جا
حسن و عشق یگانہ کا موضوع نہیں۔ مگر جب کہتے ہیں تو ایسا کہ شکر دیر تنک
دل قابو میں نہیں رہتا۔ ترسے میں بھی ہے اک کیفیت۔ سبحان اللہ۔

"What he writes is of the most animated nature."

No man of a true poetical spirit is master of himself while he reads him."

جفائے نیم خونخوار سے جو بس نہ چلے تو بن کے خشک نوالہ گلے میں پھنستا جا
واہ کیا منجھا ہوا ہاتھ مارا ہے۔ یہ ہے یگانہ کا وہ مخصوص ذاتی جوہر وہ کس بل
جس کی نقل اتارنا ناممکن۔ زندہ رہنے کی آخر دم تک کوشش کرنے کا کتنا سچا
گر نبا دیا ہے کہ کوئی کمزور پنجہ ظلم سے سلامت نکل نہ سکے تو کلامِ زک ظالم کو بھی مرتے
مرتے لے مرے خشک نوالہ بن کر گلے میں اٹک جائے عجیب غریب شعر ہے کہ سننے والا
سے ہی کھل کھلا پڑتا ہے۔ کس بات کی داد دی جائے۔

مزاج لطیف (subtle humour) یا زندہ رہنے کے کرتب کی؟
A system of civil & social prudence may be collected from his works."

تو آپ اپنی ہنر شیر آپ اپنی سپر یگانہ باگ اٹھا اپنے بل پہ کستا جا
یگانہ نے اپنی علی زندگی سے ثابت کر دکھایا۔ تنہا اپنے بل بوتے پر اپنا نئے زمانہ سے
لڑتے رہے اور کبھی ادبی میدان میں شکست نہیں کھائی۔ زندہ باد

پالا امید و بیم سے ناکاہ پڑ گیا دل کا بنا بنا یا گھر وندا بگر گیا
اس زمین میں یہ مطلع یادگار رہے گا۔ یاروں نے بہت زور مارا مگر نقل اتار نہ سکے
الٹی تھی مت زمانہ مردہ پرست کی میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گر گیا
مردہ پرستوں کی الٹی مت کا اک علاج یہ بھی ہے کہ اون کی طرف سے منہ موڑ لیا جائے

شریت کا گھونٹ جاں کے بیتا ہوں خون دل غم کھاتے کھاتے کاغذ تک بگر گیا
یہ بڑے ظرف کا کام ہے اس طرح غم کھانا کہ چشم دایرہ سے تلخی کا اظہار نہ ہونے پائے
بوائے وفا کہاں چین روزگار میں دل ہٹ گیا ہر جیسے کوئی پھول جھڑ گیا
جذبہ نفرت کو اس طرح مجسم کر دکھایا ہے جیسے شاعر سے کوئی پھول جھڑ گیا
کتنی اچھوتی تشبیہ ہے۔ یہ تشبیہ محض fancy کے لئے نہیں ہے
بلکہ ذہنی کیفیت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ جب تک کوئی مقصد ثابت نہ ہو تشبیہ
فصول یا رسمی معلوم ہوگی۔

کس ادبی سے میں پڑھایا تھا دستِ شوق متھے سے بد مزاج یکا یک اٹھ گیا
اچھا تخلص ہے بد مزاج۔ شاعر بننے کا اتنا تو شوق ہو۔ کون کہتا ہے تخلص
بھی نیا ملتا نہیں۔

ایسے تھے پاؤں چو مئے یا پیار کیجئے؟ قدموں پہ ہیں جھکا تو وہ دونا اکڑ گیا
سبحان اللہ کیا ناز و نیاز ہیں۔
منہ زوروں کا حوصلہ سر کار حسن سے؟ آخر پڑی وہ مار کہ چرسہ اُدھڑ گیا
بارگاہِ حسن میں کسی کی منہ زوریاں چل سکتی ہیں۔ وہ مار پڑی کہ کھال اُدھڑ گئی۔
پہلے تو آپ اپنے کو پہچانتے نہ تھے حسن یگانہ جس کی نگاہوں میں تر گیا؟
اپنی قدر حبیب ہوتی ہے جب کوئی کسی کی نگاہ میں چج جاتا ہے۔ اب معلوم ہوا
ہم کیا ہیں۔

ہر رنگ روشن ہر دیدنی کیا دل تک نہ پہنچے وہ روشنی کیا

نئی روشنی اور پرانی روشنی کا فرق۔ گھر تو اتنا روشن مگر دل کا کنول روشن نہ ہوا تو پھر کیا؟

یہ نوجوانی یہ نا مرادی؟ چھائی ہے منہ پر یہ مُردنی کیا
منہ سے نہ بولو۔ سر سے تو کھیلو ہے باجرائے نا گفتنی کیا
اندہری اندر کیوں کھپ رہے ہو کر بیٹھے کوئی تا کر دنی کیا
حسن و عشق کے مارے نوجوان شاعروں کی حالت کتنی قابلِ رحم ہے۔ دیکھنے
والوں کا دل کڑھنے لگتا ہے کہ ہائے کم بخت یہ کیا کر بیٹھا۔

مشکل تو اک دن آسان ہوگی یہ کون جائے دم پر بنی کیا
کیوں یاد آئے پچھلا زمانہ اک جاں بلب سے یہ دشمنی کیا
زندگی کے آخری ایام میں پچھلے زمانہ کی یاد؟ الہی تو بہ۔ حافظہ اب تک کام
کر رہا ہے؟ بھلا اس سے بڑھ کے دشمنی اور کیا ہوگی؟

ہم ہوں کہ تم ہو؟ دونوں میں کھنڈ اب دوستی کیا اور دشمنی کیا
اللہ کتنا دردناک شاعر ہے۔ دوستی یا دشمنی کا مزد تو جی بھی تک ہے کہ
دم ختم باقی ہو۔ جب دونوں ٹھنڈے پڑ گئے تو پھر کسی دوستی اور کسی دشمنی؟ شعر
ایسا تو ہو کہ آدمی سن کر چونک پڑے۔

انگور کھٹے ہوں خواہ منٹھے بے دسترس کی طعنے زنی کیا
نشہ ہر نشہ کس بل ہی کس بل کس بل کے آگے اک سنسنی کیا
زیٹ زیٹ اور ہے زندگی کا کس بل اور ہے۔ یہ کس بل یگانہ کی زندگی اور یگانہ
کی شاعری کا خصوصی جوہر ہے۔

ہر خار و گل ہے یکساں یگانہ پھر دیدنی کیا نا دیدنی کیا

ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا
ہوس نے شوق کے پہلو دبا ئے ہیں کیا کیا
چچا میاں تو فرماتے ہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن۔
مگر یہاں بارگاہِ ناز میں پاس ادب اور تقاضائے شوق کی کشمکش قابلِ دید ہے۔
نہ جانے سہو قلم ہے کہ شاہکار قلم بلائے حسن نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا
حسن کو کہئے اُتو کیا کہئے۔ کاتبِ قدرت کا سہو ہے یا شاہکار؟ جس کی ذات
سے دنیا میں اسنے فتنے برپا ہوں اُسے شاہکار کہیں تو کیونکر؟ ہونہ ہو یہاں فطرت
کوئی سہو ہوا ہے۔ اس استعجاب میں کیا ظریفانہ طنز ہے؟
نگاہِ ڈال دی جسپردہ ہو گیا اندھا نظر نے رنگِ نصف مکھائے ہیں کیا کیا
یہاں اندھے سے ملو ہے عقل کا اندھا۔ نگاہِ ناز جسپر پڑ گئی دین و دنیا سے گیا۔
کیا رنگِ نصف ہے؟

اسی فریب مارا کہ کل ہے کتنی دُور؟ اس جہل میں عبث دن گنوا ہیں کیا کیا
آج نہیں کل۔ یہ مالِ مٹول روزمرہ زندگی کا معمولی تجربہ ہے۔ اتنی سدھارن
سی بات میں آرٹ نے اتنی تازہ روح چھونک دی ہے وہ کشش پیدا کر دی ہے
کہ شعر اک شاہکار کی حد کو پہنچ گیا۔ ضرب المثل ہو گیا۔

پیامِ مرگ سے کیا کم ہے مزدِ ناگاہ؟ اسیرِ چو نکتے ہی تملائے ہیں کیا کیا

مردہ ناگاہ - نوید ناگہاں - ایسے معنی خیز اختراعات یگانہ ہی کے لئے ہیں۔
رہائی کی اچانک خوشخبری پاتے ہی اسیرانِ ستم ایسے تلملے اٹھتے کہ خوشی کے ماتے
دم نکل جاتے تو عجب نہیں۔

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے اسی زمیں میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
یہ ہے اک (allegory) دریا کے پردے میں چھپے فالتوں کا انجام کار
دکھایا ہے۔ کتنے دریا پہاڑ کاٹتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ آخر چلتے چلتے زمیں
میں سما گئے۔ جنگِ خالِ اعظم کے کیسے کیسے لشکرِ ایشیا کو روندتے ہوئے یورپ
تک جا پہنچے مگر زمین انھیں بھی کھا گئی۔ آخر میں زمین سے سب کو ہارنا ہی پڑتا ہے۔
کہاں کے معنی و مطلب یہ آگ ہو کچھ اور آلا اپنے پیرے حال آئے ہیں کیا کیا
نقطہ آلا اپنے پر یاروں کو حال آگئے۔ اگر شعر کے معنی و مطلب بھی سمجھ میں آجاتے
تو نہ جانے کیا حال ہوتا۔

گزر کے آپ آہم آپ تک پہنچ تو گئے مگر شعر بھی ہے کچھ پھیر کھائے ہیں کیا کیا
منازل ارتقا کو کتنے ہر سادہ اور جربہ انداز سے بیان کر دیا ہے۔ یگانہ نے برت کر
دکھا دیا۔ کھینچ اُردو کے امکانات کتنے وسیع ہیں۔ یہ ہے ادبِ جدید۔ الفاظ
پیرائے۔ ادبِ نیا۔

بلند ہو تو کھلے سمجھ پہ زور پستی کا بڑے بڑے قدم دگمگائے ہیں کیا کیا
جتنے بلند ہوئے جاو پستی کی کشش بڑھتی جائے گی۔ اسی طرح جس کے اخلاق
جتنے زیادہ مستحکم ہوتے ہیں اُسے اپنی طرف کھینچے میں شیطان کو اتنا ہی زور لگانا
پڑتا ہے۔ اس زور اس کشش سے بعض اوقات بڑے بڑوں کے قدم دگمگاتے ہیں

گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں۔ "The characteristic quality
of his art is sublimity of thought & simplicity
of language."

شعر میں بلندی و عظمت پیدا کرنے کے لئے اچھا نگرانی، غیر فطری مددِ مائی
کی ضرورت نہیں Nature کے رنگ و رنگ کے تھاق کو باہم ربط
دیکر اہم نتیجہ نکالنے سے عظمت پیدا ہوتی ہے ذہن کو طاقت پہنچتی ہے لذت
ملتی ہے۔

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہو وہ لغزشوں پر میسر آئے ہیں کیا کیا
مادی زندگی کی مسلسل کشمکشوں کے باوجود میرزا یگانہ کے ذہن کو جو سکون
اور دل کو اطمینان حاصل رہا ہے اس کا علم اُن کی قیامی کے سوا شاید کسی کو
ہوا ہو۔ ایسا شعر اُسی کے دل و دماغ سے نکل سکتا ہے جسے دولتِ سکون
حاصل ہو۔ جسے ایسا دوست ملا ہو جو اس کی لغزشوں پر مسکرا کر مسرت کی تازہ لہر
دوڑا دے۔ یگانہ آرٹ کی اک خصوصیت یہ بھی ہے کہ تھاق و واقعات جو شعر میں
بیان کئے گئے ہیں انھیں دیکھنے والا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تو وہ لذتِ حاصل
نہیں ہوتی جتنی شعر کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ مشاہدہ اتنا عام اگر شاعر کا
انداز تصرف اتنا اچھوتا۔ سبحان اللہ "His representations are
more astonishing, more delightful to taste &
intelligent than the things themselves."

خدا ہی جائیگا میں کون ہوں کیا ہوں خود اپنی ذات ٹینک دلیں آئیں کیا کیا

آئینے میں سامنا جب ناگہاں ہو جائیگا
پردہ غیرت وہاں بھی درمیاں ہو جائیگا

جان دیتے دیر کیا لگتی ہے تیری راہ میں
اشک ٹپکے یا نہ ٹپکے دل بھر آئیگا ضرور
سایہ دیوار سے لپٹے پڑے ہو خاک پر
نیند کے ماتے ٹھہر جائیگا کھٹنے کی ہر دیر
چاروں کی زندگی ہو کاٹ دو ہنس بول کر
کیا سمجھتے تھے کہ دل سائیشہ نازک مزاج
دیکھ لو حسن یگانہ دور سے بیگانہ دار
دل سلامت تو یہ بھی امتحاں ہو جائیگا
آہ کرنے دیجئے آپ امتحاں ہو جائیگا
اٹھو چلو ورنہ وہ کافر بدگماں ہو جائیگا
چشم حیراں میں سب خواب گراں ہو جائیگا
دل لگا لو بھر قفس ہی آئیاں ہو جائیگا
چوٹ کھاتے کھاتے تاننا سخت جاں ہو جائیگا
پاس جاؤ گے تو پردہ درمیاں ہو جائیگا

"Parts are not to be examined till the whole
has been surveyed; there is a kind of intellectual
remoteness necessary for the comprehension

۱۔ دل لگانا ماحول سے مطابقت کرنا دین اصول زندگی ہے۔

۲۔ جن کی نازک مزاجی اک ٹھیس کی تاب نہیں لاسکتی تھی حوادثِ روزگار نے انہیں تباہ کر دیا۔

of any great work in its full design and
in its true proportions a close approach shows
smaller niceties but the beauty of whole is
discerned. پاس جاؤ گے تو پردہ درمیاں ہو جائیگا

ہنوز زندگی تلخ کا مزہ نہ ملا
کمال صبر ملا صبر آزمانہ ملا
اندازہ صبر کے مطابق کوئی صبر آزمانہ ملا ورنہ صبر کے جوہر اور کھلتے۔ یہ امر میرزا یگانہ
کے مزاج سے کچھ بعید نہ تھا۔ لکھنؤ اور لاہور میں یاروں نے اجنبی تنقیدوں کے جواب
میں میرزا صاحب پر عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کی دھمکیاں تو دیں مگر آگے ہمت
نہ پڑی۔

مری بہار و خزاں جسکے اختیار میں ہے
زندگی کی ساری چیل پہل یا د اسی محض اپنے دل کی تنگنگی یا بڑے مرد کی پرموتوف ہو۔
مگر دل کا مزاج پالینا اور اسے قابو میں رکھنا کچھ آسان نہیں۔

جواب کیا وہی آواز باز گشت آئی
قفس میں نالہ جائیگا کا فرہ نہ ملا

مثل مشہور ہے اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا۔ عالم تنہائی تو بے کسی کے مضامین سے اساتذہ

کے دواؤں بھرے پڑے ہیں مگر اس شعر کا جواب شاید ہی کہیں مل سکے۔ اک

اسیر قفس عالم تنہائی میں نالہ و فریاد کر رہا ہے۔ نالہ بھی کیسا بے نالہ جائیگا قفس میں یا

اس پاس اس کا کوئی ہمصنفیر بھی نہیں جو اس کی آواز بڑا دازدیتا جس سے اس کا کچھ

غم غلط ہوتا نالہ جائیگا کا جواب بھی ملتا ہے تو صدائے بازگشت سے اُن درمی تنہائی یا

کیا کوئی مصوٰرہ دہ تنہائی کی نایابی بولتی ہوئی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ شاعر نے اس قفس کے

کے پردے میں اپنی قیمتی سنائی ہے۔ آواز بازگشت کے لفظ نے عالم تنہائی کا کتنا مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے۔

امید و ارمانی نقس بدتر ہے جہاں اشارہ توفیق غائبانہ ملا

ہوا کے دوش پہ چاہو کاروان نقس عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پانہ ملا

ہزار ہا تھک ہی جا سب منزل مقصود دلیل راہ کا غم کیا ملا ملا نہ ملا

ہزار ہا تھک بمعنی غالباً اہل زبان کا روزمرہ ہے۔ دلیل راہ بمعنی رہ نما۔ دیکھئے سالک کو اپنے دل آگاہ پر کتنا بھروسہ ہے۔ غیروں کی امداد سے کتنا بے نیاز ہے اُس کا دل آگاہ اشارہ کرتا ہے کہ ہزار ہا تھک منزل مقصود اسی طرف ہے کوئی رہ نما نہیں تو کیا پردہ، قدم بڑھائے چلو۔

بس ایک نقطہ فرضی کا نام اگر ہے کسی کو مرکز تحقیق کا پتہ نہ ملا

امید و ہم نے مارا مجھے دور ہے پر کہاں کے دیر و حرم گھر کا استنہ ملا

خوش نصیب جسے فیض عشق شوا انگیز بقدر ظرف ملا۔ ظرف سے سوانہ ملا

سچ تو ہے کہ اس صدی میں بیگانہ کے سوا اور کسی کو شاعر سمجھنا محض خود فریبی ہے یہ اشعار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس صدی میں سچا شاعرانہ شعور بیگانہ کے سوا اور کسی کو ملا ہی نہیں۔ دوسو برس کے لٹریچر میں اساتذہ کے کیا کیا جواہرات بھرے پڑے ہیں۔ مگر اس پر بھی بیگانہ کے ان اشعار کا جواب نہیں۔ یہ ہے ادب جدید الفاظ پڑانے۔ ادب نیا۔

"He works wonder by the sublimity of his mind & gives delight by its fertility."

سمجھ میں آ گیا جب عذرت مجبور گناہگار ازل کو نیا بہانہ ملا
انسان جب اپنے ہر نیکی بد میں مجبور ہے اور اس کا ہر فعل اسباب و ذرائع کا تابع ہے تو فطرت مجبور اپنی مجبوری کا عذر پیش کر کے گناہوں کے لئے بہانہ پیدا کر لیتی ہے۔ شاعر کی اس قوت استدلال پر منطق جتنا ناز کرے بجا ہے۔ عمر خیام نے تو بس اتنا ہی کہا تھا ۵

آنکس کہ گنہ نہ کر و چوں زلیست بگو

یعنی زندہ رہ کر گناہوں سے بچنا ممکن نہیں۔ مگر خیام نے اس کتاب گناہ کی مجبوری پر ایسی قوی دلیل نہیں پیش کی جیسی بیگانہ نے۔ "A flower of wit is always at the disposal of his rich genius."

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے

وہ بد نصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

انسان اگر مجبور نہ ہوتا، ہمیشہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہی ہو کر رہتا تو غیر ممکن تھا کہ وہ کسی ہمتی کو اپنے سے بالا تر مانتا۔ کامیابیوں کے نشہ میں اپنی ارادہ پرستی کے سوا خدا پرستی کا اسے دھیان بھی نہ آتا۔

دنیا کی نگاہ میں بخت کی نارسائی اک قسم کے غلاب سے کم نہیں مگر مصنف کی رسائی فکر اسکا منتہا ہے نظر کس قدر قابل رشک ہے کہ وہ اسی نارسائی بخت کو معرفت حق کا زینہ ثابت کرتا ہے۔

(Pessimism میں Optimism) کا پہلو نکال لیتا ہے
جب مجبوری و نا کامی یا یوں کہو سخت کی نارسائی کی بدولت معرفت حق حاصل ہوتی
ہے تو اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور کیا ہوگی؟ فلسفہ جبر و قدر پر یگانہ کا یہ شعر
جلالتِ تخیل و قوتِ استدلال میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔
اس قولِ زرین کے تحت ڈاکٹر جانسن نے ڈراماٹن کے چار مصرعے پیش
کئے ہیں:-

"Well might the ancient poets then confer
On night the honoured name of counsellor
Since, struck with rays of prosperous fortune blind,
We light alone in dark afflictions find."
اسی فلسفہ کے تحت کہ مصیبت میں انسان کی نیکی اور دانستہ ترقی کرتی ہے
یگانہ کا مذکورہ بالا شعر اک لازوال شاہکار ہے۔ یہاں دو مصرعوں میں کس
حیرت انگیز سادگی و پرکاری کے ساتھ آرٹ کا کمال دکھایا گیا ہے
نگاہِ یاس و ثابیت ہر سی لا حاصل ہے
خدا کا ذکر تو کیا بندہ خدا نہ ملا

مجھے لگی خطا پر یاس شرمنا نہیں آتا
انسان اپنی فطرتِ مجبور پر نظر کرتا ہے تو اپنے گناہوں پر پشیمان ہونے کی
کوئی وجہ نہیں پاتا۔ اپنے جرم کو پر ایاجرم سمجھتا ہے۔ اس لحاظ سے احساسِ مذمت
بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

"By the plentitude of his wit the reader is
commonly surprised into substantial
improvement."

میرا ہوا پامرش کا کھک جانا نہیں آتا کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا
پائے سرکش کی بلاغت نے باغیوں کے کیر کڑ کا کتنا سچا فوٹو کھینچ دیا ہے
آنا نہیں آتا۔ اس قافیہ کے ساتھ ردیف کے لپٹنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی
مگر لفظ آنا کو محاورہ میں لا کر (راہ پر آنا) ردیف کے ساتھ کتنا چسپاں کر دیا۔
ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا حکم آنکھوں پر مگر فرمانِ آزادی بجالانا نہیں آتا
تیرا بندہ بھی ہوں اور فرمانِ بجالانا نہیں آتا۔ واہ۔ ایک دعویٰ دوسرے سے
کتنا متناقض۔ مگر اس شوخی منطق کا کیا کہنا۔ فرمان کو لفظِ آزادی کے ساتھ مشروط
کر کے اجتماعِ نقیضین کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا۔ کہتا ہے تیرا بندہ تو ہوں تیر
کسی حکم سے سترابی کی مجال نہیں مگر ہاں ایک فرمانِ آزادی بجالانا مجھ سے ممکن
نہیں۔ بندہ کیونکر تیری بندگی سے آزاد ہو جائے۔ کیونکر طوقِ بندگی اتار ڈالے۔
بسیان اللہ کیا جذبہ عبودیت ہے۔

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون کیا ہو سمجھا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا
اس شعر پر اردو زبان جتنا ناز کرے بجا ہے۔ فطرتِ انسانی اک نہایت پاکیزہ
لطیف شے ہے۔ حیاتِ ارضی کی کشاکش میں انسان کو مادی کشافوں سے دوچار
ہونا پڑتا ہے جس سے یہ جوہر لطیف چھپا رہتا ہے۔ گمراہ زندگی میں اک ایسا وقت
بھی آتا ہے کہ انسان اپنے جوہر ذاتی کو محسوس کر کے وجد میں آجاتا ہے۔ اپنی حقیقت

کو پالیتا ہے۔ وہ خود تو آگاہ ہو جاتا ہے مگر دنیا کو سمجھا نہیں سکتا۔ یگانہ کی ذات اک ایسا راز ہے جو سمجھا نہیں گیا۔ حضرت جوش کیسیانی فرماتے ہیں فطرت انسانی کے جوہر کا مسئلہ کس صفائی سے مصرع اول میں بیان کیا ہے سمجھتا ہوں۔ ان الفاظ سے جو عظمت ظاہر ہوتی ہے تشریح کی محتاج نہیں۔ اس سے زیادہ صاف اور ہموار شعر خیال میں نہیں آسکتا۔ سہل متنع کارنگ کس قدر قابلِ داد ہے۔ دوسرے مصرع کے انداز میں لکھا کہنا گوروادوں کو سمجھا کر تنگ آیا ہوا انسان یہی کہا کرتا ہے اور اور اس کا لب و لہجہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

"To speak about him would remain problematic; no true impression but a false one could be realised. He lived in a disorganised condition of society."

مصیبت کا پہلا آخر کی نکتہ ہی بجایا مجھے سوار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا
دل بے حوصلہ ہو اک ذرا سی ٹھیس کا ہمان وہ آنسو کیا پیئے گا جسکو غم کھانا نہیں آتا
میرزا یگانہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ طنزیات کے امام ہیں۔ اساتذہ
میں کسی کا طنز یہ انداز اتنا کامیاب نظر نہیں آتا۔ وہ آنسو کیا پیئے گا جس کو غم
کھانا نہیں آتا کتنا تازہ تصرف ہے اور اس طنز سے کلام میں کتنا زور پیدا ہو گیا
ہے۔ دل بے حوصلہ کو ذرا سی ٹھیس کا ہمان کہنا نزاکت و تخیل کا کتنا اچھا نمونہ ہے
تجائز انہ شور ختم ہو گیا یگانہ پر۔
مجھے انا خدا آخر کسی کو مخدو کھانا ہی بہانہ کر کے تنہا پارا تر جانا نہیں آتا

دیکھے یہاں بھی وہی طنز نمایاں ہے۔ ترک موالات کے ہنگام میں ہندوستان کے خود غرض رہنماؤں نے ہجرت کا فتویٰ دیکر ہزاروں سادہ لوح مسلمانوں کو سر بسجرا ہو جانے پر آمادہ کر دیا۔ آپ فرمے میں رہے۔ نہ معلوم ایسے ناخدا یاں ملک ملت خدا کو کیا منہ دکھائیں گے؟ "There were writers wholly employed on something unexpected & surprising; they had no regard to that uniformity of sentiment which enables us to conceive & to excite the pains & pleasures of other minds. They ^{wrote} rather as beholders than partakers of human life."

اسیرو شوق آزادی مجھے بھی گدگداتا ہی مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا
آزادی و حریت کا جذبہ انسانیت کی جان ہے۔ مگر کوئی جذبہ ہو کوئی قوت ہو
اعتدال و سلامت رومی کے ساتھ نہیں ہے تو اس کا نتیجہ بربادی کے سوا
کچھ نہیں۔ یہ ہے حقیقت کبریٰ جس میں مبالغہ کی پونک نہیں۔ یہ ہے وہ حکیمانہ
غزل گوئی جسے زندگی کی شاعری کہتے ہیں The voice of a genius poet
is a force of Nature. He is in various respects a very singular phenomenon."

"Curiously & not sufficiently considered: how everything does co-operate with all. No thought, word, or act of man but has sprung withal out of

all men & works sooner or later on all"

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے تدبیر دیکھنا
منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا

مطلع کیا مطلع الانوار ہے۔ اس عالم اسباب میں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے
کوئی کام نہیں بنتا۔ مگر یہ بھی اک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بعض خوش نصیبوں
کی تدبیر محسوس بھی حسبِ لخواہ نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ ایسی قسموں کا کیا کہنا جن کا پاؤں
توڑ کر بیٹھ جانا بھی ہزاروں جدوجہد سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہو۔

پہنا دیا ہے طوقِ غلامی تو اب یکدن میری طرف بھی مالکِ تقدیر دیکھنا
مجھ ناتواں کا صبر تو کیا آزماؤ گے راس آئے تملکو جو ہر مشیر دیکھنا
آواز ہے مجھ پہ کتے ہیں پھر بندگانِ عشق پڑ جائے پھر نہ پاؤں میں زنجیر دیکھنا
مردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہو اپنی موت ہاں دیکھنا ذرا فلکِ پیر دیکھنا
کیا طنز کیا humour کیا حیرت انگیز اندازِ سخن ہے۔

ہوش اڑنے جائیں صنعت بہزاد دیکھ کر آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا
صاحب طرز کی شان یہ ہے کہ کلام خود بیکار اٹھے کہ وہ کس کے قلم سے نکلا
ہے۔ کہتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ مصوّر کا کمال دیکھ کر ہوش اڑ جائیں۔ تصویر کے
ساتھ ساتھ آئینہ بھی سامنے رکھ لو کہ اصل و نقل کا فرق معلوم ہو سکے۔
چونکہ تو چشمِ شوق میں عالم سیاہ تھا خوابِ نظریہ کی تعبیر دیکھنا

اس شعر میں شوق و آرزو کی رنگارنگ نظریہ بیوں کا عجیب و غریب مرقعِ نظر
آتا ہے۔ انسان اپنی ہی شوق و آرزو کی محبتِ تصویریں خواب میں دیکھتا اور
رنگارنگ خیالی منصوبے باندھا کرتا ہے۔ مگر آنکھ کھلتے ہی سارا طلسم خیال
ٹوٹ جاتا ہے۔ آنکھیں مل جل کے دیکھتا ہے مگر اب وہ طلسم کہاں۔ جدھر
دیکھو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ ایسی جنگ کے زمانہ میں یاروں کو کیا کیا
نظر فریب خواب دکھائی دے رہے تھے مگر دیکھتے ہی دیکھتے ایسی ہوا بگڑی
کہ وہ سارا طلسم خواب فراموش ہو کر رہ گیا۔ وہ خوابِ نظریہ کی کیا تعبیر ملی؟
پردانے کر چلے تھے سر انجام خود کشی فانوس اڑے آگیا تقدیر دیکھنا
پردانوں کا ارادہ خود کشی اور فانوس کا اڑے آ جانا اک ایسا استعارہ ہے
جس کے پردے میں حیاتِ انسانی کی ہوالعجبی۔ تدبیر و تقدیر کی کشمکش اربابِ نظر
کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اللہ امتد انسان کتنا مجبور ہے۔
کار خیر تو کجا بڑا کام بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ مار ڈالنا تو کیا مر جانا بھی اپنے
اختیار میں نہیں۔

شاید خدا نخواستہ آنکھیں غاکریں
اچھا نہیں نوشتہ تقدیر دیکھنا

زندگی کا کارخانہ اُمید پر چل رہا ہے۔ انسان کو حالِ قضا و قدر معلوم ہو جائے
تو کل کام رتا آج ہی مرجائے۔ کچھ نہیں معلوم کل کیا ہونے والا ہے مگر ہر شخص
اپنی دھن میں اپنا کام کئے جاتا ہے اپنے نوشتہ قسمت سے بے خبر ہی رہنا
انسان کے حق میں بہتر ہے۔ ورنہ نوشتہ قسمت کے مطالعہ سے خلافِ امید حالات

پیش نظر ہو جائیں تو جی چھوٹ جائے۔ خلاف اُمید حالات پیش آنے کے اندیشہ کو مصنف نے آنکھوں کے دغا کرنے سے تعبیر کیا ہے جس سے اک تنبیہ بلکہ شدت تنبیہ نمایاں ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ میرزا بیگانہ نے زندگی بھر باتوں اور نچو میوں سے کبھی مشورہ نہیں کیا اپنی روزمرہ کی زندگی میں یا پر آشوب ادبی زندگی میں کبھی کسی سے صلاح نہیں لی ہمیشہ اپنے بھروسہ پر کام کیا۔

اصلاح کی مجال نہیں تھی تو کیا ضرور؟ بے ربطی نوشتہ تقدیر دیکھنا زندگی کے شیب و فراز۔ زمانے کے انقلابات جن پر انسان کا کوئی دسترس نہیں نوشتہ تقدیر کی بے ربطی کا نتیجہ ہیں۔ ایسے لوگ شاذ و نادر ہی نظر آئیں گے جن کی زندگی ایک حال پر بسر ہو گئی ہو۔ ہر شخص کو نئے انقلابات کا سامنا رہتا ہے۔ اور یہ سب خاتمہ تقدیر کی شوخیوں ہیں جن کی اصلاح کرنا بشر کی مجال نہیں۔ شاعر کی شوخی تخریر خاتمہ تقدیر کی ان شوخیوں کو بے ربطی سے تعبیر کرتی ہے۔ جب ان بے ربطیوں کی اصلاح ممکن نہیں تو پھر ان پر نگاہ ڈالنا ہی عبث ہے۔ سبحان اللہ کتنا تازہ کتنا حکیمانہ خیال ہے۔ اصلاح کی مجال نہیں، اس پر یہ کہنا کیا بجا ہے کہ بیگانہ کی آواز فطرت کی آواز ہے؟

ہر خوب زشت آپ ہی اپنی مثال ہو حد کمال کا تب تقدیر دیکھنا
بادِ مراد چل چکی لنگر اٹھا دیا اس پھر آگے بڑھ کے خوبی تقدیر دیکھنا
کیا حوصلہ انگیز درس مل ہے کہ جو کچھ کرنا ہے عین وقت پر کر گزرو۔

چلے چلو جہاں لیجائے لولہ دل کا
دلیل راہ محبت ہے فیصلہ دل کا
دلیل راہ یعنی رہنا۔ شعر کی خوبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ سننے والا چھوٹے لگے۔

ہولے کو چھ قاتل سے بس نہیں چلتا کشاں کشاں لئے جاتا ہے لولہ دل کا
گلہ کسے ہو کہ قاتل نے بجاں چھوڑا ترب ترب کے نکالوں گا حوصلہ دل کا
خدا بچائے کہ نازک ہو نہیں ایک سے ایک تنگ مزاجوں سے ٹھہرا معاملہ دل کا
کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی کسی کی ریف سے لازم ہو سلسلہ دل کا

سبحان اللہ کتنا دلہانہ رنگ تغزل ہے۔ تغزل کے ساتھ اخلاقی درس کا بھی ایک پہلو نکلتا ہے۔ کسی کی ریف میں اسیر ہو جانا۔ کسی کا ہو رہنا اس آزادی سے کہیں بہتر ہے جو آوارگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ شعر مذہب کی طرف بھی دعوت دیتا ہے یعنی مطلق العنان ولایت مذہب سے رہنے سے پابند مذہب رہنا مناسب ہے۔ مگر مذہب کی بوجہ عجیب دیکھئے کہ بدکاریوں کی روک تھام کے لئے تو قانون بناتا ہے سزا نہیں دیتا ہے مگر نیکی کرنے کے لئے کوئی انعام مقرر نہیں کرتا فقط جنت کی خوشخبری دیتا ہے۔

پیالہ خالی اٹھا کر لگایا منہ سے کہ یا اس کچھ تو نکل جایا حوصلہ دل کا
فطرت انسانی کا کتنا حسرتناک منظر ہے۔ حالات کتنے ہی ناموافق ہوں
ہوس سچیا نہیں چھوڑتی۔

دُھواں ساجب نظر آیا سوا منزل کا

نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دِلکا

نیچرل شاعری محض مرکبات و مظاہر قدرت کی صورت گیری تک محدود نہیں بلکہ اسکا منتہا کمال ہے۔ انسان کی باطنی دنیا یعنی داخلی حالات جذبات کی ترجمانی۔ مسافر جب منزل کے قریب پہنچتا ہے تو تلاطم شوق و اضطراب اُسے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی گویا ہم آغوش منزل کر دیتا ہے۔ چراغ لیکے گئے ڈھونڈتے ہیں دیوانے نشان تو دور ہواں نام تک نہیں دِلکا دل جسے دل کہہ سکیں دُنیا کے اس خرابے میں اس کا نام و نشان تک نہیں چراغ لے کے ڈھونڈتے دیوانہ وار شوق جستجو کی چلتی پھرتی تصویر ہے۔ مگر آدمی ملتا کہاں ہے؟

کبھی تو موج میں آئینہ گزیرا دیوانہ اشارہ چاہیے ہے جنبش سلاسل کا دل میں کتنی ہی طاقت ہو جب تک خارجی اسباب اپنا عمل نہ کریں یعنی Positive اور Negative کا اتصال نہ ہو زندگی حرکت میں نہیں آتی یہاں موج میں آنا اہل زبان ہی کہہ سکتا تھا۔ کوئی ترقی پسند کہتا تو جویش میں آنا کہہ دیتا۔ اور اپنی نارسائی پر الٹی دلیل پیش کرتا۔

"Every man must bide his time; he must wait - not in listless idleness, but constant, steady, cheerful endeavour always willing, fulfilling & accomplishing his task, that when occasion comes he may be equal

to the occasion."

ازل سے اپنا سفینہ رواں چلا ہے ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا بیسویں صدی میں کسی کو ایسا مکمل شاعرانہ شعور ملا ہی نہیں جس کے قلم سے اتنا سادہ اتنا پر معنی مصرع نکل سکے ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا۔ اور اس مصرع پر مصرع لگا کر کس جن کے ساتھ اس حقیقت کو ذہن نشین کر دیا ہے کہ زندگی اور زندگی کے منازل ارتقا کا کوئی اور چھوڑ ہی نہیں۔

"He is the voice of Nature. Future generations of men will find new comprehensive meanings in his art, new elucidations of their own human being, will find new harmonies with the infinite structure of the Universe."

مسطر مالک رام کہتے ہیں۔ انسان کی روح کی متعلق عقاید میں اختلاف ہے۔ ہندو مذہب اُسے ازلی وابدی مانتا ہے۔ اس کی ہستی کو اُسی وقت سے تسلیم کرتا ہے جب سے خدا اور مادہ ہیں۔ دوسرے مذاہب اس کے حدوث کے قائل ہیں اور خدا کو اس کا آفرینندہ قرار دیتے ہیں۔ اس صورت میں بھی اس کی پیدائش کا کوئی وقت متعین نہیں ہو سکتا۔ اُسے ازلی وابدی قرار نہ دیا جائے تو بھی اس کی قدرت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ روح کا مختلف قالبوں میں ظاہر ہونا بھی اک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ ہندو تو آواگون کے قائل ہیں ہی بعض اکابر اسلام بھی اسی عقیدے کے مؤید نظر آتے ہیں چنانچہ مولانا روم کا شعر

مشہور ہے ۵

ہم قصہ و ہفتاد قالب دیدہ ایم
ہم سب سے بڑا بارہا روئیدہ ایم
اس سے ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ روح بارہا عالم وجود میں آچکی ہے لیکن ابھی
تک مقصد حیات کو نہیں پہنچی ۵ ہوا ہونے گرداب کا نہ ساحل کا ۹
نہ سر میں نشہ ہی باقی نہ دلیں کیفیت
وہ دستِ شل جو دعا کیلئے بھی اٹھ نہ سکر
پرانی موت کا احسان بھی ہی نہیں منظور
خود اپنی آگ میں جلتا تو کیسیا ہوتا
حصول مقصد کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ کبھی جنگ کرنا پڑتی
ہے کبھی ضبط و تحمل و عدم تشدد کے ساتھ اپنی آگ میں جل کر حق کو ثابت کرنا پڑتا ہے
امید و بیم نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا
چراغ گل ہوا جب آستانہ دل کا
دل کا کنول بکھا اور دنیا اندھیر ہو گئی۔ کون شخص ہے جو دنیا میں ہمیشہ خوش
رہ سکا ہو گا۔ کبھی نہ کبھی اندوہ و غم سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے۔ جو لوگ ہر وقت
خوش رہنے کی مصنوعی کوششیں کرتے رہتے ہیں انھیں بھی یہ تلخ تجربہ ہوتا ہے۔
ایسا وقت آ ہی جاتا ہے کہ دل سے دنیا کی ہوسیں فنا ہو جاتی ہیں۔ مرزا غالب
نے کیا خوب فرمایا ہے ۵

دلیں ذوق وصالِ راز تک باقی نہیں
اگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
اس کیفیت کو اپنی اپنی زبان میں کس نے نہیں بیان کیا۔ غالب نے بھی
نہایت سادگی سے بیان کیا۔ مگر میرزا یگانہ نے کچھ اور ہی زور قلم دکھایا ہے۔

آستانہ دل کا چراغ گل ہو جانا اک آسانی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اس پر امید و بیم
کا کنارہ کش ہو جانا! جب آستانہ دل کا چراغ ہی گل ہو گیا تو پھر امید و بیم
کا اس راہ سے گزر ہو تو کیونکر؟

جوابِ حُسن طلبے دلوں سے بن نہ پڑا
حیا سے گر گئے جب نام آ گیا دل کا
دوست کا اندازِ حُسن طلب دیکھ کر بے دلوں سے کچھ بن نہیں پڑتا۔

اپنی ہی دستی و مجبوری پر خاموش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دل کا نام آتے ہی غیرت
کے مارے گر جاتے ہیں کہ دوست کے حُسن طلب کے جواب میں کیا نذر کریں؟
وصلہ مندی اور مجبوری کی کشمکش کا کیا درد انگیز مرقع ہے؟

فلک دووں طرف کا لگا ہوا جتن تک
نہ اپنی آنکھ اٹھنے کی نہ پردہ محل کا
فلک تفرقہ انداز جب تک درمیان میں ہے نہ عشق مجازی اپنے مقصد

کو پہنچ سکتا ہے نہ عشق حقیقی۔ مجاز و حقیقت دونوں کو اس شعر میں کس
نے یکجا کر دیا ہے

This art, one might say, is a product of Nature's despair
as Nature herself

نور دوست، یگانہ کچھ ایسے غائب ہے
زبان گنگ تک آیا نہ ماجرا دل کا
نور کو جتنی دفعہ پڑھو گے شاعر کا ذہنی ارتقا ثابت ہوتا جائے گا۔ اک

دیانتدار نقاد شہادت دیکھا کہ حقیقی شاعر کی ذات میں جن شرائط کا موجود ہونا
لازم ہے وہ کس حد تک میرزا یگانہ کی ذات میں ودیعت ہوئی ہیں۔ اور
راستہ کو کتنا بڑا دخل ہے۔

چراغِ زسیت بجھا دل و اک دھواں نکلا
لگا کے آگ مرے گھر سے یہاں نکلا

اللہ کی شدتِ احساس ہے تباہی و بربادی کو کس شان سے بیان کیا ہے
دل اپنا خاک تھا پھر خاک کو جلا تا کیا
ترپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے مجھے آخر
لہو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل
نہاں تھا خانہ دل ہی میں شاہِ مقصود
لگا ہے دل کو اب انجام کار کا کھڑکا
خوشی سے ہو گئے بڑھو میری شادی مرگ
اہل سے بڑھکے محافظ نہیں کوئی اپنا
دکھایا گورِ سکندر نے بڑھ کے آئینہ
لحد سے بڑھکے نہیں کوئی گوشتِ رات
بھلا اس "قیامت آئی" کا کیا جواب ہو سکتا ہے شیعریہ المثل کی حد تک پہنچا
اب اپنی روح ہے اور سیرِ عالم بال
روح کا قالب سے جدا ہونا ایسا ہی ہے جیسے یوسفِ کم کردہ کا دل نکلا
کنوئیں سے باہر نکل آنا۔ انسان جب تک قیدِ عنصری میں ہے اپنی حقیقت سے
کس قدر بیخبر اور اپنے مرکز سے کتنا الگ رہتا ہے۔

کلامِ یاس سے دنیا میں پھر آگ لگی
یہ کون حضرت آتش کا ہنر باں نکلا
قفس کو جانتے ہیں یاسِ آشیاں اپنا
مکمل اپنا زمیں اپنی آسماں اپنا

یہ وہ غزل ہے جو فروری ۱۹۱۷ء میں علی گڑھ کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی
وہ بھی کیا سماں تھا کہ میرزا صاحب غزل پڑھ رہے تھے اور ہر دوسرے قیصر کے شعر
پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ یہ بڑا دلچسپ واقعہ ہے جسے میرزا صاحب نے
خرافاتِ عزیز میں تفصیل سے لکھا ہے۔

مستائے رنگِ زمانہ کا اعتبار نہیں بدل نہ جائے یقین کہیں گماں اپنا
بس ایک سایہ دیوار یا کیا کم ہے اٹھالے سر سے مرے سایہ آسماں اپنا
اس شعر پر یونین ہال علی گڑھ میں جو شور برپا ہوا وہ اب تک کانوں میں گونج رہا
ہوگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ علی گڑھ کو ٹیکوئینجے شاعروں اور مصنفوں کا فرق
مراتب معلوم ہو گیا۔

فرمے کیا تھے ہوں اندوہ غم تو کیا کہنا یقین نہ ہو تو کمرے کوئی امتحاں اپنا
اندوہ و غم کے اقسام اور ان کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی اپنی بد اخلاقی و
بدکاری کے ہاتھوں بے رحم میں مبتلا رہتا ہے مصیبت و حقیقت ایوں ہی کی
مصیبت ہے جس سے روح تحلیل ہوتی رہتی ہے۔ کوئی اپنی اخلاقی قوتوں اور
ادائے فرض کی بدولت مصیبتیں اٹھاتا ہے مگر ایسی تکلیفوں سے لذت حاصل ہوتی
روح بالیدہ ہوتی ہے۔ چور۔ دغا باز۔ بے ایمان بھی مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں اور
مجان ملک ولایت بھی۔ مگر ان دونوں کی نوعیت بے رحم میں بڑا فرق ہے۔ اس

اس کتاب میں اشعار کا مفہوم سمجھانے کیلئے جو اشارات دیے ہیں شاعر کیلئے نہیں بلکہ طلباء اور پڑھنے والوں کیلئے ہیں۔

فلسفہ غم سے شاعر کا مطمح نظر۔ اوسکا کیر کڑا سکا اصول زندگی دریا کیبھا جاسکتا ہے
عجیب بھول بھولیاں جو منزل ہستی بھٹکتا پھرتا ہے گم گشتہ کارواں اپنا
کہ صبر سے آتی ہے یوسف کی بوہنستانہ؟ خراب پھرتا ہے جھل میں کارواں ایجا
انسان اپنے فہم و ادراک سے وجود باری تعالیٰ کو محسوس تو کر سکتا ہے مگر
اُسے پا نہیں سکتا۔

جرس نے خرد و منزل سنا کے چونکایا نکل چلا تھا دے پاؤں کارواں اپنا
سبحان اللہ رفتار زمانہ اور احساس بیداری کا کتنا سچا فوٹو ہے۔ یہ ہے وہ
تعمیری آرٹ جسکا مطالعہ کرنے والا اپنے اندر اک ترقی محسوس کرتا ہے حضرت
جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ شعر کہہ سکتا ہے اس کے کمال سخن کو ثابت
کرنے کے لئے کسی خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ اردو زبان میں اس پایہ کے شعر
بہت ہی کم ملیں گے۔

خدا کسی کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلاے قفس کے سامنے جلتا ہوا آشیان اپنا
حضرت جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں یہ شعر بھی الہامی ہے قفس کے سامنے جلتا ہے
آشیان اپنا۔ اللہ اللہ کتنا دردناک مضمون ہے۔ چونکہ اس قسم کی بے دردی ایسی
شعراوت و سفاکی رقیق نہیں آتا۔ اسلئے مصرعہ اول میں اس دردناک منظر کو
خواب بد سے تعبیر کیا ہے۔ روز بد بھی کہا جاسکتا تھا۔ مگر یہ سامنے کا لفظ تھا۔
خواب بد نے اس مضمون کو وجدانی بنا دیا۔

مستر مالک رام کہتے ہیں۔ غالب کا شعر مشہور ہے۔
فصل میں مجھ سے رودادِ چین کہتے نہ ڈرہم گری جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیان کیوں ہے

اس کی تیر میں بھی وہی جذبہ امید کام کر رہا ہے۔ یگانہ نے اسی مضمون کو
ترقی دیکریوں کہا ہے۔ خدا کسی کو بھی یہ خواب انخو آشیان آنکھوں کے سامنے
جل رہا ہے لیکن دل ایسی ناخوشگواری حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اسی
لئے اسیر قفس اسے خواب سمجھ رہا ہے کس قدر دردناک نظارہ ہے۔ یہ درست
ہے کہ اگر غالب کا شعر نہ ہوتا تو غالباً یگانہ بھی یہ شعر نہ کہہ سکتے۔ لیکن یگانہ
کا شعر بلحاظ زبان و طرز بیاں اپنے پیش رو سے بڑھ گیا ہے۔ بہر حال فضیلت
پہلے ہی شعر کو ہے۔

مستر مالک رام کی اس رائے سے ہرگز اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ غالب
کا مذکورہ بالا شعر نہ ہوتا تو یگانہ کا یہ شعر وجود میں نہ آتا۔ یگانہ نے یہ شعر کسی
شعر سے متاثر ہو کر نہیں کہا ہے۔ بلکہ ذاتی مشاہدے کے تحت کہا ہے۔ اور
یہ مشاہدہ (کھر کی تباہی) اتنا عام مشاہدہ ہے کہ ہر دور کے شعرا نے
(غالب سے پہلے اور بعد) کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ میرزا یگانہ کو ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا
کہ ان کا کوئی شعر غالب کے شعر سے متاثر ہے تو وہ کبھی اپنے دیوان میں نہ رکھتے
وہ غالب کے سایہ سے بھی دور دور رہتے ہیں۔

"Great thoughts are always general. The writers
who lay on watch for novelty could have little hope
for greatness. Their attempts were always
analytic; they broke every image into fragments.
What they wanted of sublimity, they endeavoured.

to supply by hyperbole; their amplification had no limit; they left not only reason but fancy behind them & produced combinations of confused magnificence that not only could not be credited but could not be imagined." (جیسے جوش خاں)

ہمارا رنگ سخن یا اس کوئی کیا جانے سوائے آتش ہے کون ہزیاں اپنا یہاں دوسرے مصرع پر تسکین اوسط کا زحاف واقع ہوا ہے لہذا اس کی تقطیع مفاعیلن مفعولن مفاعیلن فعلن پر ہوگی۔

دل نقاب اٹھی کہ صبح حشر کا منظر کھلا
چپ لگی مجھ کو گناہ عشق ثابت ہو گیا
اشک خوں زرد چہرے اک طرف بہار
رنگ بدلا پھر منہ کا میکشوں دن پھر
بند آنکھیں ہو گئیں بقیاب ہو ہو کر گئے
صحبت و اعظا میں بھی انکڑا بیاں آنکھیں
یا کسی کے حُسنِ عالمتاب کا دفتر کھلا
رنگ چہرہ کا اڑا زرد دل مضطر کھلا
دیکھئے رنگ جنوں کیسا مری مجھ پر کھلا
پھر چلی باد صبا پھر میکیدے کا در کھلا
سامنے پیاسوں کے کس رکھ دیا ساغر کھلا
راز اپنی میکشی کا کیا کہیں کیونکر کھلا

ہاتھ اچھا ہے گریباں میں تو گھبراؤ نہ یا اس

بیریاں کیونکر کھیں زنداں کا در کیونکر کھلا

قیمت ہے شربِ عدہ کا اتنا مختصر ہونا
شبِ تاریک پہلو دبا یا زور روشن کا
تماشا چمن کی کیا حقیقت چشمِ عبرت میں
دل آگاہ نے بیکار میری راہ کھوٹی کی
بہار آتے ہی شادی مرگ ہو جاؤ تو اچھا
دیبا رنجودی ہے اپنے حق میں گوشہ راحت
سا سکتے نہیں الفاظ میں معنی و جدائی
وہی ساتی وہی سا غور ہی نشین وہی باؤ
بالک رام۔ اک سوال یہ ہے کہ اگر دنیا کی تمام اشیاء و جال خداوندی کا منظر ہیں

تو کیا وجہ ہے کہ کفر و ایمان دونوں قائم ہیں۔ کیوں تمام دنیا ہستی باری تعالیٰ کی قابل نہیں ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے مختلف اشیاء کے مختلف طبائع پر علیی و علیہ اثرات ہوں گے۔ ہم آئے دن اس کی مثالیں دیکھتے ہیں ایسے بھی ہیں کہ چلو میں آؤ ہو جائیں اور ایسے بھی بلا نوش ہیں کہ خم کے خم چڑھا جائیں اور انھیں محسوس تک نہ ہو۔ بعضوں کے لئے زہر کا ایک قطرہ قطع حیات کے لئے کافی ہے اور ایسے بھی بند گان خدا ہیں جو سانپوں کو مولیٰ گاجر کی طرح کھا جاتے ہیں۔ ہر ایک پر یکساں اثر ہونا لازم نہیں۔

نگاہ یا اس کا سنگین دل نو پیر کا رگر ہونا
سنا کر تے تھوڑے آنکھوں دیکھیں دیکھنے والے

فلک کا شام سے دست گریباں سحر ہونا
نہے قسمت مریباں پتیر جلوہ گر ہونا
اثر ہونا تو لازم ہے مگر اٹا اثر ہونا
بہت اچھا تھا انجام سفر سے بخیر ہونا
خزاں پہلے ہی بہتر ہے قصہ مختصر ہونا
غنیمت گھڑی بھر تو اغفلت میں بسر ہونا
مگر لازم ہو دل ہی لمیں پوشیدہ اثر ہونا
مگر لازم نہیں ہر ایک پر یکساں اثر ہونا

روشن تمام کعبہ و بت خانہ ہو گیا
گھر گھر جمال یار کا افسانہ ہو گیا

تکنا ہے یار ہر طرف آئینہ خانے میں
دیرو حرم بھی ڈھبہ کو سبب نہیں ہا
زنجیر پھر ہلا دی سیم ہمارے
کل کی ہر بات جوش پہ تھا عالم شباب
کیا جان آج خوابیں کیا دیکھا یاس نے
کیوں چوتھے ہی آپ بیگانہ ہو گیا

قصہ کتاب عمر کا کیا مختصر ہوا؟

ریخ داستانِ غم کا ادھر سے ادھر ہوا

غالب نے تو ہمیں تک کہا ہے موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟
گویا مرنے کے بعد غم سے نجات ہو جائے گی۔ مگر بیگانہ نے یہاں غم جاودانی کی خبر دی
ہے۔ ایسی غمناک ہستیاں بھی ہیں جن کے ریخ غم بعد فنا بھی مٹنے والے نہیں۔ داستانِ غم
کارِ خ یعنی نوعیت غم بدل جائے گی غم کیسے خود قایم رہے گا۔ سڑ مالک رام غالب اور
مومن کا شعر نقل کر کے فرماتے ہیں۔

قید تیا و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں (غالب) موت پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
چھٹ کر کہاں اسی حیرت کی زندگی (مومن) ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے
”ان دونوں بزرگواروں کو اُمید بلکہ یقین ہے کہ حیات چند روزہ کے بعد غم کا
نام و نشان باقی نہ رہے گا۔ لیکن ذوق کو اس امر میں شک ہے ۵

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

انہیں یہ خوف مارے ڈالتا ہے کہ اب تک تو اس امید پر جی رہے ہیں کہ موت کے
ساتھ ان مصیبتوں کا خاتمہ ہے لیکن خدا نخواستہ ایسا نہ ہوا تو پھر ہم کہیں کے نہ رہے۔
مگر یاس کو یقین ہے کہ یہ بند غم اس قید حیات ہی سے وابستہ نہیں کہ موت آتے ہی
ٹوٹ جائے گا۔ انھیں مر کے بھی چین پانے کی امید نہیں۔ لون کے نزدیک موت
پہلے کی زندگی اور اس کے بعد کا زمانہ ایک ورق کے دو صفحے ہیں۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے
کہ ایک صفحہ پر ایک مضمون ہو اور دوسرے پر کچھ اور۔ یہ موت تو ورق الٹنے کے مترادف
ہے۔ یاس کی انتہا ہے۔“

ما تم سراے دہر میں کس کس کو روئے
لے لے درد دل نہ ہوا در دوسر ہوا

آزاد ہو سکا نہ گرفتار شش جہت
دل مفت بندہ ہو س بال پر ہوا

دنیا کے ساتھ دین کی بیگاری؟ الامان
انسان آدمی نہ ہوا جس اور ہوا؟

دیوانے ملاؤں نے مذہب کو اتنا مسخ کر دیا کہ تمدن کے لئے وبال ہو گیا۔ مذہب کی
غرض و غایت تو یہ تھی کہ انسان سکون و امن کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ اپنی عاقبت
بھی سنوارے اور دنیا کے لئے باعث امن و امان ہو۔ مگر افسوس ہے شہنشاہ اکبر سا
نیک نفس و صلح کل انسان بھی مذہب سے نفرت کرنے لگا۔

فردا کو دوسری سے ہمارا سلام ہی
دل اپنا شام ہی سے چراغ سحر ہوا
تماشا ہے مری تصویر کا بیکار ہو جانا
قلم کے زخم کھا کر سپیکر خونبار ہو جانا
نہی مقصد جہاد نفس کو تیار ہو جانا
خوشا ہمت خود اپنے در پہ آزاد ہو جانا

مالک رام۔ اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا اور زیادہ مشکل ہے جب تک ضمیر کے قابو میں نہیں ہوتا۔ روح کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ مگر نفس کے ساتھ جنگ کرنے سے کئی طرح کی جسمانی آسائشوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ اپنی خواہش سے محنت اور عسرت کی زندگی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ بہر حال اگر ایسا کوئی انسان دنیا میں ہے تو ہر طرح داد کا مستحق ہے۔ اس کا مقصد بھی قابل تعریف ہے اور کوشش بھی قابل تعریف۔ دوا کا اور دعا کا امتحان منظر تھا ورنہ بھلے جنگے گوارا تھا کسے بیمار ہو جانا ہے دیوانگی شیم ہوس کے پھیر میں پڑنا ہجوم شوق میں گم گشتہ بازار ہو جانا دنیا کی نظریہ بندیوں کا نقشہ نہیں ہے۔ دنیا میں پھنس کر انسان ایسا گم ہو جاتا ہے کہ اپنی خبر نہیں رہتی۔

قیامت آتے آتے کوس روشن نہیں کئے عبت ہی ہر کاب کا فرو دیندا ہو جانا مختلف مذاہب نے اپنے اپنے لئے جدا جدا میں اختیار کر رکھی ہیں شوق منزل میں حیران و سرگشتہ ہیں تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ وہ کالے کوس ہیں جو قیامت تک روشن نہ ہو سکیں گے خواہ کوئی کافروں کا ہمسفر ہو یا دینداروں کا۔

بہت میں ٹھولا جادہ شیخ و برہمن کو کوئی آسان ہونا ہموار کا ہموار ہو جانا تصور کبھی خواہ اہل کے کا کا اٹھنا کبھی تعبیر سنکر جان سے بیزار ہو جانا عجب کیا بھول جا طائر خواہ اشیاں اپنا شب غم دور کیا ہوا راہ کا دشوار ہو جانا پیش پا افتادہ باتوں کو سیدھے ساٹ لفظوں میں کہو تو وہ معمولی بات ہوگی مگر ندرت بیان سے اسی بات میں تازہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب تو بس اتنا ہے کہ انسان بچے

اے اگر کیا معنی ہا کیا میرا صاحب نے ایسا پسندی کا عملی طور پر ثبوت نہیں دیا ؟

حب اندوہ و قلق کا غلبہ ہوتا ہے تو نیند اڑ جاتی ہے۔ شاعر اسی بات کو اچھوتے پیرایہ میں بیان کرتا ہے کہ عجب نہیں شب غم کی اس ہولناک تاریکی میں طائر خواب (یعنی نیند) اپنا آشیانہ بھول جائے۔ طائر خواب کا آشیانہ کیا ہے وہی آنکھیں۔ اندھیرے میں طائر خواب بھٹکتا پھرتا ہے اپنے آشیانے کا پتا نہیں پاتا۔

لو کا گھونٹ بھی فصل نہ نہیں مل سکتا قیامت ہے گلوں کا ہزار خانہ ہو جانا خزاں میں پانی کا قطرہ تو کیا پھولوں کو اپنے لہو کا گھونٹ تک نصیب نہیں ہوتا۔ بدن میں خون کا نام نہیں رہا تو خون کا گھونٹ کیا پیتے ؟ کانٹوں کی طرح پھول بھی سوکھی ہوئی زبان بن گئی۔

کوئی طوفان آیا یا ہمارے کان بجتے ہیں ؟ ذراے بند گان ناخدا ہشیار ہو جانا بقول پروفیسر مجنوں میرزا بیگانہ ہمیں زندگی کا جبروتی رخ دکھاتے ہیں یہ ہیں قدرت کے آثار جلال !

عجب کیا ہی ہم ایسے گرم رفتار کی ٹھوکر سے زمانہ کے بلند و پسیت کا ہموار ہو جانا زمانہ بڑے بڑوں کو اپنی راہ پر کھینچ لاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسی شخصیتیں بھی نمودار ہوتی ہیں جو زمانے کے بلند و پسیت کو اپنی ٹھوکر سے برابر کر دیتی ہیں۔

مبارک بواہوس کو یاس آنکھیں کچھ پھرنا کسی کی دیکھا دیکھی تشنہ دیدار ہو جانا سلسلہ چھڑ گیا جب یاس کے افسانے کا

شمع گل ہو گئی دل کچھ گیا پروانے کا

مطلع سننے ہی محفل کا یہ حال دیکھا گیا ہے جیسے بارود خانے میں کسی نے آگ لگا دی

حسدوں کے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں دل مجھ کر رہ گئے۔

عشق سے دل کو ملا آئینہ خاک کا شرف جگمگا اٹھا کنول اپنی سیہ خانے کا

خلوتِ ناز کجا اور کجا اہلِ ہوس زور کیا چل سکے فانوس پروانے کا

لاشِ کمبخت کی کعبہ میں کوئی کھپکھوانے کو چہ یار میں کیوں ڈھیر ہو بیگانے کا

وائے حسرت کہ تعلق نہ ہوا دل کو کہیں نہ تو کعبہ کا ہوا میں نہ عنمنی نے کا

تشہ لب ساتھ چلے شوق میں سیاه کی طرح رُخ کیا ابر بہاری نے جو مینا نے کا

واہ کس ناز سے آتا ہوتا دورِ شباب جس طرح دور چلے نرم میں پیانے کا

دیکھ کر آئینے میں چاک گریباں کی بہار اور بگڑا ہے مزاج آپ کے دیوانے کا

آئینے میں چاک گریباں کی بہار دیکھ کر اک دیوانہ عاشق مزاج کی کیفیت نفسی

کا کیا خوب موقع پیش کیا ہے۔ خون بہا ہے بہت آپ کے دیوانے کا

کیا عجیب جو حسینوں کی نظر لگ جائے عشاق بھی اپنی ذات میں جو ہر سن رکھتے ہیں۔ اونھیں بھی حسینوں کی نظر لگ

جاتی ہے۔ تعلقاتِ حسن و عشق کا کتنا صحیح مطالعہ کیا ہے۔

آپ اب شمعِ سحرِ بے بعد کے گلے ملتی ہے بخت جاگا ہے بڑی دیر میں بڑانے کا

صبح کو شمع جب بڑھنے لگتی ہے (بچھنے لگتی ہے) تو شعلہ شمع خود بڑھ کر دپاؤں سے

۱۵ ڈھیر معنی ہزار سہ بیویاں اتنا سہا شعرا نے شور کیسیکوسیر نہ ہوا

گلے ملتا ہے۔ گویا شمع چلتے چلتے گلے مل کر رخصت ہوتی ہے یہ گویا پروانوں کی بیداری
بخت کی دلیل ہے۔ مگر پروانوں کے نصیب جاگے بھی تو کب جب چل چلاؤ کا دقت
تھا شمع پروانہ کے پردے میں انسانی حسن و عشق کے معاملات پر روشنی ڈالی
گئی ہے۔

نرم میں صبح ہوئی چھپا گیا اک سناٹا

سلسلہ چھپ گیا جب یاس کے لہاٹا

کعبہ مقصودِ خلوت خانہ دل ہو گیا جلوہ موہوم آخر خضر منزل ہو گیا

عشق سے آئینہ دار کے جوہر کھلے خانہ دل شاہد معنی کی منزل ہو گیا

دشتِ آباد جہاں کی دلفری دیکھئے سیکڑوں آزاد باند سلاسل ہو گیا

خاتمہ قدرت کی صنعت آپ اپنی مثال اعتبار خوب رشت آنکھوں کو مشکل ہو گیا

اس طلسماتِ عناصر کی حقیقت کھل گئی جب گرہے میں گور کے انسان اہل ہو گیا

تم سہ اس رنج دینے پر جس مادہ ہوئے میں سراپا در دہنے کیلئے دل ہو گیا

دور آخر میں نہیں کوئی کسی کا آشنا دیکھتے ہی دیکھتے کیا رنگ مٹھل ہو گیا

یاس اب تنگ آگئے اس بلکھی پوشاک جائے تن دھجیاں لینے کے قابل ہو گیا

اب چین نہ ہکا روں کو دم بھر نہیں ملتا پیاسے ہیں اور آبِ دم خنجر نہیں ملتا

خنجر اٹھیں ملتا ہے تو ہم کو نہیں پاتے جب ہم کو وہ پاتے ہیں تو خنجر نہیں ملتا

۱۵ سیکڑوں آزاد پابند ہو گیا۔ عین روز مرہ ہے۔ اہل زبان بعض اوقات
واحد بول کر جمع مراد لیتے ہیں۔

آرام سے سونے کی جگہ ہے تو کد ہے
دنیا میں تو راحت کا کوئی گھر نہیں ملتا
کسریٰ کا محل بھی ہے ہیں قبر سے بدتر
آرام کہیں گھر کے برابر نہیں ملتا
کیوں نقش قدم دیکھ کے کھاتے ہو کچھارے
کیا قافلے سے کوئی بچ کر نہیں ملتا
کچھ دل کی لگی اور بھڑک جاتی ہر ساقی
منا بھی ہے آگ عام تو بھر کر نہیں ملتا
کیوں یا بے یونہی دور سے منہ کھتے رہو گے
بے مانگے تو اس بزم میں ساغر نہیں ملتا
(مثالث)

امید و بیم میں کسے تو کیا مزہ شباب کا
ہواے دہر دیتی ہے پیما انقلاب کا
اٹھ جائے ناگہاں ورق مری کتاب کا
کیسی کیا مجال ہے جو چرخ پیر سڑے
رندھا ہوا ہے چار سمت بادل انقلاب کا
نہ بند کی کچھ خبر نہ کچھ خبر کا مبتدا
دل شکستہ گم ہوا تو بھر کہاں کا سلسلہ؟
یہی ورق نکل گیا تو مول کیا کتاب کا؟
ننگا تشنہ کام میں حرام بھی حلال ہے
نہ کوئی امر ممنوع نہ کوئی شے محال ہے
فریب مجھ سے پوچھئے کر شتمہ سراب کا
پکارتے کا ہے پکارتا ہوں بار بار
جواب با صواب یا جواب بے صواب کا

واے نادانی کہ داری گوش دیوار ما
اہل دل رازے ما آئینہ اسرار ما
چشم پوشی شیوہ ماجیلہ جوئی تا کجاہ
ایکہ باشی غائبانہ درپے آزار ما
پیش پا افتادہ بینی صد بلند و پست
بہرہ یابی اگر نشتر سپدار ما
ہر سکون مضطرب آئینہ صد انقلاب
تاسخ محو تماشادیدہ بیدار ما
کیست ازیں ہر دو کہ بکشا بدکار معرفت
تاہ چشم مانیر زد جز متاع بخودی
دوستان زندہ دل را خندہ بر لب سختی
زخم عبرت خوردہ ایم از دست نقاش اہل
ہر کس از بزم لیگانہ دست بردل میرود
خوش را بیگانہ سازد محرم اسرار ما

منکہ بر بنی تا بم درو ز سینن تنہا

صبح دم چسپاں منیم شمع انجمن تنہا

شام و سحر کے مناظر انقلاب بادی النظر میں کتنے پیش پا افتادہ معلوم ہوتے
ہیں مگر ادنیٰ سے ادنیٰ تغیر و انقلاب شاعر کی دُور بین نگاہوں اور اس کے درد مند
دل میں تلاطم برپا کرتے رہتے ہیں۔
تنہائی و کس میری کی زندگی جیسی تاریک وشت انگیز ہوتی ہے۔ حقیقت
تلخ کو شاعر سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ صبح کو جب بھری محفل خالی ہو جاتی ہے

تو وہ شمع سحری کی کس میرسی در در تنہائی کا مشاہدہ کر کے بقیاب ہو جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ جب میں خود در در تنہائی کی تاب نہیں لاسکتا تو شمع انجمن کی تنہائی و کس میرسی کا نظارہ کن آنکھوں سے کروں۔

یہاں شمع سحری کے پردے میں انسان کی دردناک زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ ذرا نظر کو وسعت دے کر صاحبان جاہ و جلال کی حالت کا تصور کر دو جو اپنے زمانہ عروج و اقبال میں زمین صد انجمن تھے۔ مگر اب انقلاب دہرائے انہیں ایسی کس میرسی میں مبتلا کر دیا ہے کہ ان کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔ یہاں اس نفسیاتی حقیقت پر بھی نظر کر لینا چاہیے کہ وہ بد نصیب جو تمام عمر لذت عیش و کامرانی سے آشنا نہیں ہوئے۔ ان کے لئے گردش روزگار اتنی ناقابل برداشت نہیں ہوتی جتنی ان لوگوں کے لئے جو عیش و راحت کے فرے سے آشنا ہو کر اچانک گرفتار مصیبت ہو گئے ہوں۔ مگر وہ جو ہمیشہ مصیبت ہی میں زندگی بسر کرتے رہے ہوں در در تنہائی سے ایسے متاثر نہیں ہو سکتے جیسے صاحبان جاہ و جلال۔

”ناکیا امال یا بید از ہجوم جانبازان گوشہ گیر فانوس سے بہر سو خفق تنہا شمع پر پردوں کا ہجوم۔ فانوس سے پردوں کا سہہ بکرا نا اور جذبہ شوق میں منزل فانوس سے گزر کر شعلہ شمع تک پہنچ جانا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ مگر شاعر اس نظارہ میں حیات انسانی کے ایک پہلو یعنی کشتش حُسن کا مطالعہ کرتا اور ایک عجیب و غریب نتیجہ نکالتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا اور دکھاتا ہے کہ حُسن کی دیوی (شمع) اپنے جانباز عاشقوں کے جذبہ شوق کا عالم دیکھ کر پیپ چاپ

گوشہ فانوس میں تنہا جل بجھنے کے لئے پناہ لیتی ہے کہ کوچہ گزرنا ہے اسی پر گزرتا اُس کے شعلہ حُسن سے اس کے جانبازوں پر کوئی آئینہ آئے۔ مگر اللہ رکھا کشتش حُسن، اللہ سے جذبہ شوق کہ گوشہ فانوس میں بھی جانباز پردائے اُسے پناہ نہیں لے کر دیتے خود بھی اُس کی آگ میں کود پڑتے ہیں تنہا جلنے نہیں دیتے۔ دیکھئے ان محسوسات کو خاعر نے کس جوش و خروش سے بیان کیا ہے۔ پردوں کے لئے جانباز اور شمع کے لئے گوشہ گیر فانوس کے سے اچھوٹے الفاظ لاکر کلام میں کتنی تازگی پیدا کر دی ہے اور شمع و پردہ کے پردے میں انسانی حُسن و عشق کی ذہنیت پر کیا خوب روشنی ڈالی ہے سبحان اللہ۔

ذوق مینوال دانست رنگِ حُسنِ نادید ہست شاہدِ عادل بچے پیرا من تنہا حُسنِ نادیدہ یعنی شاہدِ مطلق کی حقیقت کا اندازہ اگر ہو سکتا ہے تو ذوق و ادراک ہی کی دسالت سے اس مقام پر ساری منطق سارا فلسفہ گنگ نظر آتا ہے۔

ہر گلے دہر خالے فتنہ ہا بر انگیزد الحذر دل حیراں صد بہار و من تنہا شاہدِ فطرت کی دل آویز ہنگامہ آرائیوں کا نقشہ کہیں میں مصنف کے قلم نے کمال دکھایا ہے۔

چغستانِ فطرت کا گل کیا خار بھی وہ دل آویز بیاں رکھتا ہے کہ دیدہ بینا جو حیرت اہل جلتے ہیں۔ ان آیاتِ فطرت کی ہنگامہ خیزوں سے گھبرا کر شاعر بکا پاٹھتا ہے۔ ”الحذر دل حیراں صد بہار و من تنہا“

طرفہ محشر سے دار و از فریبِ فرجائے زندہ زیر پیرا من مردہ در کفن تنہا

ایکے کارہا کر دی مدفن جہا کن
تباہ کے ہنلا دار وحیب میں کفن تنہا
چارہ پشیمانی خوشدلی و خوش کامی
تو بہ از ریا کاراں خندہ از من تنہا

افسوس ہے اس شعر سے مصنف کی شخصی زندگی کے برخلاف اہل مغرب کی صورت حال کی تائید ہوتی ہے یعنی تو بہ و استغفار ریا کاروں کا شیوہ ہے۔ چند روزہ زندگی ہنستے کھیلے گزار دینا اور کلفت پشیمانی کو ہنسی میں اڑا دینا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ مکافات عمل کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا چاہیے۔ مگر فی الحقیقت یہ کوئی سچا فلسفہ نہیں ہے بلکہ دل کو جھوٹی تسلی دینا ہے۔ مصنف کا شخصی طرز زندگی اس شعر کی تائید نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ شاعر کبھی آپ بیتی لکھتا ہے کبھی جگ بیتی اس کے بعض اشعار خود اس کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں اور بعض اشعار دوسروں کی زندگی۔ دوسروں کے معمولات و معتقدات کا منظر ہوتے ہیں۔ جذبہ پشیمانی اک ایسی حقیقت ہے جسے ہنسی میں اڑا دینا اہل بصیرت سے ممکن نہیں۔ چنانچہ خود مرزا صاحب کا اک اور شعر

سہو و خطا و اجبت فطرت ہی مگر
سجھاؤں کیا ضمیر ملامت شعار کو
اس بات کی روشن دلیل ہے کہ وہ مکافات عمل سے چشم پوشی کرتے اور جذبہ پشیمانی کو ہنسی میں اڑا دینے کے قابل نہیں ہیں۔

رہبران خود گم را جز دعا چہ فرمایم
پاشگستہ و حیران ماندہ در وطن تنہا
کمانگر بس کے ترک و آلات کا طوفان بے تمیزی اور لیڈران خود گم کی ہنگامہ کرائی
ابھی بھولی نہ ہوگی۔ گمراہ لیڈروں کے فریب میں آکر کتنے نا عاقبت اندیش منچلے

بند و تان سے ہجرت کر کے افغانستان ترکستان وغیرہ کی طرف سر بسجرا ہو گئے
اور بعض تو ایسے احمق تھے کہ اپنے گھروں کو آگ لگا کر اپنی بیویوں کو طلاقیں دے
دیگر نکل کھڑے ہوئے۔ رہبران خود گم نے علی الرغم برطانیہ ان سب حافطوں کا
دباں اپنے سر لیا۔ اس وقت بعض مصلحت اندیش بھی خواہان وطن نے ان لیڈروں
کے خلاف کچھ آواز بلند کی تو ان پر الٹی لے دے ہوئے لگی۔ بھلا انکار خانے میں
توٹی کی آواز کون سنتا؟ غالباً انھیں واقعات و حوادث سے متاثر ہو کر شاعر نے یہ
درد انگیز صدا بلند کی جز دعا یہ فرمایم۔

نا خدا ز من گنہ رسوے دیگر اں بنگر
کار من بہ دریا در دست یازدن تنہا
اٹھارہویں صدی کا قیول آج بیکانہ پر صادق آرہا ہے۔

In spite of adverse circumstances he fought
his life long battle with the utmost conviction
and did conquer. His works & life will testify
in what deep waters he had waded & swum
struggling for his mission."

اک حقیقی شاعر فی الحقیقت کتنی زبردست طاقت کا سرچشمہ ہے۔ یہ وہ شعر
ہے جس میں میرزا بیگانہ کے مہیج کیر کیڑا ان کی شان خود داری و خود اعتمادی۔
ان کے جذبہ ایشیاء و ہمدردی۔ حریت و آزادی کا مطالعہ کر کے انسان اپنی اصلاح
کرنا اور سستی سے بلندی کی طرف پرواز کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ فرماتے ہیں ناخدا

میرے پاس سے ہٹ جا۔

دوسروں کی خبر لے چھوڑ دے ساتھ میرا۔ میں تنہا دریا کے موج و گرداب میں اُتھ پاؤں مارتا ہوا پار ہو جاؤں گا۔ سبحان اللہ کیا شان بے نیازی خود داری ہے۔ یہی وہ آرٹ ہے جو ملک و ملت، تمدن و تہذیب پر گہرا اثر ڈالتا اور سرائیوار ثابت ہوتا ہے۔ جس کا صحیح مطالعہ کیا جائے عملی سبق لیا جائے تو فقط شخصی زندگی میں نہیں اجتماعی زندگی میں بھی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔

میرزا یگانہ کا موضوع سخن فلسفہ نفسیات و وجدانیات اور فہرۃ زندگی کے واقعات سے متعلق ہے اس وجہ سے ہر زمانے ہر دور میں زندہ رہنے والی چیز ہے۔ آپ کا موضوع شاعری کسی خاص زمانے کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں ہے بلکہ عالمگیر اور Universal ہے اور انداز بیان میں خدا داد کوشش قدرت اور خیریت کلاری ہے اس وجہ سے اس آرٹ کی فائز ممکن نہیں۔ یہ فہم جان نواز ہر دور میں قوم کی ذہنیت اور ملک کی تمدن و تہذیب پر مصلحانہ اثر ڈالتا رہے گا۔ آپ کے کلام میں زبردست انقلابی طاقت اور کشش ہے۔ مگر چونکہ ابھی تک اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں نہیں ہو سکا نہ ملک میں صحیح قوت مطالعہ پیدا ہو سکی۔ بلکہ حق گوئی و حریت پسندی کے جرم میں میرزا یگانہ کے خلاف سارے ملک میں شدید جذبہ مخالفت پیدا ہوتا اور بڑھتا گیا اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندوستان اور ایران کی تاریخ میں ایسا کوئی سخنور نہیں گزرا جس کے خلاف اتنی شدید اور مخالفت برپا ہوئی ہو ان سب وجوہ سے یگانہ آرٹ طاق نسایاں پر رکھ دیا گیا۔ خیر ہونے ہی -

ذریعہ شہر میں میرزا صاحب نے اپنے جذبہ غیرت و خود داری کی ترجمانی میں جو کمال دکھایا ہے اس کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ آپ کے طرز زندگی کا مطالعہ کیا جائے فلسفہ خودی کا درس تو بہت عام ہو چکا ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ برد فیسروں کا درس خودی محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے میرزا یگانہ کا فلسفہ خودی محض کلام ہی تک محدود نہیں ہے۔ آپ کی علمی زندگی سے قدم قدم پر اس کا ثبوت ملتا رہا ہے۔

یہ احساس خودی یہ شیوہ خود داری کتابوں کی ورق گردانی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اندرونی و داخلی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر برد فیسروں کا فلسفہ خودی مطالعہ کتب اور علمی الکتاب کا نتیجہ ہے جو محض نظری حیثیت رکھتا ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

میرزا یگانہ کو زندگی میں قدم قدم پر امتحان کا موقع ملتا رہا ہے اور ملوث نفس کا امتحان تلخوں ہی میں ہوتا ہے۔
Virtue and wisdom
are increased by adversity."

صدر رفیق و صدمہ ہر شکستہ و دلنگ

داور انہی ز میس د بال و پر بہ من تنہا

سخنور علی الاطلاق مجسمہ ہے درد محبت۔ جذبہ حریت اور شرف انسانیت کا وہ اپنے خلقی سوز و گداز سے مغلوب ہو کر انسان کیا حیوان کیا خدا کی مخلوق پر محبت کی نظر ڈالتا ہے۔ بندگان دنیا کا تو یہ حال ہے کہ وہ اپنی نفسانیت و

خود غرضی کی دھن میں خلق خدا کو کچل ڈالنے یا بندہ بنا لینے پر تیلے رہتے ہیں مگر شاعر وہ مقدس ہستی ہے جو دوسروں کی حالت زار دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے۔ ایسا درد مند دل اپنے رفیقوں اپنے دوستوں کو کن آنکھوں سے بے دست و پا دیکھ سکتا ہے۔ دوستوں کو مجبور و بے دست و پا دیکھ کر بارگاہِ ایزدی سے خطاب کرتا ہے۔

داور انہی زمیں بال و پر بہ من تنہا

ہندوستان کی ادبی دنیا میں بیسویں صدی کا سخنور علی الاطلاق تنہا شاعر آرٹسٹ اور *genius* میرزا یگانہ کے سوا کوئی دوسرا کھڑا نہیں سکتا۔ یہ وہ سخنور ہے جو میدانِ ادب میں کسی سیاسی یا مذہبی جماعت، کسان یا مزدور، جنس لطیف یا جنس کثیف کا نمائندہ نہیں فقط انسان کی نمائندگی کرتا ہے جس کا کمال آفتاب کی طرح روشن ہے کوئی دیکھے نہ دیکھے۔

سبحان اللہ کتنا پاک اور شریفانہ جذبہ ہے۔ جنابِ احدیت میں عرض کرتا ہے کہ میں کن آنکھوں سے دوسروں کو پرستگستہ و دلتنگ دیکھوں اور خود آزادی کے مزے اٹھاؤں۔ اس التجا سے دو معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نولے جس طرح مجھے بال و پر کرامت فرمائے ہیں میرے رفیقوں کو بھی عطا کر۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو میرے بال و پر بھی چھین لے مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ میں تو آزاد و ہول اور میرے رفیق مجبور و شکستہ حال۔ یہ وہ جذبہ شرافت ہے جو فقط شاعر ہی کے لئے نہیں۔ تمام لے جوش بھی اس دور کا *genius* ہے مگر عطا کا اور فن شعر میں ناقص۔ کلام میں دھوم دھام تو بہت مگر خصوص بہت کم کہیں تو سچا اور کہیں بوجس۔

دنیا سے انسانیت کے لئے مایہ افشا رہے۔ اللہ اللہ ہمد دی و اخوت کی ایسی دل ہلا دینے والی صداؤں سے بھی ہندوستان کی روح بیدار نہیں ہوتی۔

ربند رناتھ میگور نے شوقِ عبودیت کا ایسا ترانہ چھیڑا کہ فضا سے عالم میں دھوم مچ گئی۔ مگر غور سے دیکھو تو ان کی شاعری کی مایہ و بیضاغت اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ایک ایسی ہستی کے سامنے (جو حد تصور سے بھی پرے ہے) سر جھکائے کھڑا ہے۔ اس کے حق مطلق کو جو جس داور اک سے بالا تر ہے۔ تنگی یا بندھے دیکھتا رہے۔ ظاہر ہے کہ انسان اس پیکرِ خاکی کے ساتھ میگور کے منہائے نظر تک پہنچ نہیں سکتا۔ ان کی شاعری محض *Ideal* ہے غایتِ آفرینش یہ نہیں کہ انسان ایک اور اے خیال ہستی کا تصور باندھے بیٹھا ہے بلکہ یہ مقصد ہے کہ اپنے جذبہ اخوت و ہمدردی سے دنیا کے تمدن و تہذیب کو خوشگوار بنائے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ انسان خدا کی ہستی کو دھیان میں نہ لائے بلکہ یہ مطلب ہے کہ شاعر کو اپنے قول و فعل سے وہ سبق دینا چاہئے جو علیٰ زندگی میں اصلاح و اعتدال پیدا کر کے تمدن کو ترقی دے سکے اور یہ سبق اخوت و ہمدردی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

شاعرِ نبیت و ہمدردی۔ اخوت و آزادی کا حامی ہے۔ خود آواز اور سنا اور دوسروں کو بھی آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ میرزا یگانہ نے ایک حد تک اپنے محدود دائرہ عمل میں یہ کر دکھا یا خود بھی آزاد رہے اور دوسروں کو بھی رنجیرِ تقلید سے آزاد کرادیا۔ آپ کے بعد جو لوگ میدان میں آئے مثلاً فانی، جوش، جگر، سیاب وغیرہ یہ سب کے سب آزاد ہو گئے۔ یہ کیا تھا؟ یہ نتیجہ تھا میرزا صاحب کی مستقل

مجاہدانہ ادبی زندگی کا اور چراغ سخن (۱۹۱۵ء) کے اس مقالے کا جس میں میرزا صاحب نے اہل زبان و زبان داں کا فرق فلسفیانہ انداز سے دکھایا ہے جسے دیکھ کر اردو بولنے والے ہوش میں آئے۔ خود کو کچھ سمجھنے لگے اور دینی و لکھنؤ کی تقلید سے آزاد ہو گئے۔ اور بہتر سے آزادی کی بے جا ہوس میں گمراہ ہو گئے۔ تقلید سے آزاد ہونا برکت ہے مگر زبان و فن کے تمام اصول و ضوابط سے بے پروا ہو کر بذلتی پھیلا دینا گمراہی ہے غدا آری ہے۔ میرزا یگانہ کی یہ جنگ آزادی تو اک محدود دائرے میں رہی مگر قوم میں فکر و عمل کی آزادی کا پیدا ہونا آرٹ کے صحیح مطالعہ پر حسن نیت پر اور آئندہ زمانے کی مساعدا پر موقوف ہے۔

نکتہ داں خود سازم میرزا یگانہ را
دل نخی تو اوں برداشت لذت سخن تنہا
لذت زندگی مبارک باد
کل کی کیا فکر ہر جہ بادا باد
اے خوشا زندگی کہ پہلو شوق
دوست کے قدم سے ہے آباد
وہ شعر کبھی نہیں فنا ہو سکتا جو زندگی کی کسوٹی پر سچا ثابت ہو۔

"Nothing can please many and please long
but just representations of life."

بندہ عشق آہ کیا جانے
دل سلامت درد دل نہ سہی
کے کہتے ہیں بندہ آزاد؟
درد جاتا رہا کہ درد کی یاد؟
مڑ کے دیکھنا آئینا کی طرف
خون ہو ہو کے دلیں رہ گئی یاد

کشش لکھنؤ سے تو بہ
چار دن شاد چار دن ناشاد
پھر وہی ہم وہی امین آباد
زیست کے ہیں یہی مزے والے
چار دن شاد چار دن ناشاد۔ انسانی زندگی کی سچی تعریف اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی بشر ضرب المثل ہو گیا۔
"He has the peculiar power
to astonish by universal truths."

کون دیتا ہے دادِ ناکامی؟
خون فرما دے ہر فرد
ایک وہ تھے جو جنگ آزادی میں کامیاب ہوئے اور محب وطن کہلائے اور
ایک وہ تھے جو اسی مقصد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر ناکام رہے اپنے ہی وطن
میں اٹے باغی ٹھہراے گئے۔ خون فرما دے ہر فرد!

صبر اتنا نہ کر کہ دشمن پر
تسلیم ہو جاوے لذت بیداد
ظالم کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ مظلوم کو تمللاتا ترپتا دیکھ کر اسے لذت حاصل ہو
مظلوم نے ظلم کے جواب میں سناٹا کھینچا، آف تنک نہ کی تو ظالم کا مقصد ہی فوت ہو گیا
سارا خزا کر گیا۔ نفسیاتی اعتبار سے ظالم کو ایذا پہنچانے کے لئے صبر سخت ترین فرحت
ہے۔ مگر شاعر کہتا ہے کہ اتنا صبر کرنا دشمن کو اتنی ایذا پہنچانا مناسب نہیں۔ دشمن کا
بھی کچھ پاس خاطر چاہیے۔ اس سے ثابت ہے کہ شاعر کا اخلاقی سطح نظر کتنا بلند کتنا
پاکیزہ ہے۔ شاید ہی کوئی لٹریچر اس ادبی شاہکار کا جواب پیش کر سکے۔ دیکھا آپ نے
اردو کی غزل گوئی یا مختصر نویسی کا آرٹ کس کس بلند سی عظمت کو پہنچ گیا ہے۔

اضطرابِ بال پر پروانہ وارم دادہ اند
جے دل یک شعلہ بساختیام دادہ اند

۱۲۱۵ء کتاب میں شاعر کا مقصود سمجھانے کے لئے جو اشارات دیے ہیں وہ شعرا کیلئے نہیں بلکہ طلباء اور

کیا بے قراری و بے اختیاری کا عالم ہے۔ دل کیا ہے ایک شعلہ ہے بے اختیار۔
 تشنہ موج سرالحم پاچلاں میروم منزل سوہم و پائے بیقرارم دادہ اند
 می دہد ہر منزل نو شوق پروازِ دیگر درپے غمقا فریب خوشگوارم دادہ اند
 شوق پرواز کسی منزل پہ ٹھہرنے ہی نہیں دیتا۔ قریب خوشگوار آگے بڑھائے لئے
 جاتا ہے۔

گوش نام محرم نیز دہ جز صد آواز گشت صد جواب التجا بیگانہ دارم دادہ اند
 گوش نام محرم اس قابل کہاں کہ اسے کوئی جواب یا صواب دیا جائے۔ ہاں
 ایک بیگانہ وار جواب صد اے باز گشت کی صورت سے مل جاتا ہے۔
 از قضاے عالم بالافتادہ سرنگوں سوئے پستی لغزش بے اختیارم دادہ اند
 اپنا وجود ہو یا عدم کوئی بات اپنے بس کی نہیں۔

خویش را بہر تماشا در میانِ دزدیدہ آم جابے خوش در پہلو گل سمجھا م دادہ اند
 پھولوں کے پاس ہمیں بھی اک جگہ مل گئی کانٹوں کی طرح۔ خیر فطرۃ کا یہی

انتظام ہے تو کیا چارہ؟
 مردہ لکین بیکانہ کے نصیب میں شود یک پیما زیر لب بیکانہ وارم دادہ اند

وہ جوانی کی موج وہ منجھدھار خیر۔ نیت بخیر۔ بڑا پار

اللہ کشتی حیات اپنی جا رہی تھی دھارے پر۔ سنگ دل تماشائی ہنستے تھے
 کنارے پر۔ مگر خیر۔ نیت بخیر تھی۔ بڑا پار لگ گیا۔ یہ وہ زندگی تھی جو اپنے نیک مقصد

میں کامیاب ہوئی۔ جوانی کے زور و شور کو منجھدھار سے تعبیر کرنا کتنا سچا شاعرانہ احساس
 کتنا نادر تخیل ہے۔ *Favour is not always gained by good actions or laudible qualities. Carresses and preferments are often bestowed on the auxiliaries of vice, the procurers of pleasure or the flatterers of vanity.*

آپ کیا جانیں مجھ پہ کیا گزری صدمہ دیکھ کر گلوں کا نکھار
 حُسنِ ابتک ہے خوابِ غفلت میں دیکھے کس ہوا سے ہو بیدار

بعض اوقات ایسے واردات و مشاہدات کا سامنا ہو جاتا ہے کہ دل بے اختیار
 سجدے میں جھک جاتا ہے اور یہی ہے سچی عبادت جو اپنے بس کی بات نہیں۔ آپ
 کیا جانیں مجھ پہ کیا گزری۔

سو نہ دیکھ کر چھوڑ دو حسینوں کو نہ بنانا کبھی گلے کا ہار
 یہاں سو نہ دیکھ کر چھوڑ دو لغوی معنی میں نہیں اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے
 یعنی الگ تھلگ کی ملاقات۔ وفا کی امید پر حسینوں کو گلے کا ہار بنالینا نادانی ہے۔
"Hope, thou bold taster of delight, who whilst thou should'st but taste, devour'st it quite."

لہ وقت جس کا کچھ حسینوں میں کوئی مردانہ کام کیسا کرتا
 مجھ سے معنی شناس پر جاوہ حسن صورت حرام کیسا کرتا

مفہوم واحد ہے مگر اردو میں نہایت برجستہ نزاکت سے ادا ہو گیا ہے۔ برخلاف اس کے انگریزی میں بھدے پن کے سوا کوئی شعریت پیدا نہ ہو سکی۔

اپنے ہی ہمایہ سے بھڑکتے ہوئے ایسی وحشت یہ کیوں نہ آئے پیار؟
حُسن کی ذہنیت کا کتنا صیح نقشہ کس سادگی سے کھینچ دیا ہے۔

تو بھی جی اور مجھے بھی جینے دے جیسے آباد، گل سے پہلو خارا!
یہی توفیقِ رداداری رفتارِ زندگی کو ہوار و خوشگوار بناتی ہے جس طرح خار کا پہلو گلوں سے آباد ہے۔

خطبہ مذہب ہو خواہ تھکے کفر جس سے پایا اسی کے سرے مارا
واہ رے خطبہ مذہب۔ ڈاڑھی منڈانا گناہ۔ کھانا کھانے۔ حمام کرنے اور معمولی
فطری مطابقت کے لئے استخارہ کرنا آخر یہ سب کیا ہے۔ مذہب ہے کہ خطبہ مذہب؟
منہ جو تکتی ہو مرگ دشمن کا ایسی تلوار پر خدا کی مار
شعر ہے کہ آواز غیب؟ معلوم ہوتا ہے کوئی آسمانی فرشتہ جذبہ انتقام کو
بھڑکار رہا ہے۔ خدا کی مار ایسی تلوار پر جو مرگ دشمن کی منتظر ہو۔ نکل نہیں پڑتی یہی
زندگی کا کس بل جو یگانہ کا خصوصی جوہر ہے۔
"The vital force is the chief thing in his art. It has all been as if molten in the hottest furnace of his soul."

ہائے یہ ہلکی ہلکی باتیں کیوں کیا کوئی بھنگ چڑھ گئی سرکار؟

مذہب کو خطبہ مذہب بتا رہے ہو۔ آخر یہ کیا ہے سرکار؟
جاگتا خواب دیکھئے کبتنگ چشم اُمید پر خدا کی سنوار

جاگتا خواب بھی کیا مضحکہ انگیز حقیقت ہے۔ وہی فریب اُمید۔ وہی شیخ چلی کے منصوبے۔ یگانہ سے پہلے جاگتا خواب کسی کی زبان سے سننے میں نہیں آیا۔

بے نیازی بھلی کہ بے ادبی؟ لڑکھڑاتی زبان سے شکوہ یار؟
بے ادبی پر کمر باندھی تو سہی مگر بن نہ پڑی۔ شکوہ کرنا چاہا مگر زبان لڑکھڑانے لگی۔ ایسی بے ادبی سے تو بے نیازی اچھی۔

بندگی کا ثبوت دلوں کیونکر؟ اس سے بہتر ہے کچے انکار
کافر ٹھہرانے کے لئے کوئی بہانہ پیدا نہ کر سکے تو بدیہی امر (بندگی) کا ثبوت
طلب کیا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ بندگی سے انکار کر دیا جائے۔
یہ بے یگانہ کی انفرادیت۔

عشق ہی عین زندگی تو نہیں ہاں مگر زندگی کا آلہ کار
عشق کو عین زندگی سمجھنا غلط ہے۔ فریب نفس ہے۔

Love is only one of the many passions; it has indeed a great influence on life, but it is not the sum total of life.

زندگی نے کیسی کروٹ لی آئی کانوں میں کونسی جھنکار
کون سی جھنکار؟ یہ اس بڑی کی جھنکار ہے جو دنیا دار کے پاؤں میں پڑ جاتی ہے اور زندگی نئی کروٹ لیتی ہے۔

ایسے دو دل بھی کم ملے ہونگے نہ کشاکش ہوئی نہ جیت نہ ہار
نہ کورٹ شپ ہوئی نہ ایک نے دوسرے کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ نگاہیں چار
ہوتے ہی دونوں ایک ہو گئے۔ نہ کوئی جیتا نہ ہارا۔ یہاں لفظ کشاکش کی معنوی

وسعت و نزاکت غور کرنے کی چیز ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں کتنے معنوی حقائق بھرے ہیں۔ اس پر بھی شعرا تناسا دہ سبحان اللہ۔
بن پڑے تو یگانہ بن کر دیکھ
عکس کوئی اتر سکے تو اتار

آپ میں کیونکر رہے کوئی سیماں دیکھ کر
یہ سامان دیکھ کر غم و غصہ کی لہر کیوں نہ دوڑ جائے؟ افسوس مغربی تہذیب کی گند نے ہندوستان کی پاکیزہ نسوانیت کی وہ مٹی پلید کی کہ تو یہ ہی تو بہ۔
مولانا اکبر الہ آبادی سے رہا نہ گیا۔ فرماتے ہیں :-
پیدا کئے فلک نے ظویدنی مناظر
نیچی ہیں اُنکی آنکھیں جو صبا نظر ہیں
کیا عجیب بھول جائیں اہل الہ آباد
حسنِ متانہ کو آخر میں پشیاں دیکھ کر
انجام کار حسن کی پشیمانی کتنا دردناک مشاہدہ ہے کہ دیکھنے والا اپنا درو بھی بھول جاتا ہے۔

دیکھو ہلکے ہو کیا کیا آرزوئے خام سے
انسانی زندگی انسانی ذہنیت کا عجیب غریب پہلو ہے
"You may deceive yourself by pious hopes."

بیدلوں نے ہنستے ہنستے مار ڈالا ہے اہل
یہاں غالباً اہل دل مراد ہے عشق بازوں سے۔ یہ سچا رہے کن آفتوں میں مبتلا
ہیں۔ ایک تو دروازے پر فکر درماں پھر اس پر بے دلوں کی طعنہ زنی جو ان غریبوں کو

مصیبتوں میں مبتلا دیکھ کر منسی اڑاتے ہیں۔
درد سے خالی دل گبر و مسلمان دیکھ کر
آپ کو انسانیت کی تلاش تھی۔ وہ گبر و مسلمان کے ہاں کیونکر پائی جاتی۔
دل بھلا کر وادی غربت کو روشن کر چلے
میرزا یگانہ اپنی حریت فکر و عمل خلوص و راست بازی کے ہاتھوں دنیا سے ادب
میں تنہا ہی رہے۔ خاموش نہیں، بلکہ لڑتے رہے تنہا۔ وہ کسی جماعت میں
شریک ہونا پسند ہی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جمہور کی استمالت یا رضا جوئی کے لئے
پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ باوجود مخالفت کے سامنے اپنا دل جلا کر وادی غربت (ادبی دنیا)
کو روشن کر گئے۔ سلام ہوا ایسے مخلصوں پر

دیکھو کو کچھ چلی مدی کا یہ قول یگانہ پر کس قدر صادق آ رہا ہے۔
Well, how he may live how he may do his work, whether he
do it right or wrong, or do it at all, is a point which
no man has taken the pains to think. Whence he came,
whether he was bound, by what he might be furthered on
his course, no one asked. He wanders in a world of darkness
he is the spiritual light."

ہستی ہو ہو کا خواب پریشیاں دیکھ کر
آئینے کو آئینہ حیراں کو حیراں دیکھ کر

تخیل کی بلند فزاکت اور شاعرانہ قادر الکلامی حد کمال کو پہنچ گئی ہے۔

His every line speaks volume. But the genuine art must suffer. All that is good or great must perish because our society is so depraved.

صبر کرنا سخت مشکل ہے تڑپنا سہل ہے اپنے بس کا کام کر لیتا ہوں آسان دیکھ کر یہ ہے اک genuine کا بیان کر دینے والا آرٹ۔ میرزا یگانہ جھوٹو آسمان زمین کے قلابے ملا کر اچنبھا نگاری نہیں کرتے۔ بلکہ زندگی کی روشن حقیقتوں پر شاعرانہ تصرف کر کے حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ کیونکہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس صدی میں مکمل حقیقی شاعر کوئی اور بھی ہے۔

اور کیا ہوتی یگانہ درد و غصیاں کی دوا کیا غزل یا دآئی والہ فرد و غصیاں دیکھ کر غزل یا دآنے ہی فرد و غصیاں نگاہوں سے گر گئی کیونکہ یہ غزل بجائے خود اک محض حسنِ عمل ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ایسی آواز اب تک کانوں میں پڑی نہ تھی۔ اس میں کیا کلام ہے کہ یہ کلام ہی انسانی مترافت و بندگی کا روشن ثبوت ہے۔

تجربیں نہ چاہو لپٹا تو بس چلے کیونکہ ہنسی ہنسی میں لگالے کوئی گلے کیونکہ شعر سنتے ہی انبساط و استعجاب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ الزامِ حسن آتا ہے اس وجہ سے ذہن کو اور زیادہ لذت حاصل ہوتی ہے۔ نفسیات کا اتنا صحیح مطالعہ ایسے انداز سے کیا جواب ہے ان شوخیوں کا؟ لگاؤ کیوں نہ کوئی عیب ہو وفا کی بلائے حسن ہوتا زل تو پھر ملے کیونکہ

حسن کو اک بلا ٹھہرا کر اور عیب بے وفائی رکھ کر ٹان کا ستم طریق ہے۔ الگ تھلگ کی ملاقات کر گری کیوں ہو کھلے تو عشق کھلے۔ دل لگی کھلے کیونکہ کھلتا برون چلنا بمعنی گراں گزرنا۔ سرسری ملاقات جو محض برائے نام ہو۔

کیونکہ ناگوار ہو سکتی ہے۔ البتہ عشق بازی کی گند سو سائٹی برکھل جاتی ہے۔ نباسنا بھی حسنیوں سے اک بڑا فن ہے تجھ ایسے باولے کو عاشقی پھلے کیونکہ کیا کیا قافے چمکتے جاتے ہیں۔ یہ ہے آرٹ کا حسن۔ عاشقی ہر ایک کو نہیں پہنچتی۔ سب کو اس نہیں آتی۔ ممتاز بیگم کے عشق میں مسٹر باولے بمبئی والے کی جان ہی گئی۔

لی ہو چاٹ جنھیں تیری بذر بانی کی ادب بیٹھیں گے چلے وہ سچے کیونکہ جنہیں حسنیوں کی بذر بانی کا چسکا پڑا وہ پاس ادب کب تک کریں گے قرار سے کب تک بیٹھیں گے۔ دیکھئے قافے کیونکہ آرٹ کو چمکاتے جاتے ہیں۔ جس تو اپنی طرف دیکھتا ہوں حیرت پڑا ہے عشق مرا آپ کے گلے کیونکہ کیا یہ امر عجائبات زندگی میں داخل نہیں کہ آپ جیسا حسین مجھ پر لٹو ہو جائے؟

بات غریبوں کے حوصلہ سے بھی بالاتھی جس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے وہ حقیقت بن کر سامنے آگئی۔ یہ ہے انسانی فطرت کی بوالعجبی! وہی رے نظر آنے لگے بھلے کیونکہ کچھیر ہے یا وقت کا تقاضا ہو یہ ہیں عجائبات زندگی جس پر نگاہ غلط انداز بھی گوارا نہ تھی اسی کو سر چڑھانا

ہے۔ اسے کہتے ہیں کسے کی بلہاری۔ وقت کی خوبی۔ غرض کا بندہ کیا نہیں کرتا۔
"Strength of thought & happiness of language are the chief characteristics of his art."

بتاؤں کیا تمہیں بازار کا اتار چڑھاؤ بنا رہیگا یہی بھاؤ دن ڈھلے کیونکر
"Time dominates over all."

کتنا بے تکافویہ ہے کتنا معنی خیز عبرت انگیز۔ تم ابھی کیا سمجھو گے یہ سامعین
 یہ ساری گرم بازاری دن ڈھلے ہوا ہو جائے گی۔ بازار کا بھاؤ یکساں تو رہتا نہیں۔
 چڑھتا ہوا دن کبھی ڈھلے گا کہ نہیں۔

نگاہ شوق نے آخر بنا دیا دیوتا خبر بھی ہے مے سانچے میں تم ڈھلے کیونکر
 حُسن کی قیمت اک اضافی چیز ہے ذاتی نہیں۔ یہ نگاہ شوق کی طاقت ہے جو
 حُسن کو دیوتا یا دیوی کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ حُسن اپنی قدر پہچان ہی نہیں
 سکتا جب تک کوئی گاہک نہ ہو۔

"Objects draw their colour from the mind."

یگانہ تم بھی ہو ہرے کہ آن نہیں کرنا خدا کو کوستے پھر تمہیں دل جلے کیونکر
 کس خوبی کس قسم ظریفی کے ساتھ خدا کو بہرا بنا یا ہے بالواسطہ۔ کیا کیا کہہ لگے
 اور پھر کچھ نہیں کہا۔ غزل کی غزل انداز فکر اور انداز بیان کا ناقابل تقلید
 نمونہ ہے۔

نو گرفتارم زندانِ ہوس بے اختیار دست بردل ماندہ در کج نفس بے اختیار
 باطل دست گریباں صد ہزاراں آرزو از گراں جانی مبادا ہیکس بے اختیار
 از فریب گنگ بو چشم تمنای خبر داند ہوا شوق ہر موج نفس بے اختیار

سرور عمارا بیا دو دست گیر دو کرتا این دل بیست پابے دسترس اختیار
 دامن عصمت تاب از دامن گل پاک تر جلوه اش صبر آزما۔ دست ہوس بے اختیار
 غافل از انجام خود۔ نامحرم از آغاز خود چشم حیراں در سیم پیش پس بے اختیار
 چشم امیدے مگر داند ز گرد کارواں چاکستہ رادل از شور و جرس بے اختیار
 ہرگز ناکس بطوفانِ حوادث مبتلا موج دریا بقیار و خار و خس بے اختیار
 فرصت داری یگانہ نعرہ مستانہ زن تابو جد آید دل ہر کتہ رس بے اختیار

نقش باطل ہو چلا خواب پریشان بہا دیدہ حیراں میں کھچ کر آگئی جان بہار
 یہ وہ کارنامہ ہے جس سے تمام اساتذہ کے کلیات خالی نظر آتے ہیں ایک ایک
 شعر میں بہار کا عبرت انگیز ہیلو دکھا کر تازہ بہار دکھائی ہے۔

ہوشیاراے چشم ز گس او نگہبان بہار ہوزوال گنگ بود دست گریبان بہار
 آگ برس فلک یا آبِ حیاں بہار زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھ چشمان بہار
 چشم پرغوں نے مجسم کر دیا موہوم کو در نہ بے تعبیر تھا خواب پریشان بہار
 چشم خوں بار نے بہار کی مجسم تصویر دکھا کر خواب پریشان کو مجسم کر دکھایا۔ واہ

کیا تعبیر نکلی ہے؟ چاندنی کی سیر کرتے ہمے آنکھیں مانگے ہیں کہ صحر پر وائے شمع شبستان بہار

آخر پر دونوں کا دھیان کدھر ہے؟ نہ چائے کیوں شمع کے حشر پر مٹے جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک *مومنہ معلک* ہے جمع و پر دانہ کے پردے میں مختلف میوں کے مذاق کا فرق دکھایا ہے۔

اپنا ہاتھ اپنا گریباں اپنا سودا اپنا سر استخارہ کر چکے پابند فرمان بہار استخارہ کر چکے یعنی وہ جو فرمان بہار کے پابند ہیں استخارہ کیوں کرنے لگے۔ استخارہ کے پابند کیوں ہوں۔ ان کے لئے فرمان بہار کافی ہے۔ بہار آتے ہی اپنا ہاتھ ہے اور اپنا گریبان

پیر من کیا بکھر بھی خوش فتنی کا ماتے تنگ آئیاں ہوا اپنے حق میں طرفہ زندان بہار جوش مسرت میں پیرا من کا تنگ ہو جانا تو پرانی بات ہے مگر یہاں پیرا من تو پیرا من گھر میں بھی پھولے نہیں سماتے۔

حاشے کیا کیا چڑھا کر قفس میں زندہ دل مردہ دل کہتے ہیں (معنی ہے فرمان بہار اسیران قفس میں زندہ دل بھی ہیں مردہ دل بھی۔ زندہ دلان قفس فرمان بہار پر کیا کیا امید افزا حاشے چڑھاتے ہیں۔ شوق رہائی اور سیر جہن کے تصور میں کیا کیا خیال آرائیاں کرتے ہیں مگر مردہ دلوں کی نظر میں سارا فرمان بہار ایک نامہ بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

کیوں قفس بردوش پھرتا ہے پیرا من تنگ یار ان چین نا تو اندہ جہان بہار اسیران بد نصیب آزاد دی کی ہوس میں قفس بردوش پھڑ پھڑاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یار ان چین کے غول میں شریک ہو کر خود بھی آزادی کے فرے اٹھائیں مگر آزادوں اور اسیروں کی برابری کیا؟ کوئی مجبور و محکوم قوم آزاد قوموں کے برابر

کیونکر آسکتی ہے گھر بیٹھ کر آزادوں کی قطار میں شامل بھی ہو جائے تو بار خاطر ہو کر نکال دی جائے گی۔ تنگ یار ان چین سے کتنی تلخی احساس پیدا ہے۔ اے خزاں پروردہ دل فکر چین سے باز آ اپنے اوپر رحم کر اے دشمن جان بہار جس کی شوقنا گوارہ زوال میں ہوئی ہوا اس کی ذہنیت منازل عروج و اقبال کا صحیح اندازہ کیونکر کر سکتی ہے۔ اُسے جو سوچھے کی الٹی سوچھے کی۔ ایسی ذہنیت کے لئے اس سے بہتر نصیحت اور کیا ہوگی کہ تو اپنے سودا کے خام سے باز آ۔ اپنی حالت پر رحم کرو ورنہ تیرے ارادہ ناقص کے ہاتھوں تیری رہی رہی بات بھی بگڑ جائے گی۔ جیسے ایران کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

قافلے کا قافلہ مارا ہوا ہے دہرتے رہ گئے سوتے کے سوسب حینان بہار شعر پڑھ کر اک سناٹا سا ڈر جاتا ہے۔ ہوا کے دہرے کے ایک ہی جھونکے نے سارے حینان بہار کو موت کی نیند سلا دیا۔ انقلاب دہر کا کتنا سچا مرقع ہے۔ قافلے کا قافلہ مارا میں لفظ "مارا" میرزا یگانہ ہی کہہ سکتے تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ٹوٹا کہتا۔

رنگ بوجے عارضی سے دل پہلے کا نہیں فکر فردا ہے نظر میں خار دامن بہار اہل بصیرت اس عارضی رنگ و بو کے انجام پر غور کرتے ہیں تو خلش فردا خار دامن بہار نظر آتی ہے۔ اندیشہ فردا کو خار دامن بہار کہنا تازگی فکر اور شدت احساس کی دلیل ہے۔

اپنے رنگ میں اور اپنے اپنی حال میں کوئی حیران خزاں کوئی پشیمان بہار لیکن یہ کہ آخر تک ٹھہرتا کون ہے بوٹا بوٹا بن گیا ہے مرد میدان بہار

طوفان بے تمیزی کے دور میں ہر کس شاعر اور ریاضدین جاتا ہے اور کچھ دنوں تک اس کی گرم بازاری بھی ہو جاتی ہے۔ مگر آخر آخر تک کون ٹھہر کے گا اس کا فیصلہ آئندہ نسلیں کریں گی۔

خار و گل دونوں کو اپنے بانیین پرنا ہے دیکھے رہتا ہوں کس کے ہاتھ میدان بہا سبحان مشاہدات فطرت کو انسانی زندگی سے مطابق کر کے کیا خوب نتیجہ نکالا ہے۔

دنیا میں عزیز سے عزیز اور ذلیل سے ذلیل ہستیاں موجود ہیں اور فطرت نے سب میں کچھ نہ کچھ خصوصیات ودیعت کی ہیں۔ عزیز و ذلیل محض اعتباری الفاظ میں شاعر نیچر کا مطالعہ گہری نظر سے کرتا ہے اور اس میں سے مخفی باتیں نکال کر اپنے پیارے اپنے رنگ میں ان کی تبلیغ کرتا ہے۔ اپنے نقطہ نظر سے مناظر قدرت کی تفسیر کرتا ہے۔

اسی وجہ سے شاعر سب سے بڑا فلاسفر اور استاد مانا گیا ہے۔ وہ انسان اور انسانی فطرت کا قدرت سے مقابلہ کر کے دکھاتا ہے اور ان دونوں میں جو نسبتیں ہیں انھیں اپنے حُسنِ بیاں سے واضح کر کے حیرت انگیز نتیجے نکالتا ہے۔

دور کیوں جائے خود شعرا پر نظر کیجئے ادنیٰ و اعلیٰ سب اپنے نشہ سخن میں مست ہیں مگر آخر میں حُسن قبول اور حیات جاودانی کس کو ملے گی۔ اس کا فیصلہ آتا ہے۔

دیکھ لیتا ہوں چمن کو دور سے بیگانہ و آس مجھے کیوں کھٹکتا ہے نگہبان بہا

ہنتا ہے عشق مجھ کو گرا نیار دیکھ کر زندان آب و گل میں گرفتار دیکھ کر فطرت انسانی اک پاکیزہ جوہر ہے۔ انسان جب گہبی اپنی روحانی جھلک دیکھ لیتا ہے

تو تھوڑی دیر کے لئے انسانیت کے حقیقی سرچشمہ سے نزدیک تر ہو کر وجد میں جاتا ہے پھر جب وہ اپنے جوہر گراں مایہ کو مادی کثافتوں میں آلودہ پاتا ہے تو زندان آب و گل کا عرصہ اس پر تنگ ہو جاتا ہے۔

تیرے کچھ میں صبح کے آثار دیکھ کر آنکھیں کھلی ہیں فتنہ بیدار دیکھ کر شب عیش گزر چکی ترکا ہو گیا۔ تو اب کچھ ہوئے دل تجھے ہوئے تیور وں سے انقلاب دہر کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ وہی زندگی جو امن و عافیت کا گہوارہ تھی اب فتنہ و آشوب سے لبریز ہے۔ خوابِ فطرت سے چونکے ہی قیامت کا سامنا تھا ان نینوں کے یہ بسکہ وہ بھی دیکھا ہے بھی دیکھ۔

عبرت سہرا دہر سے منہ موڑنا پڑا آنکھوں کو اپنے دریے آزار دیکھ کر اگر نگاہِ عبرت نہ ہو تو سخت سے سخت حادثے سامنے سے گزر جاتے ہیں کانوں پر جوں نہیں رنگیتی۔ زمانے کے انقلاب و حوادث سے جو ایذا میں پہنچتی ہیں وہ خود اپنی شدتِ احساس اپنی نگاہِ عبرت کا نتیجہ ہیں۔ پھر اس کا چارہ کاری ہی ہو سکتا ہے کہ عبرت سہراے دہر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی رحمت ہی نہ اٹھائی جائے۔

کس گل پہ ہے بتائے طلسم آب و گل اہل نظر ہیں نقش بدیوار دیکھ کر نشانہ ہلاکے موت پہنچا دیا مجھے جو طلسم بندی اسرار دیکھ کر آنکھ بند ہوئی اور طلسم راز ٹوٹ گیا۔ موت نے حقیقت سے اس طرح آگاہ کر دیا جیسے کوئی نشانہ ہلاکے سوتے سے جگا دے۔

آخر اجل نے روح کو آزاد کر دیا احسانِ بے سبب گرا نیار دیکھ کر

خلعت حیات کو احسان بے سبب سے تعبیر کر کے پُرانی بات میں تازہ روح
پھونک دی ہے۔
روزِ ازل سے منزلِ سودا ہو جب کاسر وہ کیوں نہ غش ہو رنگِ دربارِ دیکھ کر
سر میں سودا سمانا تو پُرانی بات ہے مگر سر کو منزلِ سودا کہنا تازہ تصرف ہے۔
منزل کو اپنے زیرِ قدم جانتے ہیں ہم اس تو سن خیال کی رفتار دیکھ کر
رفتار خیال کی سرعت سے کیا نتیجہ نکالا ہے۔ سلسلہ خیال کہاں سے کہاں
پہنچ جاتا ہے۔

پیدا نہ ہونے میں سے نیا آسماں کوئی
دل کا پیتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

پانی نہیں مزاجِ دوا کا اثر ہو کیا منہ پھیر لیتے ہیں ترے بیمار دیکھ کر
جنسِ وفا نہ تھی کوئی مفلس کا مال تھا دل ہٹ گیا نگاہِ خریدار دیکھ کر
دفا کی ناقدری اور اہلِ دفا کی دل شکستگی کا کتنا ستیا مرتع ہے شعورِ با مثل
کی حد کو پہنچ گیا ہے۔ "Universal truth with the highest
touch of finish."
ناگفتنی ہے حضرتِ دل کو کسی وہ بات کیا یاد آگیا رسن و دار دیکھ کر
دل مجھ سے پوچھتا ہے کہ تو کس طرف کو ہو جوشِ جہادِ کافرو دیندار دیکھ کر

کیا جواب دیا جائے اس سوال کا۔ کافرو دیندار کی حماقت میں کون پڑے ؟

غیر سے رنگِ نامہ اعمال اڑنے جائے کیفیتِ نگاہِ گنہگار دیکھ کر
آئینہ رکھ لے آپ بھی سجدے میں جھک گئے اب کیا کہیں گے کافرو دیندار دیکھ کر
کیا کہنا ہے اس طنزیہ انداز کا۔ کس حُسن کس ستم ظریفی کے ساتھ غور و خوض کو باطل
ٹھہرایا ہے۔ مگر یہ شعرِ رومان کی حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ جو میرزا صاحب کے
طبعی مذاق (حقیقت نگاری) سے بعید ہے۔
گردن ہی اپنی جب کسی قابل ہوگی یاں پھر کیا پڑھے گا دل رسن و دار دیکھ کر

چونکا ہوں خوابِ ابھی محفلِ بار دیکھ کر سکتے ہیں دورنگی لیلِ نہار دیکھ کر
اڑتے ہیں ہوشِ گردشِ لیلِ نہار دیکھ کر آج وہی قفس ہے پھر سیرِ بہار دیکھ کر
سیرِ بہار آخری پھر کہیں یاد آئے پٹکیں گے قفسِ پہم پھولوں کے ہار دیکھ کر
یہ قافیہ ایسا پامال تھا کہ حسینوں کے گلے کے تازے یا باسی ہار یا اسی قسم کے
عامیانہ مضامین کے سوا کوئی پاکیزہ مضمون عام ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ مگر
میرزا بیگانہ کی صحتِ مذاق اور تازگیِ فکر کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس معمولی سے قافیہ
میں اک نیا نچوڑ کھادیا۔

عالمِ شوق میں اسیر ہو گئے باہر آپ چل بے آمدِ فصلِ بہار دیکھ کر
فصلِ بہار کی آمد سن کر اسیرانِ قفسِ عالمِ شوق میں آپ سے ایسے باہر ہوئے
کہ شادی بگ ہو گئے۔
مستونگی خاک کو فلک اپنے کرم سے لکھنا بھٹکے گی روحِ سایہ ابر بہار دیکھ کر

ہوں ہی ہے ساقیا مستون کا دم کل یہ جا
صبح کو تیری آنکھ میں کیف خمار دکھاکر
کاش مرا حزن زلیست قبل سحر محوش ہو
آنکھیں نہ جانی کیا دکھائیں مغل یا کھنکھیر
یہ غزل کوئی ۳۵ سال قبل کی ہے جب میرزا صاحب جوان تھے۔ اب معلوم ہوا
کہ کوئی اٹھارہ سال سے یہ شعر میرزا صاحب کے اک مخلص ترس قد سشناس
سید غلام سنجین صاحب شمشاد سشن رج نظام گورنمنٹ کے گویا وظیفہ میں
داخل ہے۔ بقول بعض اہل لکھنؤ لیگانہ کے اشعار سن کر دیر تک دل قابو میں
نہیں رہتا۔

ایسی پلا کہ ساقیا فکر نہ ہو تیرا کیا
نشہ کہیں اتر نہ جائے روز شمار دکھاکر
آئینہ سکندری جام جم اور قلب صفا
آنکھوں سے نہ گر گئے گرد و نگار دکھاکر
اہل ہوس کجا کجا جلوہ صبر آزما
تاب نہ لائے غش ہوئے آخر کار دکھاکر
آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روئند ہوئے
سوچھا پھر آنکھ سے نہ کچھ منزل یار دکھاکر
اللہ اللہ کیا ٹھکانا ہے اس جوش و خروش کا یہی وہ جاودانی آرٹ ہے
جسے کبھی فنا نہیں۔

منظر یاس نے تجھیں آج لہو رلا دیا
شعلہ دل بھرک اٹھا شمع مزار دکھاکر

قفس میں بوجے متانہ بکلی کی درد سر ہو کر
نویز ناگہاں پہنچی ہی مرگ منتظر ہو کر
قفس میں چھپو لوں کی بوجے متانہ اسیروں کے لئے خردہ بہار ہے تو سہی مگر باعث

درد سر بلکہ وبال جان بھی ہے۔ نویز بہار پہنچی تو کیونکر؟ مرگ منتظر ہو کر۔ یہ ہے
چونکا دینے والا انداز سخن۔ اسیرانِ قفس زندگی سے تنگ آکر موت کے منتظر
تھے۔ موت آئی تو کیونکر؟ بوجے متانہ اور نویز ناگہاں کے بھیس میں جس نے
اسیروں کو آپے سے باہر کر دیا۔ رہائی تو نصیب نہ ہوئی نگہت گل سے وارفتہ ہو کر
دنیا سے چل بسے۔ یہ ہے انسانی زندگی کی تر جانی اسیرانِ قفس کے پردے میں۔
نگاہ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل مٹا کر
مبادا رنگ کو اڑ جائے پامال نظر ہو کر
نگاہ شوق کی جذب و کشش خدا کی پناہ۔ جلوہ حسن کیسا ہی نظارہ سوز ہو
نظر باز آنکھوں ہی آنکھوں میں پی جاتے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا احساس خود
حسن کو بھی ہوتا رہتا ہے اور یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں نگاہ شوق کی قوتِ جاذبہ
سے ساری رنگ بوجے متانہ ہو جائے۔ پامال نظر کی ترکیب کتنی تازہ و پر معنی ہے۔
کتنا سچا مشاہدہ ہے۔

زمانے کی ہوا بدلی۔ نگاہ آشنا بدلی
اٹھے مغل سوسب بیگانہ شمع سحر ہو کر
کہاں پیرا رسائی کی ہر پروانگی قسمت؟
پڑے نہیں فانوس پر بے بال پیر ہو کر
منزلِ فانوس سے قوتِ اختراعی ثابت ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر پروانوں کا
بے بال و پر ہو جانا رسائیِ نجات کی روشن مثال ہے۔ شمع و پروانہ کے پرے میں
انسانی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔

"The gifted eye of a genius can exhaust the
significance of the commonest things."

مقدّر اس مسافر کا طلب کسی نہیں ہوتی نصیبوں میں ہو مگر اسی گنگا سفر ہو کر
جب تک ادھر کی طلب نہ ہو وہاں تک پہنچ ہی نہ پاو گے بھٹک جاؤ گے۔

زحمت سفر رفت کا گناہ گنگا سفر کتنی تازہ ترکیب ہے فصیح و بلیغ۔

جواب آیا تو کیا آیا صد بار گشت آئی دہن سے آہ نکلی بتدائے پنجر ہو کر

آہ نارسا کی ناکامی کو صدائے بازگشت سے تعبیر کرنا اور پھر اس کے لئے مبتدا

بے خبر کا استعارہ بدیع اختراع کرنا اردو شاعری کا وہ کارنامہ ہے کہ دنیا کے بڑے

بڑے وسیع لٹریچر میں اس کی نظیر مل جائے تو بھی اردو زبان کو اس شعر پر ناز ہو گا

اور بجا ہو گا۔

غریبوں نے آہ کی تو سہی مگر اس کا جواب کیا ملا وہی صدائے بازگشت۔ آہ کیا

تھی؟ اک مبتدا تھی جس کی کوئی خبر نہ نکلی اور نکلی تو صدائے بازگشت کی صورت میں

اُف رسی ناکامی اس کرشمہ قدرت اس Natural Phenomenon

یعنی صدائے بازگشت پر اس کتاب میں اور کئی اشعار میں جو اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں

ارادے کی ناکامی کی زندہ تصویریں کھینچنے میں لگانے سے اس لفظ سے جیسا کام لیا ہے

انھیں کا حصہ ہے۔ ایسے اشعار جو اصول فطرت پر مبنی ہوں کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔

فلک کو دیکھتا ہوں دوز میں کو آتا ہوں مسافر در وطن خانہ بدوش رہنما ہو کر

شعر کی قدر و قیمت اس غریب سے پوچھئے جو اپنے شہر و دیار میں غریب الوطن کی

طرح زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ جو اپنی ہی گلی میں خانہ بدوشوں کی طرح بڑھتا ہوا

جو در کس میر سی سے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھ کر رہ جاتا ہو۔ زمین و آسمان کو آزار ہو

کہ دیکھیں یہ اور کیا سلوک کرتے ہیں۔ خانہ بدوش رہ گزر کی معنویت اور فصاحت کا

غالب کی فارسی ترکیبوں سے مقابلہ کر کے یگانہ کی قوت اختراعی اور ذوق صحیح کا اندازہ
کر دو۔

علاؤ کیا نہ دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو لہو کا گھونٹ اتر جاتا ہے جب شہر و سر ہو کر

تہری لینا آسان مگر لہو کا گھونٹ شہر و شکر کی طرح اتار لینا مشکل ہے۔ دشمن

سے خطاب ہے کہ تو ہم ایسے تلخ کاموں کو نہ ہر دے کر اپنے سرمفت کا دبا لیتا ہے

یہاں خود لہو کے گھونٹ پی کر تلخ کامی کے فرے اٹھا رہا ہوں۔

خود اپنے خاکِ خوں میں لوٹ کر آلودہ دنیا پڑا ہے اب گرھے میں گور کے آلودہ تر ہو کر

شہیدانِ ملک و ملت تو اپنے خاک و خون میں لوٹ کر دنیا سے پاک و صاف اٹھتے

ہیں۔ اک وہ بد نصیب بھی ہیں جو دنیا میں آلودہ ہو کر غریبوں پر ظلم ستم کرتے ہیں۔

اور آخر اپنے کبیر کر دار کو اپنے گے کو پہنچ جاتے ہیں۔ اندھیرے اُجالے کسی بیٹھ

کے پالے پڑ گئے اس نے کام تمام کر دیا۔ دنیا کی نجاستوں میں تو پہلے ہی آلودہ تھے

اب اور آلودہ تر ہو کر گور کے گرھے میں ڈال دئے گئے۔

خدا معلوم اس آغاز کا انجام کیا ہو گا چھڑا ہے سارے ہستی بتدائے خبر ہو کر

پہلے اک شعر مبتدا سے بے خبر کے مضمون پر آچکا ہے۔ اسی قافیہ کا دوسرا رخ

اس شعر میں دکھایا گیا ہے۔ یہ الہ آباد کا مشاعرہ تھا سر نیچ بہادر سپر کی صدارت

میں جس میں بیسیوں مشاہیر جمع تھے۔ مگر خبر کے قافیہ کے ایسے نازک اور پر مہنی پہلو

بھلا اور کسی کے ذہن میں کیا آتے۔ فارسی ادب بھی اس مبتدا سے بے خبر سے خالی

نظر آتا ہے۔ زندگی کی ابتدا و انتہا نہ کسی کو معلوم ہوئی نہ ہو سکتی ہے۔ اس فلسفہ پر

اساتذہ کے ہاں سیکڑوں اشعار موجود ہیں مگر اس الہامی زبان میں ایک شعر بھی

کسی قوم یا کسی جماعت کی مصنوعی کوششوں سے کوئی شاعر بنایا نہیں جاسکتا۔
ایسا شعر جو آفاقی خفایا کا حامل ہو کبھی فنا نہیں ہو سکتا یہ وہ شاعری نہیں ہے
جو مذہب اور سیاست کے پروں پر اڑتی ہے یا لغت و منقبت کے بھیس میں قولوں
کے لئے روزی کا سہارا یا بھیک کا ٹھیکرا بن جاتی ہے۔ مذہب کو ٹھکڑا دیتی ہے۔ الخ
دیکھو یہ ہے قدرت کا جلال و عتاب یہ ہے آئینہ انقلاب بڑی بڑی
حکومتیں آج اپنی استی کو تباہی سے بچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا
زور لگا رہی ہیں۔ سچ ہے عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسمان ہو کر۔

یہ ہے وہ آئینہ انقلاب جس سے عبرت حاصل ہوتی۔ روح بیدار ہوتی ہے
اور قوم میں کچھ جان باقی ہے تو پھر سے کروٹ لیتی ہے۔ یہ ہے اس شعر کا اثر بشرطیکہ
قوم میں صحیح اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ یہ ہے اک شاہکار اس آرٹسٹ کا جس
کے سر پر خود دست قدرت نے سخنوری کا تاج رکھا ہے۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے
کہ میرزا یگانہ کی طرح مکمل اور حیران کرنے والے اشعار نہ آج تک کسی نے کہے
نہ آئندہ کوئی امید ہے۔ ہاں ایسے لکھنے والے بہت ہیں جن کی تصنیفیں تول میں دس
دس بیس بیس سیرنگیں تعداد میں لاکھوں اشعار ہوں مگر یگانہ کے سے شعر کہنا
ناممکن۔

اٹھواٹھ سو نو سو نو سو یہ دھوپ کی قیامت کہیں دین نہ ٹھہل جائے نصیب دشمن ہو کر
جل جلالہ کس قیامت کا پیغام بیداری ہے جو یگانہ ہی کی زبان سے
پہنچایا جاسکتا تھا۔ یہ آخری دن بھی گتو ادیا تو سوتے کے سوتے
رہ جاؤ گے دشمن پالائیں گے یہی اک شعر شاعر کو زعمہ جاوید بنادینے کیلئے

کافی ہے۔

writers commonly derive their reputation
from their work; but there are works which owe
their reputation to the social, political or other
status of the writer. The public generally has its favorite
whom it rewards for one species of excellence
with the honours due to another. From him whom
we reverence for his beneficence we do not
willingly withhold the praise of a genius; a man
of vast learning becomes at once an accom-
plished poet, as a beauty finds no great difficulty
in passing for a wit - that is a favourable prejudice.

زبان و خراش و داستان ظلم اسے تو یہ دہلتا ہے قفس ہنگامہ زار الاماں ہو کر
داستان ظلم اور وہ بھی دخر اسش زبان سے سننے کی تاب کون لاسکتا ہے
دل تو دل ہے قفس بھی شور الاماں سے ہنگامہ زار بگر دہل رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ
کسی اسیر ستم کی نوا سے درد لئے سارے اسیران قفس کو پھر کا دیا ہے اور اس ہنگامہ
الطراب سے سارا قفس زلزلے میں ہے۔ ہنگامہ زار الامان کے تازہ تصرف کا غالب
کے تصرفات سے مقابلہ کر کے یگانہ کی قوت اختراعی اور معنی آفرینی کا اندازہ کرو۔
اور اس دہلیز کی لگی جھپتی تو کیا جھپتی؟ ہمیں خود اشیاء اڑ گئے تو دھواں ہو کر

بجھتی تو کیا بجھتی۔ درد مندانه احساسات کی ترجمانی اتنے سادہ اتنے پر جوش الفاظ میں ہر خزاں کے دور میں دل کی لگی تو کیا بجھتی۔ آرزو تو کیا پوری ہوتی یہی ہوتا کہ آشیائے میں آگ لگ جاتی اور اس کے ساتھ ہم بھی دہواں بن کر اڑ جاتے جیسے بہادر شاہ ظفر یا رضا شاہ پہلوی۔

نوید خشک شکر جن کے منہ سے پھول پھرتے تھے چمن کو صبر کر بیٹھے وہ آخر بدگماں ہو کر اسیرانِ بلا پہلے تو خردہ بہار سن کر ایسے چمپاے کہ منہ سے پھول پھرنے لگے۔ مگر انتظارِ رملی کی کوئی حد بھی ہے۔ رملی نصیب نہ ہوئی تو سمجھ کہ فصل گل اپنے حق میں محض نوید خشک، خردہ بے حسی تھی۔ آخر کار اس امید موہوم سے بدگماں ہو کر چمن کو صبر کر بیٹھے۔

دباں رنگ بو سے چھوٹے ہی پر نکالیں گے گرانبار بہار آخر سبکدوش خزاں ہو کر گہاے رنگارنگ جو شاخوں میں لگے ہوئے ہیں ان خود جدا نہیں ہو سکتے انھیں گرانبار بہار سے تعبیر کرنا اور ان کے رنگ و بو کو دباں ٹھہرانا قوتِ تخیل کا کتنا اچھا تصرف ہے۔ بادِ خزاں کے چلتے ہی یہ گرانبار بہار دباں رنگ و بو سے چھوٹے ہی پر نکالیں گے یعنی ہوا سے خزاں انھیں پر لگا دے گی۔ اگر کہیں سے کہیں ہونچ جائیں یہ سادی گرانباری دباں رنگ بو ہی تک ہے چھوٹے ہی پر نکالیں گے آثارِ فطرت (Natural Phenomena) کی نقاشی اتنے اچھوتے انداز سے اتنی ٹھٹھیز بان میں حیرت کا مقام ہے۔ آج تک اس مفہوم کو کسی نے ان لفظوں

میں بیان نہیں کیا۔ بسر کرنا ہو جسکو رنگ بوے رائگاں ہو کر زمانے بھر کا منہ تکتے ہیں کیوں ہر اپنی طرف ہیں

سبحان اللہ کیا جذبہ خود شناسی ہے۔ خود اعتمادی ہو تو ایسی ہو۔ فرماتے ہیں دنیا کی اوندھی مت کے ہاتھوں جنھیں کس میر سی کی زندگی بسر کرنا ہے جن کے رنگ بو کا کوئی قدر شناس نہیں ہے وہ زمانہ بھر کا منہ کیوں تکتے ہیں۔ اپنی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔ اپنی قدر آپ کیوں نہیں سمجھتے۔ رنگ بوے رائگاں کی معنی خیز ترکیب سے عالم کس میر سی کی ایسی تصویر کھینچی ہے جس کی دلوں غالب ہی دے سکتے تھے۔

پائے درد کی کوئی نگہبانی کرے کب تک حقیقت کھل نہ جا اضطرابِ دل ہو کر ہزاروں شمعیں لاکھوں دل تری مچلیں جاتے ہیں جلیں گے مسلمان کیوں نہ کیدل گزبان ہو کر

تیری بزمِ ناز میں جہاں ہزاروں شمعیں جل رہی ہیں دہاں عاشقانِ پاکباز کے دل بھی کیفیتِ سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پھر یہ گبر و مسلمان کیدل و گزبان ہو کر متحد ہو کر کیوں نہیں جلتے۔ سبحان اللہ کتنا اعلیٰ مقصد ہے۔ مگر یہ گبر و مسلمان عشقِ الہی میں اتنے غلام ہیں کہ ایک جہتی پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہم ہو کہ جنتِ طائرِ حبال ہم نہیں سکتا کہیں پرواز کی حد مل سکیگی لامتناہی ہو کر روحِ مجرّد قابِ خاک سے نکل کر جب لامکاں ہو گئی تو پھر اس کے لئے جہنم یا جنت کسی قسم کی قید مکانی محال ہے پھر اس کی پرواز کی کوئی حد ہو ہی نہیں سکتی۔

نوی کی کیفیت سے چونکے ہی کھینچا گیا ہوں کہ تیرا نشہ مستیِ خارِ جاوداں ہو کر ہمارا غفلتِ جاوید پر جلوہ حقیقت کا سما جائے آنکھوں میں کہیں خواب گراں ہو کر

ان اشعار کی کیفیت و جذباتی پر کچھ اظہار خیال کی ضرورت نہیں۔ دیدہ دل سے

مطالعہ کرنا چاہیے۔ گویا قدرت الہی کے یہ وہ نمونے ہیں جن کی نسبت میرزا صاحب
اصغہانی فرما گئے ہیں۔

چشم بر صنع الہی باز کن لب را بہ بند بہتر از خواندن بود دیدن خط استاد را
"the very perfection of the work as if Nature herself
made it, hides the merit of the architect."

اے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا
جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہجھا دھواں ہو کر
گلستانِ ادبِ خونِ دل کو کس سینیچا ہے؟
خدا لگتی بھی کہدیکھا کوئی پیازباں ہو کر
پھڑکتے ہیں مگر بیدار منہ سے کچھ نہیں کہتے
نگاہِ یاس نے مارا ہے دردِ نیرباں ہو کر
وطن کی ہو اس میں وطن کی خاکِ دامن پر
گریباں چاک کر لیتا ہوں یادِ دوست و دشمن پر

وطن کی ہے ہوا اس میں کہنے کے بعد ہی وطن کی خاکِ دامن پر ایسا کلمہ
رنگِ محبت میں ڈوبا ہوا اب تک کسی کی زبان سے نہیں سنا اور پھر اسی کے ساتھ
یادِ دوست و دشمن پر گریباں چاک کر لینا، حبِ وطن کی ایسی درد انگیز تصویر شاید ہی
کسی نے کھینچی ہو۔ دو مصرعوں میں کیا کیا کیفیات نفسی بیان کر دی گئی ہیں۔

یہ ہے یگانہ کی محقر نگاری اور اس کی معنوی وسعت۔
نہ ترک اختیار آساں نہ ضبطِ اضطراب آساں یہی دستِ عاجلہ کے اٹھ جاتا تھا دشمن پر
یہی دستِ دعا جو اب مجبوری کی حالت میں آسمان کی طرف بلند کیا گیا ہے اختیار
اقدار کی حالت میں جھلکا کر دشمن پر اٹھ جایا کر تاتھا۔ ضبطِ اضطراب تو متحمل نہیں ہو سکتا

ترک اختیار اس سے زیادہ مشکل ہے۔
پسینا تک نہیں آتا تو ایسی خشک تو کیا
ندامت وہ کہ دشمن کو ترس آجیاد دشمن پر
ایسی جھوٹی تو بہ کس کام کی کہ پسینا تک نہ آیا۔ کتنی سچی جدت ہے اس اچھوٹے
طنز کی مثال شاید ہی مل سکے۔ تازگی و جدت وہی ہے جو صداقت پر قائم ہو۔ دور کا
تخیل سے کلام میں انوکھا پس پیدا کیا گیا تو کس کام کا؟

دفا پر بدگمانی کا گماں اب تک نہیں ہوتا
ہمنوار اک حسنِ ظن ہی اپنے لگو حسنِ بدظن پر
حسنِ اکثر عشق کی طرف سے بدگمان رہتا ہے۔ مگر عاشق صادق کی سادہ دلی کا
مقتضایہ ہے کہ وہ حسنِ بدظن کے ساتھ بھی حسنِ ظن رکھتا ہے۔ اُسے یقین نہیں آتا
کہ دوست اس کے صدق و وفا کی طرف سے بدگمان ہو گا۔ حسن و عشق کی ذہنیت بھی
عجیب غریب ہے۔ ہر کس یہ خیال خویش خطبے دارو۔

شکست نشہ و کیفِ ندامت واہ کیا کہنا
بچائے مے ٹپکتا ہے زلالِ اشکِ دامن پر
نشہ اتر جانے کے بعد کیفِ ندامت کی تصویر کتنے نزلے انداز سے کھینچی ہے۔ وہی
دامن جس پر زلال مے ٹپکتا رہتا تھا اب زلالِ اشک سے تر ہے۔ ذہن کی تازگی و شگفتگی
بات سے بات پیدا کر لیتی ہے۔

نگاہِ بے نیازی نے دکھایا راستا سیدھا
بھٹکتا کوئی کب تک جاؤ شیخ و بہمن پر
فریبِ چشمِ احوال سے ہوسنی ہوئی دلکی
مگر کیا دسترسِ دنیا کے رنگاز رنگِ خرمین پر
کتنا سچا فلسفہ ہوس ہے کہ فطری غلط بینی سے ہوس تو اتنی بڑھ گئی اور دسترس
کچھ بھی نہیں۔

بچے کیوں بارخاطر خود خود گھبرا پڑا مردہ
 ڈھبے پڑے ہیں آپ کیوں گلچیں کے دامن پر
 گل پڑا مردہ کا آپ کیوں گلچیں کے دامن پر گرنا۔ اس مشاہدہ سے قوت متحید نے
 کیا نتیجہ نکالا ہے یعنی خواہ مخواہ کسی کا بارخاطر ہونا کیا ضرور؟ زمانے کی نامساعدت سے
 اگر انسان دنیا کی نگاہوں میں حقیر ٹھہرے تو اس حالت میں بھی اپنی خود داری کا پاس د
 لحاظ واجب ہے۔ یہ ہے جگانہ کی ذاتی خود داری جو کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں
 ہو سکتی۔

خدا جلنے اجل کو پہلے کس رحم آئیگا
 گرفتار قفس پر یا گرفتار نشیمن پر؟
 بیشک گرفتار قفس بھی رحم کے قابل ہیں مگر واسے بر حال ان کے جو خود اپنے
 نشیمن میں گرفتار ہیں جن کا نشیمن بھی قفس سے بدتر ہے۔ ایسوں کا درد دل کو ن
 سمجھے۔ دنیا تو گرفتار انسان نشیمن کے درد نہاں سے بے خبر رہی ہے اور رہے گی۔ مگر نہ معلوم
 اجل کو بھی ان بے چاروں پر رحم آئے گا کہ نہیں۔ اگر موت بھی ان کی داد کو نہ پہنچی تو

بس قیامت ہے۔ کیا درد ہے کیا سوز و گداز ہے؟ سبحان اللہ
 دہائی کھینچنے والو قفس سے لاک کھنا کیا
 مباد آگ سے آج آجائے نشیمن پر
 اسیران قفس سے خطاب ہے کہ تم اپنے سوز و گداز سے دہائیاں کھینچ کر قفس
 کو چھونک دینے کی فکر میں ہو مگر اس لاگ کا نتیجہ کہیں بے بدتر نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو
 آو آتش بارے قفس کے ساتھ آشیانے پر بھی آج آجائے دونوں جل کر خاک ہو جائیں
 ہے معراج انسانی کہ بندہ ہوں تو اپنا ہوں
 چڑھایا خود پرستی نے نگاہ دوست دشمن پر
 میرزا یحیٰی نے فلسفہ خودی کے ایسے ایسے نکتے حل کر دئے جو اولیٰ و صوفیوں میں
 اب تک شاد تھے۔ جذبہ خودی انسانیت کی معراج کا زینہ ہے۔ بندہ ہوں تو اپنا ہوں

بھسلا اس سے بڑھ کر انکار دہی اور اقرار ہمہ اوست اور کیا ہو گا۔ نگاہوں پر چڑھا کر
 معراج انسانی کا ثبوت دینا تو دیکھئے۔
 کجا طرز نیکانہ اور کجا انداز بیگانہ؟
 بجا ہر شک تم جیسوں کی جیسے صبا فن پر

خود پرستان ازل اندامانے دگر
 حق پرستی کی کشتی مابہ عنوانے دگر
 باز شکستہ زخم خود نکالنے دگر
 شکر در خویش ادا کر دم بہ عنوانے دگر
 دست خود دامن خود بودن ندارد
 دست گستاخے دگر خواہم و داناںے دگر
 جز تر رحم ہاے درد افزا اندام چارہ
 بلبل تنہا نشین رانیست دمانے دگر
 گو شتم از ذوق اسیری برستا بد فردہ
 جان ایذا دوست دار و شوق زندانے دگر
 پاسبانی از نگاہ نارسانا ید دوست
 بویوسف احمیا کن نگہبانے دگر
 الوداع الحزن عشق کفر مشربا لوداع
 مافیض بے دلی داریم ایمانے دگر
 غفلت جاوید دارد رنگ خواب مدی
 جلوه فردا بہ چشم ما شبستانے دگر
 ہر کسے را بہرہ باشد ز فیضان بہار
 دست من نگین زخار و گل بدایانے دگر
 زندہ در گوریم و شاید زندہ جاویدیم
 جرعه خوریم یا اس از آب حیوانے دگر

خمار دیدہ غفلت تاب از من پرس
ز رنگ دہ خراں دیدہ ام جنیں نگہ
ز درد تشنہ لبی ہاشکستہ دل نشوم
شمار بوسہ ز ذوق لہجہ توان دانست
زبان بے ادبم را کہ می تواند سبت؟
منم کہ شیشہ دل سنگ آزما دارم
زا اضطراب دلم درد سر کشد بالیں
برنگ خویش برآوردن دوست مرا
تلاش معنی بیگانه در صحیفہ عبت

نوید صبح و تھا صبا خواب از من پرس
ہنوز لذت باد شباب از من پرس
طلسم بندہ ی موج سرباز من پرس
در اینہ نگہ این حساب از من پرس
نگاہ جن طلب را جواب از من پرس
بیا و ذوق نگاہ غائب من پرس
شب دراز و تماشای خواب من پرس
کرشمہ نگہ سحباب از من پرس
یگانہ مطلب دور از کتاب من پرس

تو کہاں اور کہاں وہ جلوہ پاک
اُس عقل کے اندھے کا کیا علاج جو آفتاب سے آنکھیں لڑانے لگے۔
کھا گیا کتنے جان نثاروں کو
پر دے پڑے میں شعلہ بیاک
دیکھے کیا خدا دکھاتا ہے؟
آپ نازک مزاج ہم بیاک
ہر ذی روح کو جان پیاری ہوتی ہے مگر فطرت کی بواجبی دیکھے کہ موت کے منہ
میں جا پڑنا بعضوں کی سرشت میں داخل ہے۔

گھل گئے جیسے موم کی مریم
کیوں بڑھایا تھا دل جلوں سے سچا کر
موم کی مریم۔ موم کی مورت۔ موم کی پتی جس طرح بھی پڑھو مطلب وہی ہے کہ
عشق کی آغوش میں گھلا دیتی ہے۔

پاک دامن بچے نہ دامن چاک
بدگمانوں کی جہربانی سے
طنز نے یہاں لفظ 'جہربانی' میں اُسے معنی پیدا کر دئے۔ بدگمانوں کی بدگمانی
آبرو باختہ یا پاک دامن کسی کو نہیں چھوڑتی۔ اس شعر سے جولت حاصل ہوتی ہے
وہ اصل واقعہ کے مشابہ حاصل نہیں ہوتی۔ یہ بھی نگاہ آرٹ کا اک راز ہے۔
ذات میں اپنی کیا نہیں موجود؟
عشق ساز ہر عقل سا تر یا ک

موجود تو بہت کچھ ہے مگر اپنی موجودات کا جائزہ لینا کسے آتا ہے۔ یہ ہے وہ تعمیری
آرٹ جس کا صحیح مطالعہ کرنے والا اپنے اندر اک ترقی محسوس کرتا ہے۔
آسمان کی ذرا سی گردش میں
کوئی ملک کان اور کوئی ہلاک
دیکھے اک ٹھٹھ لفظ ملک کان میں آسمان کی گردش کے ساتھ ملکر کتنی وسعت معنوی
پیدا ہو گئی ہے۔

کون کھڑے تھے کے دھارے پر؟
کوہ کیا اور کیا خس و خاشاک
کتنا سچا احساس کتنا صحیح تخیل ہے کہ وقت کا دھارا خس و خاشاک تو کیا
پہاڑوں کو بھی بہائے لئے جاتا ہے۔ پہاڑ بھی ہر لمحہ کھسکتا جا رہا ہے چاہے محسوس
نہ ہو۔ ہر زمانے کے دانشمندوں نے شاعر کی خدا داد قوت و جدائی کو تسلیم کیا ہے۔
چنانچہ اس شعر میں بھی اسی جدائی قوت کی کار فرمائی ہے۔
میں کہاں اور کہاں کے پست بلند
ایک ٹھوکر میں تھا بجھیرا پاک

یہ تھے میرزا بیگانہ، کہ دنیا دار ہونے کے یا وجود مادی ترقیوں کے امکانات کو جن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا ٹھکرا دیا۔ میں کہاں اور کہاں کے لپیٹ و بلند۔ جیسا ہوں اچھا ہوں۔

ہوش کیا پائے گا پیتا میرا
اُس وقت کے اہل ہوش و خرد اُن کے طرز رفتار پر نکتہ چینی کرتے ہی رہے
اور اکثر احباب نے انھیں اپنے منسک سے باز رکھنا بھی چاہا مگر یہ بات میرزا بیگانہ کے سوا اور کون جان سکتا تھا کہ اُن کی منزل مقصود کدھر ہے نہ فطرت نے انھیں کس کام کے لئے وضع کیا ہے؟

فلسفی کو خبر نہیں اپنی
حُسن اپنا بھی دیکھ لوں اک دن
آنکھ کے آگے ناک سو جھے خاک؟
عشق چاہے تو کر دے خاک سے پاک

یہ وہ حُسن ہے جو اپنے تئیں مٹا دینے کے بعد ہی چمکتا ہے۔ یہ عشق "دور درازہ" نوجوانی حُسن نسوانی کے ساتھ نہ تھا بلکہ اپنے مشن کے ساتھ تھا جو آخر تک قائم رہا۔ بولو جئے میرزا بیگانہ کی پھر ٹک اٹھے چچا میاں تیرے خاک پھر ٹک اٹھے خوشی کے مارے۔ کیا معنی کہ جو کام چچا جان کے بس کا نہ تھا بھیتے نے اُسے پورا کر دکھایا۔ غزل آرٹ کے مرتبہ پر پہنچ گئی۔ زندہ باد۔

کوئی کیا جانے بانگین کے ڈیفنگ؟
میرزا بیگانہ اس مزاج اس کیر کٹر کے آدمی ہیں کہ دشمن سے جنگ بھی کر سکتے ہیں

اور صلح بھی۔ مگر دوست کی بیوفائی کے بعد صلح کر ہی نہیں سکتے۔ دوستی گٹ ہو جانے کے بعد بعض اصحاب نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی بھی مگر میرزا صاحب تو اس وضع کے آدمی تھے نہیں۔

کچھ نہیں جنگ زرگری ہی ہے
صلح کی صلح اور جنگ کی جنگ
دانشمندوں کی علمی زندگی کا یہ بھی اک رخ ہے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔

کیا زمانہ تھا کیسے دشمن تھے؟
رات بھر صلح اور دن بھر جنگ
بہادروں کی بہادری و شرافت کا وہ زمانہ گزر گیا۔ مغلوں اور راجپوتوں پر ختم ہو گیا۔

دیکھئے کیا ہو ٹھن گئی بیڈھب؟
دل بے درد اور درد میں جنگ
دیکھیں تو کون اپنے سانچے میں ڈھاتا ہے؟

کون بدلے نظام کون و فساد
کون رو کے جبابہ موج کی جنگ
فطرت اپنے اصول سے مجبور
صلح مقصود ہے کسی سے جنگ
حُسن اور عشق کی لڑائی کیا؟
جیسے جوڑو خصم میں سوت پہ جنگ
مرد و ایک لکھنؤ میں تھا
وہی مرزا بیگانہ غالب جنگ

حُسن وہ حُسن جس کا روپ نہ رنگ
نیت نیا رنگ نیت نرا لاڈلنگ

حسن کیا حسن کی تجلی کیا
رنگ لایا ہے جلوہ بیزنگ
حسن مطلق وہی ایک ہے جو ہر رنگ میں شامل ہے۔ وحدت الوجود کے
فلسفہ پر غزل کا رنگ چڑھا دیا ہے۔
اُس نگاہ رسا کو کیا کہیے؟
جس پہ ہو عرصہ دو عالم تنگ
دیکھئے لے اڑا کہاں سے کہاں؟
نشہ رنگ و بو کے رنگارنگ

یہ ہے وہ آرٹ جو حکیمانہ زندگی کی لذتوں سے لبریز ہے۔
کام کیا فلسفی کا رندوں میں
کیوں ہو پیچھے بھاگے رنگ بھنگ
مردہ دل کو ٹٹولنے والو
چھیڑتے کیا ہو ساز بے آہنگ
خشک اور مردہ دل فلسفی کو ساز بے آہنگ کہنا اک تازہ عمارت ہے۔
کیا اب آگے نہیں کوئی منزل؟
کیا ہوئی دل کی وہ لگن وہ آمنگ
یہ وہ زندگی ہے جس کی ترقی ختم ہو چکی ہو۔ کوئی حالت منتظرہ باقی نہ ہو۔ غور
سے دیکھئے تو انھیں سوالات میں درس عمل پنہاں ہے۔ مگر یہ درس درس کی صورت
نہیں رکھتا۔ بالواسطہ دل کو گرماتا ہے۔
وہی اُلجھے نہ اُلجھے خالوں سے
جس کا دل تنگ جسکی دنیا تنگ
شعر ضرب المثل ہو گیا۔ بڑوں کا دل بڑا ہوتا ہے۔
ہنستے ہنستے بے تھے پریم بھگت
دل لگی بڑھتے بڑھتے لائی رنگ
The joke had gone too far. بعض اوقات ہنسی ہنسی میں بات

بڑھ جاتی ہے۔ پہلے جو اک دل لگی سی تھی رفتہ رفتہ زندگی کا عین مقصد بن گئی۔
سنگ دل کو بنا دوں میں دیوتا
آپ کیا جانیں بندگی کے دھنگ
خلوص بندگی سنگ دل سے سنگ دل کو رام کر لیتا ہے۔ بڑے بڑے کا شعر ہے۔
ہندوستانی انسانیت کی قوت تسخیر اور کمال انسانیت کا ایسا مرقع شاید ہی کہیں
لگا آئے۔

آہ کے ساتھ کھل نہ جائے بھرم
دروکتا ہے دلمیں کتنی اُمنگ
فقط اک آہ میں دفتر معنی پنہاں ہوتا ہے۔ دل کی گہرائیوں کا پتا چل جاتا ہے۔
جیسے جی یہ عذاب تنہائی؟
دل لگا لو تو گیوں رہو دل تنگ
کتنا سچا اصول زندگی ہے کسی کے ہو رہو۔ وحشت دفع ہو جائے۔ آج کل
کے (Bogus) ترقی پسند شاعروں کے لئے حبس بھوک اور آزادہ روی
کی زندگی کی انجھنوں کو اور بڑھا دیا ہے۔ انھیں اس سچے اصول زندگی سے
بہت پنا چاہیے۔

میر کے آگے زور کچھ نہ چلا
تھے بڑے میرزایگانہ دب تنگ
میرزایگانہ کو اپنے بارے میں بعض اوقات عجیب غریب روایتیں سن کر ہنسی
آتی ہے۔ چنانچہ بعض اصحاب ملک کو یہ یاد کرانا چاہتے ہیں کہ میرزا صاحب
کو اپنے سوا کسی سے محبت نہیں۔ اور میر سے اس قدر ارادت و محبت کا ثبوت
ان کی تحریروں سے ملتا ہے یہ محبت حقیقی نہیں ہے اس میں شاید کوئی
سی ہے داہ داہ داہ
ما نگنا ہے کھلے خزانے مانگ
لشہ گیری ہے اک انوکھا سانگ

سانگ لانا یا سوانگ لانا دونوں طرح فصیح کے روزمرہ میں داخل ہے۔
ریاکاروں کی زندگی پر تنقید ہے جو تارک الدنیا کا روپ بھر کر مذہب کی آڑ لے کر
مذہب بھیک مانگتے ہیں۔

نیت نیا بھیس نیت نرالا سانگ
پوچھنا کیا زمانہ سازوں کا
زمانہ سازوں کے ہاں استقلال کوئی معنی نہیں رکھتا۔ صبح سے شام تک کتنے بھیس

دیتے ہیں۔
شیخ کی کوتاہی ہے کل سیدھی؟
سہل متعجب کی عجیب و غریب مثال ہے۔ اونٹ سے اونٹ تیری کنسی کل سیدھی؟
"He has given so many familiar ideas
their first poetical life."

کس طلب میں چلا ہے بے شکل
صلح ٹھہری تو ہے برہمن سے
ایک اور ایک دو کسے سمجھائیں
مُرخے کی دہی اک ٹانگ۔ اس مثل کو اب تک شعر کا جامہ شاید ہی کوئی پہنا سکا
خصوصاً مصرع پر ایسا انوکھا مصرع لگانا ایک اور ایک دو بیگانہ کے سوا اور
کس سے ممکن تھا؟ غزل کی غزل طنز و مزاح میں ڈوبی ہوئی ہے۔
بانسری نے دلوں کو موہ لیا
کہاں بانسری کا نغمہ جان نواز کہاں موزن کی بے سُر سیم خراشی؟

اڑ چلے کیا فرشتہ انسان سے؟
سوانگ اڑان اس کی۔ اسکی ایک پھلانگ
پھلانگ ہندی کا ٹھٹھ لفظ ہے۔ مگر اس سے کیا کام لیا گیا ہے۔ انسان اور
فرشتہ کا فرق مراتب دکھایا گیا ہے۔ اتنے بھونڈے قافیہ کو بیگانہ کی فکر سامنے کتنی
اعلیٰ مغربی زندگی بخشی ہے۔ سبحان اللہ۔

پھرتے ہیں بھیس میں حسینوں کے
کتنا پیارا سین ہے۔ حسینوں کے جھٹکے کے جھٹکے دلوں پر ڈاکے مارتے پھرتے ہیں۔
کون دیتا ہے ساتھ مردوں کا
حوصلہ ہے تو باندھ ٹانگ سے ٹانگ
مردان عمل کی طرف سے چلنے ہے اُردو کے ٹھٹھ روزمرہ میں کہ جسے حوصلہ ہو
سامنے آئے ٹانگ سے ٹانگ باندھ کر چلے میدان میں۔ بھاگنے کی سہی نہیں۔

خواہ پیالہ ہو یا نوالہ ہو
بن پڑے تو جھپٹ لے بھیکٹ مانگ
تو انہیں اخلاق و مذہب جھوٹے۔ سچا اصل زندگی یہ ہے کہ جھپٹ لو بھیک
نہ مانگو۔ دنیا کے بڑے بڑے اولوالعزم اسی پر عمل کرتے رہے ہیں اور کرتے
رہیں گے *system of civil & social prudence*
may be collected from his works."

پیالہ بروزن نوالہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ مگر اردو زبان میں یہ لفظ کثرت
استعمال سے پیالہ بروزن لالہ بھی بولا جاتا ہے یعنی یاے مخلوط کے ساتھ۔ اسے
میرزا صاحب نے بھی جائز سمجھا ہے۔ اسی صورت میں کہ مفرد استعمال کیا جائے۔
مگر اضافت کی حالت میں (جیسے پیالہ مے) بروزن نوالہ ہی استعمال ہوگا۔ بظاہر

یہ غزل آسان نظر آتی ہے مگر سہل متنوع، ناقابل تقلید، زندگی سے لبریز
بول بالا رہے یگانہ کا نام باجے جگت کے چاروں دانگ

آہ پیندہ غریب آپ کو لگائے کیوں

آنہ سنے جو وقت پر وقت یہ یاد کیوں

شاعر نے جو درد محسوس کیا اسے پوری قوت کے ساتھ سننے والوں تک پہنچا دیا۔
اس طرح آرٹ کا حقی ادا کر دیا۔ جنہیں زندگی میں ایسا تجربہ ہو چکا ہے شعر سن کر
بے چین ہو جائیں گے اور آرٹ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

دوست کے انتظار میں دوست کو نیند آئے کیوں

بُوئے اُمید پاتے ہی رنگ بدل نہ جائے کیوں

روح پھر کب اُٹھتی ہے یہ مصرع سنئے ہی۔ بُوئے اُمید پاتے ہی رنگ بدل نہ جائے کیوں
کتنی سچی کیفیت نفسی ہے۔

کلمہ ٹھوں تو کیوں ٹھوں سب کی نظر کیوں ٹھوں

یا خدا تو دل سے ہو دلے زبان تنگ آئے کیوں

کتنا عجیب سوال ہے کلمہ ٹھوں تو کیوں ٹھوں۔ اور اس کا جواب کتنا صحیح اور کتنا
انوکھا۔ اندازِ بیاں کی سیادگی و فیر کاری منطق کی یہ شوخی حیران کر دینے والی چیز ہے۔

لاکھ عتاب کا جواب۔ ایک خلوص بندگی

چہن چین دوست کو دھیان میں کوئی لائے کیوں

یہ ہے میرزا یگانہ کا کیر کڑ۔ عتاب کا جواب۔ خلوص بندگی کس بے پروائی
کس لاڈلے پن کے ساتھ۔ اُونچ

اپنے خیال میں ہے خوش۔ دلی ضدیں دیکھئے

آپ کے دُور کیوں رہے آپ کے پاس جائے کیوں

دُور کیوں رہے اور پاس کیوں جائے؟ اللہ ری مند۔ اس اجتماعِ حنین کی صداقت
کو کس خوبی سے ثابت کر دیا ہے۔ رفتار خیال کے سامنے دُور کیا اور نزدیک کیا۔

خوابِ خیال سے ہو پاک نیند ہی ہو مٹھی نیند

نقشِ خیال نیک بد نیند میں تنگ لائے کیوں

میٹھی اور گہری نیند کا اتنا تنہا فلسفہ اک سادہ و برجستہ شعر کے لباس میں آج تک
نظر سے نہیں گزرا۔ دیکھئے ایک کے بعد ایک شعر ذہن کو کتنی ترقی دیتا چلا جاتا ہے۔

جیسے خالی کون ہے؟ حُسن کے لیے پوچھئے

اہل نظر کے سامنے آنکھ جھپک جائے کیوں

کون نہیں جانتا کہ عینیت کوئی خلی نہیں مگر اس کے ساتھ حُسن کے دلے پوچھئے
کتنا چمکتا ہوا فقرہ ہے جو یگانہ کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ مشاہدہ کتنا دلچسپ ہو
مگر خود اس مشاہدہ میں وہ لذت نہیں جو اس شعر سے پیدا ہے۔

"They are so senseless that they hear & do not
hear, they understand him & do not understand."

مُنہ جو ذرا اُتر گیا اور بھی گل میں گل کھلا

یوں ہی بقدرِ زوالِ حق حُسن بھی غم نہ کھا کر کیوں

مُنہ اُتر جانے پر یہ کہنا کہ اور بھی گل میں گل کھلا شاعرانہ احساس کی نزاکت اور
اندازِ بیان کی شگفتگی حد کمال کو پہنچ گئی ہے۔ اس پر یہ ستم ظریفی کہ حُسن کو بھی

بقدر ذائقہ غم کا مزا چکھا دیا۔ جان اللہ
دید کی التجا کر دوں؟ تشہ ہی کیوں جان دوں
پردہ ناز خود اٹھے۔ دست دعا اٹھائے کیوں؟
پردہ ناز خود اٹھے۔ یہ ہے عشق کا جذبہ خود داری یہ ہے عشق کی فستح۔ غالب
کی بعض بعض غزلوں پر میرزا صاحب کی غزلیں اپنے انفرادی رنگ میں لا جواب
ہیں۔ اس کے معنی نہیں کہ بیگانہ نے خود اپنے شوق سے، مقابلہ یا مسابقت کے
خیال سے یہ غزلیں کہی ہیں۔ نہیں یہ بیگانہ کی وضع نہیں کہ اوروں کا جواب لکھیں
یا منہ چڑائیں۔ بلکہ یہ سب غزلیں مشاعروں کی طرح غزلیں ہیں۔ جب طرح بھیجی
گئی تب اس پر فکر کی اور ہر جگہ اپنی انفرادیت کا ثبوت دے دیا۔ آیات و جدائی
میں ان غزلوں کو شامل کرنے کے معنی یہی ہیں کہ یہ غزلیں میرزا بیگانہ کی نگاہ میں
یقیناً غالب کی ہر طرح غزلوں سے زیادہ اور بہت زیادہ مکمل اور آرٹ کے جدید
معیار پر پوری اترتی ہیں۔ اگر غالب کی غزلوں کے مقابلہ میں یہ غزلیں ذرا بھی شست
ہوئیں تو کبھی میرزا صاحب انھیں آیات و جدائی میں شریک نہ کرتے۔
بھول بھی جا بھلا بھی دی یاد نہ کر خدا کو نا تیری زباں پہ بار بار نا بیگانہ آئے کیوں

دل لگانے کی بگ عالم ایجاد نہیں خواب کھولتے بہت دیکھے مگر یاد نہیں
تو یہ بھی بھول گئی عشق میں وہ مار پڑی ایسے اوسان گئے ہیں کہ خدا یاد نہیں
ایسے اوسان گئے۔ حواس گم ہو گئے۔ کیسے کیسے محبان وطن جو بہت بڑے بڑے کہ باتیں بنایا کرتے تھے۔

چشم عبرت میں کوئی خاک پتلا نہ چھا
نگہت گل کی ہے زقار ہوا کی پابند
سرسوریدہ سلامت مگر کیا کہئے
تللانے کا فرہ کچھ نہ تڑپنے کا فرہ
دشمن دوست آباد ہیں دونوں پہلو
کی محبت کے دل دوست ہو مدفن اپنا
فلک اور نہ اندیشہ فردا کی خلش
نہ ہیں مردہ پتروں میں ابھی تک غالب
سب کے سب میں نظری ایک بھی صادق نہیں
روح قالب سے نکلنے پہ بھی آزاد نہیں
دست فرما د نہیں تیشہ فرما د نہیں
ہیچ ہے دل میں اگر درد خدا داد نہیں
دل سلامت ہے تو کھڑے عشق کا برباد نہیں
کشتہ ناز ہوں میں کشتہ بیداد نہیں
زندگی اسکی جسے موت کا دن یاد نہیں
مگر استاد بیگانہ سا اب استاد نہیں

تو کیا ہمیں ہیں گنہگار حسن یا نہیں؟
لگا دوٹوں کا گنا ہوں میں کیا شمار نہیں؟

۱۔ ایک پہ بھی صادق نہیں ایک بھی قابل انتخاب نہیں۔
۲۔ ہیچ ہے وہ دل جس میں درد نہ ہو۔
۳۔ دل سلامت ہے تو دوست بھی ہیں اور دشمن بھی عشق کا گھر آباد ہے۔

شعر سنتے ہی برقی لہر دوڑ جاتی ہے۔ کیا انوکھا سوال ہے۔ ایک نہیں بلکہ تین سوالات
ایک شعر میں اتنے سادہ طور پر کہ اس سے زیادہ سادگی شعر میں بھی ممکن نہیں۔ کیا پتے کی تار میں
سبحان اللہ

امید لپٹی ہے جیسے کوئی بلا لپٹے مگر وہاں ہے نہیں کی وہی ہزار نہیں
بدل نہ جائے زمانہ کے ساتھ نہایت بھی سنا تو ہو گا جوانی کا اعتبار نہیں
جو غم بھی کھائیں تو پہلے کھلا میں دشمن کو اکیلے کھائیں گے ایسے تو ہم گنوار نہیں

گنوار کتنا بھونڈا قافیہ ہے۔ کس میں اتنی تخلیقی قوت تھی کہ بھونڈے لفظ کو اتنی تازہ
زندگی بخشا۔ ہم ایسے بے وقوف تو نہیں کہ غم کھانا پڑے تو اکیلے ہی کھالیں گے۔ نہیں پہلے
دشمن کو کھائیں گے۔ سبحان اللہ اس عالی حوصلگی اس ستم ظریفی کے کیا کہنے ہیں۔
"He has given ordinary words & phrases
meanings & operations never heard before"

کہو وہ بات دو گچی کہ بول بھی ہو دوں بھی زباں وہ کیا جو حقیقت کی پردہ دار نہیں
دیکھ لیا آپ نے؟ زندگی کے کیسے پتے اصول آرٹ کے زریعے ذہن نشین ہوتے
جاتے ہیں۔ الفاظ اتنے مختصر پھر بھی اتنے واضح اور انوکھے کہ سمجھنے کے لئے دماغ سوزی کی ضرورت
نہیں۔ یہ ہے عصر جدید کے طرز زندگی کی سچی تصویر۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ہر بات میں اک ٹرک
ہوتی ہے۔ اک سچ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں الفاظ کا مصرف دل کی بات کہہ ڈالنے کے
لئے نہیں ہے بلکہ چھپائے رکھنے کے لئے ہے۔ کھلا پھر اک ہیبت کچھ کہہ گئے اور پھر کچھ نہ کہا۔
دو گچی بات کہ یوں بھی مطلب نکلتا ہو اور وہ بھی۔ یہ ہے ادب جدید۔ آج بیکارڈ آرٹ

کے سو کوئی ادب جدید نہیں۔
نہ جانے ہتے پھر گئے گدھرہ دشمن دوست؟ بڑھا تو دل ہے وہ دریا کہ وار پار نہیں
جس کا دل بڑا ہوتا ہے دشمن دوست اس کی نگاہوں میں کب سماتے ہیں۔
کسی کی پردا نہیں ہوتی۔ وار پار کے قافیہ سے اتنے نازک معنی پیدا کرنا۔ آج تک
کسی کے خیال میں نہ آیا۔ الفاظ پڑائے مگر ادب نیا۔ اس کی معنوی وسعت کا کیا کہنا۔
کبھی حقیقت فرد اسنو تو کان کھلیں ندائے دل ہے کوئی دور کی پکار نہیں!
احقوں کے کان کھلیں تو کیونکر۔ آگاہی ہو تو کیونکر؟ دل کی آواز نہ پرکان دھرتے
کی توفیق بھی تو ہو۔ ہاں اک سیرید تھے ایسے۔

یہ خود کشی بھی تری، کھیل جو مشیت کا کچھ ایسی چلتی ہے جیسے چھری پہ دھار نہیں
اللہ ری فطرت کی ستم ظریفی۔ اللہ ری انسان کی مجبوری۔ خود اپنے گلے پر چھری
پھیرتا ہے مگر نہیں پھرتی۔ اور پھرتی بھی ہے تو اس طرح جیسے دھار رہی نہیں۔ یہ بھی
اک کھیل ہے مشیت کا۔ دیکھا آپ نے دھار کے قافیے سے کتنے نازک معنی پیدا ہو گئے
یہ ہے بیکارڈ کی حیرت انگیز تخلیقی قوت۔ "مشیت کے کھیل" سے کتنا انوکھا طرز پیدا ہے
سبحان اللہ۔ الفاظ پڑائے ادب نیا۔

سلامت آپ کا یہ حسن لازوال مگر ہم آج ہی کے ہیں۔ کل کے امیدوار نہیں
حسن و عشق لازوال ہوں یا نہ ہوں مگر بیکارڈ کا شعر تو لازوال ہے۔
کرے کار و درش نخل آزد کے دن؟ وہ بد نصیب جسے ذوق انتظار نہیں
دیکھئے یہاں ذوق انتظار کہا ہے تاب انتظار نہیں کہا۔
بیکارڈ میر وہی ہے جو پہلے مار چلے جو ٹھن گئی ہے تو اب تاب انتظار نہیں

اے سچ کہا ہے کہ نواں لکھنا شعر سن کر دل قابو میں نہیں رہتا۔

لڑائی ٹھن گئی تو اب سچ مگر کیسی؟ مارچلو۔
 "The best form of defence is attack; this is an acknowledged military principle."

خون کے گھونٹ بلانوش پئے جاتے ہیں خیر ساقی کی مناتے ہیں جئے جاتے ہیں
 اپنا حق تلف ہوتے دیکھتے ہیں مگر خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔
 ایک تو دردملا اس پہ یہ شاہانہ مزاج ہم غریبوں کو بھی کیا کھنے دئے جاتے ہیں
 ایک تو غریبی دوسرا تحفہ درد تیسرا شاہانہ مزاج فطرت کی غلط بخششوں کے

کیا کہنے ہیں نہ پیاس مگر پیاس ٹھکانے مجھے پیاس ہے یا کوئی ہو گا کہ پئے جاتے ہیں
 آگ بجھ جائے مگر پیاس ٹھکانے مجھے پیاس ہے یا کوئی ہو گا کہ پئے جاتے ہیں
 پیاس کی شدت دکھانے کے لئے "ہوکا" کتنا بر محل ہے۔ مگر بیگانہ کے سوا شاید ہی
 کسی کی ہمت پڑتی اس ٹھیکہ لفظ سے کام لینے کی۔

دولت عشق بھی مانگے سے کہیں ملتی ہو ایسے ہی اہل ہوس راندے جاتے ہیں
 راند دئے گئے یعنی نکال دئے گئے۔ اہل زبان کی نکسالی اردو ہے جواب فراموش
 ہو چکی ہے۔ پہلے مصرع میں کتنا عجیب و غریب سوال کیا گیا ہے؟

"Natural deficiency cannot be supplied."
 خوب سیکھا ہے سلام آپ کے دیوانوں نے شام دیکھیں سحر سحر کے جاتے ہیں
 محض سجدہ و سلام کوئی معنی نہیں رکھتے۔ فکر و نظر سے اسرار حقیقت کھلتے ہیں
 اور یہی ہے سچی عبادت۔

نشہ حسن کی یہ لہر ابھی تو یہ تشہ کا آنکھوں ہی آنکھوں میں پئے جاتے ہیں
 دل ہے پہلو میں کہ امید کی چنگاری ہے اب تک اتنی ہے حرارت کہ جئے جاتے ہیں

فلسفہ امید پر ایسا الہامی شعر دوسو برس میں شاید ہی کسی کے قلم سے نکلا ہو۔
 جل جلالہ۔ امید کی حرارت سب محسوس کرتے ہیں مگر اس راز کو اب تک ایسے
 مکمل شعر کے سانچے میں کسی نے نہیں ڈھالا۔ دل کیا ہے اک امید کی چنگاری ہے
 یہ چنگاری وہ سب جلی ہے۔ قدرت کا وہ راز ہے جو سب کے لئے یکساں کھلا ہوا ہے
 مگر اس کا سمجھنے والا بھی تو ہو۔ یہ راز جلی عموماً سہل سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے
 مگر شاعر کبھی اسرار قدرت کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ ان میں ڈوبا رہتا ہے۔
 ان کی تہ کو پہونچتا ہے اور دوسروں کو بھی آگاہ کرتا ہے۔ اس طرح زندگی کی لہر
 دوڑاتا رہتا ہے۔

دوبتا ہے نہ بھرتا ہے سفینہ دل کا دم الٹا ہے مگر سانس لئے جاتے ہیں
 کشمکش روحانی کی ایسی مجسم تصویر دیکھنے میں نہیں آئی چشم بصیرت ہی دیکھ سکتی
 ہے کہ اردو کی شاعری کے ارتقا میں بیگانہ کی فکر رسا اور معجز بیانی کو کتنا اثر دخل ہے۔
 کیا خبر تھی کہ بیگانہ کا ارادہ یہ ہے ڈوب کر پار اترنے کے لئے جاتے ہیں
 دشمنوں نے تو یہ سمجھ رکھا تھا کہ بیگانہ ڈوب چلے مگر یہ خبر نہ تھی کہ ڈوب کر
 پار اتر جائیں گے۔

زمین پاؤں تلے سے نکل گئی تو کیا ہم اپنی دھن میں زمانے سے بے خبر گزرے
 مزہ نہ پوچھئے دانش دل دکھائے گا کہاں کا خوف خدا اٹھالی تو کر گزرے

دل ایک ہی فتنہ ہے لیکن بیدار نہیں تو کچھ بھی نہیں
 ہاتھیں کس بل لاکھ سہی، تلوار نہیں تو کچھ بھی نہیں
 چپکے چپکے ریشہ دوانی یہ بھی کوئی میٹیتی ہے؟
 لٹکار نہیں تو کچھ بھی، جھنکار نہیں تو کچھ بھی نہیں

دو حریفوں میں میٹیتی (حریفانہ لڑائی) تو ہوتی ہے مگر میٹیتی کا مزہ جب ہے کہ
 مردوں کی طرح لٹکار کر د اور مردانگی دی جائے۔ عیاروں کی طرح چپکے چپکے ریشہ دوانی
 شریفوں کا کام نہیں۔

اپنی دفلی اپنا راگ، اپنی دُور ہے اپنی بھاگ
 کہنے میں بات آتی ہے سردار نہیں تو کچھ بھی نہیں
 حجام ہو جاتا ہے تلوار یا اک بال تو پیر ہا کر دیکھے
 اوزار نہیں تو کچھ بھی نہیں، مہتیار نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ہے غزل کی ملامت و مصلحت شاعری جو ہر زمانے میں اپنی صداقت کا لوہا
 منواتی رہے گی۔ کیا جستر کے کچھے ہوئے سمجھ رہے ہیں۔ اور اس طنز کے کیا کہنے ”اک بال
 تو پیر ہا کر دیکھے“ یہاں مردانہ عمل کو اک اصل بتانا مقصود ہے۔ ایسی صورت میں اس
 بات کا کس قدر کھنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ”حجام“ غزل کی زبان کا لفظ ہے کہ نہیں؟
 غزل بہت وسیع چیز ہے۔ محض مرد و عورت کے معاملات تک محدود نہیں میر تقی میرؒ نے
 بھی اک جگہ فرمایا ہے اور کیا خوب فرمایا ہے

دل میٹھے اس نالی بچے سے کوئی گھڑی جوا ہد تو جتنے بل ہتے ہیں سی ہی تیری حجامت ہو
 کہا کیا چو میں لیتا ہوں اور کیا کیا خالی دیتا ہوں
 دیکھنے والے پس پردہ سرکار نہیں تو کچھ بھی نہیں

کوئی قدر دان ہنر دیکھنے والا ہی نہیں تو داد کون دے؟ اول اول چو میں اٹھانا۔
 خالی دینا اور آخر میں دشمن پر کاری چوٹ مارنا اس ہنر میں برطانیہ کا جواب نہیں۔

کہو تو تنہا جی کے دکھا دوں دست بدل یا دست بکار
 ہاں مگر اپنے گوشہ دل میں یا رہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

کتنے عالی حوصلہ ہیں وہ لوگ جو وطن سے دُور دوست کی یاد کو کلیجے سے لگا
 (دست بکار) اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ جب درد سے مجبور ہو جاتے تو دل پر ہاتھ رکھ
 لیتے ہیں۔ درد محبت انسان سے بڑے بڑے کام لیتا ہے۔ یہ ہے زندگی کی شاعری
 یہ ہے یگانہ کا کس بل۔ انسانی زندگی کی جس منزل کا نقشہ اس شعر میں پیش کیا گیا
 ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ قومیں زندگی کی اس منزل
 سے آگے گزر چکی ہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں۔ اگر ایسا نہیں ہے اور ہرگز
 نہیں ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ شاعری ترقی یافتہ زندگی سے تعلق رکھتی ہے اور
 یہ ادب ترقی یافتہ ادب ہے مگر کتنے جاہل ہیں یہ ترقی پسند جو اس ادب کے کس بل کو
 دیکھتے ہوئے بھی انکار کرتے ہیں۔

دل سے خدا کا نام لے جا۔ کام لے جا دنیا کا
 کافر ہو، دیندار ہو، دنیا دار نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ہے غایت آفرینش۔ دنیا دار نہیں تو کچھ بھی۔ کیا حقیقت کبریٰ ہے۔ سبحان اللہ
شعر ضرب المثل کی حد کو پہنچ گیا۔

مخراہوں میں سجدہ واجب حُسن کے آگے سجدہ حرام
ایسے گنہگاروں یہ خدا کی مارت نہیں تو کچھ بھی نہیں
مخراہوں میں خدا کی یاد کوئی معنی نہیں رکھتی۔ خدا کی ماریسے گنہگاروں پر جو خدا کی
قدرت (مشاہدہ حسن) سے منہ موڑ کر خدا کو یاد کرنا چاہتے ہیں۔ جھوٹ بالکل جھوٹ
دیکھو سچی عبادت یہ ہے۔ دوسو کہتا ہے:-

"I got up every day before sunrise. I inclined
through a neighbouring orchard to a very pretty
path. During my walk I offered my prayer which
did not consist merely of idle stammering
words, but of a sincere uplifting of heart to the
Creator of this delightful Nature, whose
beauties were spread before my eyes. I never
like to pray in room; it has always seemed
to me as if the walls interposed between myself & God.

I love to
contemplate
on His works."

بات یہ کچھ دشوار نہیں، دشوار نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایک جھلمک ہی دکھلا دے تو دُور سے جھلمک سلام کروں
اُس پار جلالت کے ہوگا کوئی، اس پار نہیں تو کچھ بھی نہیں
جتنے کچھ جاؤ گے اتنا ہی لپٹتا جاؤں گا
انکار کی لذت آہا ہا انکار نہیں تو کچھ بھی نہیں
ارنی ولن ترانی۔ اُدھر سے انکار اُدھر سے اصرار۔ اللہ رے ناز و نیاز۔

دل شکنی یا بُت شکنی تو یاد ہے اتنا یک یاروں کو
دست یگانہ تیرے گلے کا ہار نہیں تو کچھ بھی نہیں

زحمتِ سجدہ ہے فضولِ تنگدہ حجاز میں ہوگی نماز کیا قبول کعبہ خانہ ساز میں؟
اس زمین میں یہ مطلع یادگار رہے گا۔ کعبہ خانہ ساز اور زحمتِ سجدہ کی ایک ہی کہی۔
اس طنز کے کیا کہنے۔

دیکھ کے حُسنِ خوبِ زشت انجمنِ حجاز میں ہوش و خرد ہیں مبتلا رحمتِ امتیاز میں
خوب و زشت اعتباری الفاظ ہیں۔ ایک ہی چیز بعض اعتبار سے خوب اور بعض
اعتبار سے زشت ہے۔ جسے زشت کہتے ہیں وہ بھی نگاہِ عارف میں حُسن رکھتا ہے۔ قدرت
کی اس بوالعجبی نے اہل نظر کو زحمتِ امتیاز میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کوئی شے اپنے فہمِ مطلق
کے اعتبار سے ہمہ تن خوب یا ہمہ تن زشت نظر نہیں آتی۔

واہ سے مطمح نظر واہِ ری سیرِ مختصر کعبہ سے دیر کا سفر زندگی دراز میں
خانہ کعبہ الفراق۔ قبر حسین ابوداع رہ چکے ہم عراق میں بس چکے ہم حجاز میں

وعدہ دلفریب یا تردد بعد وقت
نفس کے گفتگو سے صلح، جنگ و مصالحت؟
کون سے کوئی فیہ ہے عقل زمانہ ساز میں
نفس سے صلح کرنا خود اپنی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ نفس کو ہمیشہ دبائے رکھنا اور اس
سے جنگ کرتے رہنا چاہئے۔ مگر زمانہ سازوں کی کمزوری اپنے نفس سے جنگ کرنے کی
تاب نہیں لاسکتی۔ یہ ان کی عقل کا فتور ہے۔

داؤد حشر ہوشیار، دونوں میں امتیاز رکھ
بندگانہ و طفلانہ شوخی کے ساتھ داؤد حشر کو مخاطب کیا ہے کہ بندہ ناامید اور
بندہ بے نیاز میں امتیاز رکھ۔ وہ بندہ جو تیرے فضل و کرم پر بھروسہ کر کے شان بے نیازی
دکھاتا ہے اس بندہ سے کہیں بہتر ہے جو تیری رحمتوں سے ناامید اور تیری غایتوں کا
قابل نہیں ہے۔ ناامیدی وہ جرم ہے جو قابلِ عفو نہیں اور بندہ کی شان بے نیازی تو
محض اک طفلانہ شوخی یا لاڈلا پن ہے۔ سبحان اللہ اس بندگانہ گستاخی میں کیا شانِ عبودیت
پہنا ہے۔ برخلاف اس کے میرزا غالب کہتے ہیں۔

زندگی اپنی اسی طرح جو گذری غالب
ہوتا ہے بند اک در کھلتے ہیں صد ہزار در
خدا کی پناہ۔ بعض اوقات انسان فرط ناامیدی میں خدا کے فضل و کرم کی طرف سے
بدگمان ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ مصرع (اپنی طرف سے شک نہ کرنا) پیش نظر ہو جائے
اور انسان غور کرے تو خوف کے مارے روٹے ٹھٹھے ہو جائیں۔ ناامید ہو جانے کے معنی تو یہ
ہوئے کہ ہمیں نیتِ کار ساز میں شک ہے۔ اس کی غایتوں پر بھروسہ نہیں ہے سبحان اللہ

خدا پر یقین کامل رکھنے کی کتنی صحیح تعلیم ہے۔ یہی کار سازی ہی
وہ شے ہے جس کا تجربہ ہر انسان کو ہوتا رہتا ہے چاہے وہ دہریہ ہی کیوں
نہ ہو۔ اسی Providence کی بدولت انسان کو خدا کی ہستی پر یقین لانا
پڑتا ہے۔

بندہ خود شناس اپنے ہی سر میں مست
بچے خودی کو دخل کیا پیشگیہ ایاز میں
اٹکے تصرفات عشق آگے دھواں نہ ہو
ڈوبے ہوئے ہیں سنگدل لذتِ سوز ساز میں
ارتقاے ادب کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ ایک ایک لفظ پر روحِ سخنوری و جذب
میں آتی ہے۔ آگ لگے دھواں نہ ہو۔ یہ ہیں تصرفات عشق کہ سنگ دل سے سنگدل
بھی لذتِ سوز ساز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یادِ خدا کا وقت بھی آگے لگائی یا نہیں؟
یادِ گناہ کب تک شام و سحر نمازیں؟
ذرا سوچو تو سہی نمازیں بھی تجھیں اپنا اور اپنے گناہوں کا تصور بندھنا ہوا
ہے تو پھر یہ نماز کیا ہوئی اپنی عرض اپنا دھندا ہوا۔ نماز تو محض یادِ خدا کا نام ہے۔
اپنے گناہوں کا تصور جب تک بندھا ہے قیدِ خودی سے آزاد کیونکر کہے جاسکتے
ہو۔ اپنی خودی کو ترک کر کے ہستی مطلق کی طرف لو لگاؤ جب تمھاری نماز پر نماز کا
اطلاق ہو سکتا ہے۔

شعر پر غور کرو شاعر کے مطلع نظر کو سمجھو اس سے بڑھ کر شانِ عبودیت اور کیا
ہوگی۔ نماز کے متعلق جس کے احساسات اتنے بلند اتنے صحیح ہوں اگر وہ رسمیات
مذہب کی ظاہری پابندیوں میں کوتاہی بھی کرے تو کیا اس کے ایمان میں شک

ہو سکتا ہے محض اس وجہ سے کہ وہ عملی طور پر سمیات مذہب کی پابندی نہ کر سکا۔
نہیں نہیں ہرگز نہیں۔

دیکھو ایسے شخص کی نسبت جو چاہے کہے مگر بارگاہ خداوندی میں اس کے احساسات معتقدات بھی کچھ وزن رکھتے ہیں بلکہ حق تو یہ ہے کہ معتقدات و احساسات بھی انسان کے اعمال میں شامل ہیں۔ انگلستان کا مشہور و معروف سخنور رابرٹ براؤننگ بھی اس حقیقت کی تہ کو پہنچ چکا ہے کہ انسان کے خیالات بھی اس کے اعمال ہی میں داخل ہیں۔ چنانچہ اپنی ایک نظم میں بن عذرا کے ایک بند میں کہتا ہے۔

دنیا والے ان خیالات سے بالکل بے خبر رہتے ہیں جو انسان کے دل میں پوشیدہ رہتے ہیں۔ خواہ ان میں کتنے ہی اعلیٰ مقاصد پاکیزہ منصوبے اور تخیلات ہی کیوں نہ ہوں۔ چونکہ وہ عمل کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتے اس وجہ سے دنیا میں ان کی کوئی قدر قیمت نہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ بھی انسان کے اعمال میں شامل ہیں۔

میرزا صاحب کا فلسفہ نماز (جو محض انھیں کے احساسات کا نتیجہ ہے) بھی کیا عجب ہے بارگاہ احدیت میں مقبول ہو کر ان کے اعمال میں لکھا جائے کیونکہ اب تک نماز کا ایسا اعلیٰ مقصد اور کسی نے پیش نہیں کیا۔ شادی مرگ ہو گئے عید کے دن نماز میں سجدہ اولیں میں یاس پاگم داد بندگی

ذرا اس بندہ خوش نصیب پر غور کرو جس عید کی نماز پڑھ لیا کرتا ہو اور نصیب کہ پہلے ہی سجدہ میں داد بندگی پا گیا سجدہ قبول ہو گیا۔ ایسا خوش نصیب کیوں نہ شادی مرگ ہو جاتا؟ یہاں یہ بھی بتا دینا ضرور ہے کہ بعض لوگ اس شعر میں "شادی مرگ" کو اضافت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ مگر یہاں اضافت نہیں ہے

اضافت مقلوب ہے لہذا "شادی مرگ" پڑھنا غلط ہے۔ اس مصرع کے رکن اول کی تقطیع مفتعلن پر نہیں بلکہ مفعولن پر ہوگی کیونکہ یہاں تسکین اوسط کا رزق واقع ہوا ہے اور یہ فن عروض کا مسلم مسئلہ ہے جس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر بگوں ترقی پسندوں کے تخریبی دور میں اس قسم کے علمی نکات پر کون دھیان دیتا؟
حسنِ فطرت بولتا ہے پردہ اسرار میں

معنی بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خارج میں

اے سیند کے ماتوں کو بیداری کا بیغا کہہ بچانے والے سخنور معجز ہیاں، تدریس تیری زبان میں کیا تاثیر و بیعت کی ہے کہ جو لفظ منہ سے نکلتا ہے نغمہ جان نواز کا حکم رکھتا ہے۔ خدا دیکھو تو ہسی حسنِ فطرت کا بولنا (کتنا اچھوتا انداز کلام ہے) اور پردہ اسرار میں بولنا اور زبانِ خارج سے معنی بے لفظ کا پیدا ہوتا، ان الفاظ میں کونسا انجاز ہے کہ انسان سننے ہی عالم وجدانی میں پہنچ جاتا ہے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بھی کیا خوب فرمایا ہے

برگ درختان سبز در نظر پوشش یار
ہر درختی دفترست معرفت کردگار
کہتے ہیں سعدی کا یہ شعر عالم بالا میں ایسا مقبول ہوا کہ فرشتوں کا وظیفہ بن گیا۔ مگر میرزا صاحب کا یہ شعر میں کر جو نشہ معرفت چھا جاتا ہے اور ارشاد کے اعتبار سے یہ شعر جس حد کمال پر پہنچا ہوا ہے کیا شیخ شیراز کا شعر بھی سچ کہو اسی مرتبہ فرمایا ہے؟ انصاف سے دیکھو گے تو اس سوال کا جواب نفی کے سوا اثبات میں نہ دے سکو گے۔ یہ وہ شاہکار ہے کہ عالم بالا سے اس کی داد نہ ملے تو کہنا پڑے گا

”سخن فہمی عالم بالامعلوم شد“

”He displays that comprehension & expansion of thought which at once fills the whole mind, & of which the first effect is sudden astonishment & the second rational admiration.“

ذوق جتنا ہے جتنی تک بہار رنگ تو دل ہو جتنا دل جتنی تک کھٹکے گا خاں
کیا جیسا نہ احساسات ہیں۔ زندگی کی تمام کیفیات بے دراحت محض اپنے
احساسات کے دم سے وابستہ ہیں۔ دل ہی مردہ ہو گیا تو پھر نہ پھولوں کی ہنس
کوئی کیفیت رکھتی ہے نہ کانٹوں کی کھٹک آفاقی حقایق کا یہ وہ آئینہ ہے جسے
دیکھ کر حیرت ہوتی ہے حیرت۔

نشہ بیک رنگ میں توں نہیں کیا دو بے ہوئے کیسی جنگ لگ گئی ہے کافرو دیندار میں؟
قدرت نے شاعر کو کچھ اور ہی لگا ہوا عطا فرمایا ہے۔ وہ جنگ کافرو دیندار کو
یوں دیکھتا اور دکھاتا ہے کہ یہ جنگ فی الحقیقت کوئی جنگ نہیں ہے بلکہ
دونوں پر اک نشہ بیک رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اسی بیک رنگی کے نشہ میں وہ جنگ لگ گئی
کر رہے ہیں۔ بادی النظر میں جو جنگ دکھائی دیتی ہے وہ محض اک نہایتی تماشا
ہے۔ سچا نہ کہنا اچھوتا نقطہ نظر کیا حیرت انگیز انداز فکر ہے۔ شاعر کی فطرت
میں یہ خداداد ملکہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی حقیقت کو جو اور اور طرح سے ثابت ہو چکی
ہے بالکل نئے انداز سے ثابت کرتا ہے۔

غفلتِ اعز میں اندیشہ فرما ہو کم نشہ اتنا ہو کم از کم وعدہ دیدار میں

نواب شیریں کی ہوس کیا خواب کا خوف کیا
سچکی اب نیندا اپنے دیدہ بیدار میں
جو اتنا بیدار ہو چکا ہو اسے نیند کیا آئے گی۔ خواب کا خوف کیا ہو گا۔؟

ناخدا کچھ زور طوفان آزمائی بھی دکھا
فکر ساحل چھوڑ کر ڈال دے منہ صاف میں
یہی وہ منچلا پن وہ ادنیٰ لغری ہے جس کی بدولت کتنے طوفان سرے گزر جاتے
ہیں اور آخر بڑا پار ہو جاتا ہے۔

مفت دن گئے کو ہم پکڑ گئے بیکار میں
مگر کھٹے کیلے ہیں۔ وقت کٹنے کیلے

”Says very wisely, It is ten o' clock
thus we may see, how the world wags,
'Tis but one hour ago since it was nine;
And after an hour more 'twill be eleven;
And so from hour to hour we ripe & ripe,
And from hour to hour we rot & rot (Shakespeare)”

دیکھی آپ نے شکسپیر کی شاعری۔ یہ شاعری محض خیالات کے لحاظ سے
ہے یا فن شعر کے اعتبار سے؟ اس شاعری میں اور شعر میں کتنا فرق ہے۔ شکسپیر
کے ان چھ مصرعوں کے مقابل بیکاز کے ان دو مصرعوں کو دیکھئے۔ کتنا جامع و مانع اور
مکمل شعر ہے آرٹ کی تمام پابندیوں کے ساتھ Original بھی اور
Universal بھی۔ بیکار کے بھونڈے قانے میں اتنا غیرت انگیز فلسفہ
بیان کر جانا اس خوبی کے ساتھ کہ بد مذاقی کو بونگ نہ آئے یہ وہ مشکل مقام ہے کہ
بعض اہل زبان بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ مگر یہاں مصنف نے وہ کہاں دکھایا ہے

کہ شعر سننے ہی سنا دیا دڑ جاتا ہے۔ یہ ہے یگانگی تخلیقی قوت۔ ایک سدھارن سی بات کو ادب عالیہ کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔

یاس گمراہی سے اچھی رحمت و اماندگی ڈال لو زنجیر کوئی پائے کج رفتار میں

کیا چل سکے گی بادِ مخالف مزار میں

جلتا ہے دل جلوں کا چرخِ اس دیار میں

اے کہتے ہیں مطلع المانوار سوز و گداز کے ساتھ کلام کا بانگین خواجہ آتش رح کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑی ہو

یسا کجا کجا کجا طلسماتِ عنصری

کس گل پہ ہے یہ خاک کا پتلا بنا ہوا

بیوند خاک ہوئے کا اللہ کے اشتیاق

شرمندہ کفن نہ ہوئے آسمان سے ہم

آسمان نے کفن تک سے محروم رکھا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ سایہ دیوار یار سے

زیادہ مبارک کفن اور کیا ہو سکتا ہے۔

کہتے ہو اپنے فعل کا مختار ہے بشر اپنی تو موت تک نہ ہوئی اختیار میں جو قدر کے فلسفہ کو آج تک کوئی سمجھا نہ سکا مگر مصنف نے دو نقطوں میں

پر چھا دیا۔ سبحان اللہ۔
دنیا سے یاس جانے کو جی چاہتا نہیں واللہ کیا کشتش ہو اس اُٹرنے یار میں
"He is universal, he is everlasting, he will survive."

مجدوب کی بڑ

ہارنے والے کبھی کافر دیندار نہیں

فاتحِ مستی میں یہ ہوتی کہ الہی توبہ

سب اسیرانِ قفس نگاتے ہیں صیاد کا گن

کشتیِ دل ہے کہ باز کچھ طوفان ہو س

لاسی غفلتِ مروت قیامت کی خبر

ایسا گھر انہی زمین اپنا فلک بیگانہ

وقت کی بات ہو وقت آئے تو سب آسان ہے

بعد اکر تاہوں ناحق کبھی کرتا ہوں دعا

دستِ نخل کو دخل ناممکن خطِ تقدیر میں

جائے نقطہ بھی نہیں باقی کسی تحریر میں

انسان کا ہاتھ خطِ تقدیر میں کوئی تصرف کر سکے کیا مجال۔ یہی بات عام طور پر

یگانہ آرٹ پر بھی صادق آتی ہے کہ کوئی نقطہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اتنا مکمل!
 "with all the comprehension & expansion of thought
 he has been acknowledged the most correct of all poets."

دیکھئے انجام کیا ہوتی ہو وہ کام کا؟
 خود کشی بھی نہ آئی پھر دوا پینا پڑی
 کافر و دنیا پرستی رشتہ واحد وہی
 آئینہ دکھلا رہا ہے صورت آباد جہاں
 شوخیں کیا کیا دکھائیں شہت خاکسے
 خاک پتلا بھی یوں تائیں بنانا کیا بجال
 اصل کا آگے قریب نقل چل سکتا نہیں

جان پیاری تھی حیات جاوداں پیاری نہیں
 دیکھتے ہی دیکھتے بدلانے کا یہ تلک
 چھوڑ جائیں کہاں اپنے دیرانے کو ہم
 صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ مٹ جائیگا غلغ

زندگی کیا ہوتی کی جب گرم بازاری نہیں
 پھولوں میں خوشبو جیسو نہیں فاداری نہیں
 کونسی جا ہے جہاں حکم خزاں جلدی نہیں
 دل یہ کہتا ہے کہ مجھے کی جیگراری نہیں

جلوہ گرہ منے لگا چشمِ تصو میں کوئی
 جھیل لینگے سحر کے مارے کیا کا بھی ن
 حضرت شل بے سبب تو نکی بیدار نہیں
 آجکی شب تو کٹے پھر کوئی دشواری نہیں

نیچے کچھ بھی ہو لیکن ہم اپنا کام کرتے ہیں
 چلیں کیوں دور کرنا دان کی کوکریں کھائیں
 جہنم میں بھی جلنے کیلئے حاضر میں مردانے
 تمھارے واسطے کعبہ تو کیا ہڈی بھی حاضر ہو
 یہ کس کو پرہیزگاروں ناسخ بگینا ہوں کا؟
 جھاکوں اب کی لگی شوق شہادت میں
 ہزاروں مر کے زندہ ہو چلے گوشتنا میں
 دل پران میں ایک شہرستانِ تخیل ہے
 دل وحشی بغیر انکے نہ سہا ہے نہ پہلے گا
 نہیں دیکھا ہے لیکن غائبانہ لاکہ دل کو
 مبارک ہو تصور کو تو سری تصویر کا سودا

سویرے ہی سے دُور اندیش فکر نہ کرتے ہیں
 بلند و ستِ عالم کو عبت بنا کرتے ہیں
 کہیں اہل ہوس اندیشہ انجام کرتے ہیں
 مسلمان بھی کہیں پروا نہ انگ نام کرتے ہیں
 وفاداروں کی ضد سے آپ قتل عام کرتے ہیں
 ہم اپنے ہاتھ سے لبریز اپنا جاکرتے ہیں
 ہم ایسے سخت جال اس خاک کو بندا کرتے ہیں
 اسی زنداں سے ہم سیرِ حرم عام کرتے ہیں
 یکس ہوا ز کینہِ موت وہ میر نام کرتے ہیں
 جھبی تو لوگ تیز ذکرِ صبح و شام کرتے ہیں
 کہیں اہل نظر ایسا خیال خام کرتے ہیں

نگاہوں گرا یا یاس کو کجنت اسی نے
اسی لگی بدولت لوگ کیا کا کرتے ہیں

رسم دنیا نہ سہی فرض ادا کرتے ہیں
ہاتھ اٹھے یا نہ اٹھے دے دعا کرتے ہیں
حضرت ل میں عجب ظالم مظلوم نما
گھر جلا کر کفِ افسوس ملا کرتے ہیں
دیکھنا یہ ہے کہ سرگشتہ سعی باطل
کیا علاج دل دیوانہ بنا کرتے ہیں
سچ کوئی دیوانہ ہو تو علاج بھی کیا جائے
گر چھوٹ موٹ کسی مصلحت سے دیوانہ
بن گیا ہو تو اس کا کیا علاج ہ جا رہ سازوں کی سعی کو شش بیکار جائے گی۔
عمر بیداری موہوم کے دھوکے میں گئی
اب جو چونکے ہیں تو آپ پناہ کا کرتے ہیں
جسے بیداری سمجھتے تھے افسوس ہے وہ بیداری نہ تھی۔ بیداری موہوم بھی جاگتا
خواب تھا۔

لذتِ مژدہ فردا میں جو ہیں ڈوبے ہوئے
طعنہ غفلت امروز سنا کرتے ہیں
امید افزا مستقبل کے مزے میں ایسے ڈوبے ہوئے ہیں کہ آج کی خبر نہیں۔
اس بے پروائی پر لوگ طعنے مارتے ہیں مگر وہ پیپ چاپ سنتے ہیں۔
دیکھ کر دُور سے مستقبل روشن کی جھلک
جان نظارہ اول پہندا کرتے ہیں
بے اجل منزلِ فانوس پہنچوا لے
جان کیا دیتے ہیں اک رسم ادا کرتے ہیں
موت تو ان کی قابلِ رشک ہے ہوشا ہر مقصود سے ہم آغوش ہو کر دل کی لگی

بجھالیتے ہیں۔ ان کا مزنا کیا جو اپنی منزل سے دُور سرٹپک پٹک کر جان دیتے ہیں۔
اک رسم سی ادا کر لیتے ہیں۔

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے۔ اب ترک دعا کرتے ہیں

اللہ اللہ یہ شعر کیا کیا ہنگامہ برپا کر چکا ہے۔ ایک بار نہیں۔ بارہا یاروں کو
ہندوستان کے مختلف مقامات پر محسوس ہو چکا ہے کہ اس بیسویں صدی میں
لیکنا کے سوا کوئی حقیقی شاعر نہیں۔ کس دیکھے ہوئے دل سے یہ شعر نکلا ہے۔ دوسرے
مصرع سے کیا لاڈلا پن ٹپکتا ہے لے دعا کر چکے دیکھ لی تیری خدائی۔
ناخدا تیرے ارادوں میں خدا برکتی یاس اک مرتبہ پھر قصد دعا کرتے ہیں

یکساں کبھی کسی کی دگر زنی مانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں
میرزا سودا کے مطلع کے بعد اس مطلع کو جو حسن قبول عطا ہوا ہے شاید ہی
اور کسی کو نصیب ہوا ہو۔ میرزا سودا فرماتے ہیں
ناوک نے تیرے صید چھوڑا زلے میں
کس چیز کی کمی ہے سخی کے خزانے میں
صدے دئے تو صبر کی دولت بھی بگاڑ
خاک اڑ رہی ہو چاروں طرف قید خانے میں
دیواریں پچاند پچاند کئے یوانے چل بے
دلیکسی قفس کی کہاں آشیانے میں
صیاد اس سیری پہ جو جان میں فدا

افسردہ خاطر کی خزاں کیا بہا کیا
کنج قفس میں مرے یا آشیانے میں
ہم ایسے بدمصیب کہ ابتک نہ مر گئے
آنکھوں کے آگے آگ لگی آشیانے میں
رہو کے جیسے کان میں کہتا ہی کوئی
ہو گئے قفس میں کل جو ہیں آج آشیانے میں
دیوانے بن کے ان کے گلے سے لپٹ بھی جاؤ
کام اپنا کر لو یا اس بہانے بہانے میں

خدا معلوم کیا سحر تھا اُس تب کی چوٹیں
چلا جاتی ہیں تیک چٹکیں شیخ و برہیں
لکھنویوں جو ہرگز میں تم دیکھ لیتے ہو
لکھنات ہیں گلی طرح ہم حتم دشمن ہیں
گلا گھٹنے دکا اب تنگ آیا ہوں گریباں
جوں وہ کیا بچا نسی لگائی میری گردنیں
بہت دستِ جنوں لگدگیا جب کیا کرتے
اُناریں بٹریاں اور ہنسنے دہر طوق گردنیں
جبابِ نازیجا یا اس جسدِ سچمیں آیا
اُسی دن لڑائی گھن گئی شیخ و برہن میں
یہ غزل اور اس سے پوئہ چھ شاخوں میں ابتدائی دور کی ہیں جن میں بقول پر فرید محزون
گور کھپوری دور اُسی کے بھی بہترین عناصر پائے جاتے ہیں مگر گیارہ مستقبل کی
تعمیر میں نگے ہوئے ہیں۔ یہ قول صحیح ہے مگر پھر بھی اس پرانی یادگار میں ایسے ایسے
اشعار موجود ہیں جو ہر زمانے میں زندہ رہیں گے۔ غالب انھیں
چند یادگاروں کو پیش نظر رکھ کر میرزا صاحب کے اک دوست

مستر گھنٹی سہائے فراق گور کھپوری نے اپنے مکتوب میں میرزا صاحب کو یہ باور کراتا
چاہا تھا کہ ان کی شاعری گویا دورِ حاضر سے الگ ہے۔ پرانی یادگار ہے۔ ظاہر ہے کہ
یہ خیال کتنا گمراہ کن اور حقیقت سے کتنا بعید ہے۔ اس غلط فہمی کی زد میں میرزا یگانہ
کا اک مکتوب جو اک ادبی مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں بعض بڑے بڑے ادبی
مسائل حل کر دئے گئے ہیں قابلِ دید ہے اور جسے اڈیٹر صاحب نیز نگ خیال لاہور
نے اپنے اک مختصر نوٹ کے ساتھ نومبر ۱۹۲۷ء کے پرچے میں شائع کیا تھا بعد نظر ثانی
اس کتب میں شامل کیا جاتا ہے۔

شعراے حال میں یگانہ کا درجہ

”کیا یگانہ کی مزاحیہ رباعیاں اور پیلاک کو غالب پرستی سے روکنا یگانہ
کے کمال شاعری سے انکار کا سبب ہو سکتا ہے؟
اک ناقد نے دورِ حاضر کے غزل گو شعرا میں اصغر۔ جگر۔ حسرت اور
فانی کو چودہ درجہ دیا ہے اس کا جواب بھی اس مضمون میں موجود ہے۔
بلاشبہ میرزا یگانہ لکھنوی کا درجہ غزل گو شعرا میں بے انتہا بلند ہے
اور انھوں نے اردو اور مکرہ قسم کی غزل گوئی سے شاعری کو نکال کر
حقیقی آرٹ تک ترقی دے دی ہے۔ ذیل کا مضمون میرزا یگانہ کے قلم سے
اس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے۔ (اوارہ)“

مکتوب یگانہ

۳۱ مئی ۱۹۳۸ء - سیلو۔ (دکن)

کرم فرمائے بندہ۔ سلام شوق۔ عرصہ ہوا نگار کے اک پرچہ میں آپ کا اک بیضا مضمون غزل گوئی کے موضوع پر نظر سے گزرا تھا جس کا تھوڑا سا نقش ذہن پر رہ گیا ہے۔ فن غزل کی حیات میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اور جدید فیشن کی نظموں کو جس طرح تیار کیا ہے مجھے اس سے اتفاق ہے۔ اور آپ کے جواب میں ڈاکٹر عندلیب شادانی نے رسالہ ساتی دہلی میں غزل کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ مگر آپ کے دور حاضر والے غزل گویوں مثلاً حسرت موہانی اور فانی وغیرہ کی جیسی قلعی ڈاکٹر عندلیب نے کھولی ہے اس سے مجھے بہت کچھ اتفاق ہے۔ اور ہونا چاہیئے۔

زمانہ دراز کے بعد غزل کی حیات میں آپ کی یہ مضمون نگاری ہلک فلیک نیک ہے۔ یہ دیکھ کر کہ غزل کی اہمیت کا آپ کو کافی اندازہ ہے میں آپ کی قدر کرتا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ محض انگریزی لٹریچر کے مطالعہ پر اکتفا کر کے (ایرانی لٹریچر سے بے خبر رہ کر) فن غزل گوئی پر تبصرہ کرنا "سنسنی خیز" تو ہو سکتا ہے مگر پایہ اعتبار کو نہیں پہنچتا۔

مائی ڈیر فزاق میں وہ شخص ہوں کہ شعر و سخن کے معاملہ میں اختلاف رائے کا موقع آئے تو نہ دوست کا لحاظ کرتا ہوں نہ دشمن کی پروا۔ یہاں دوست دشمن ہلک گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ تلوار کی آنج گیللا سوکھا نہیں دیکھتی۔ غالب جیسی بلند شخصیت کا

میں نے لحاظ نہیں کیا۔ آپ نے اپنے مضمون میں مولانا حسرت موہانی کی مدح میں کچھ ویسے ہی مضحکہ انگیز غلو سے کام لیا ہے۔ جیسے غالب کی مدح میں جو اس باختمہ۔ بجنوری کی بکو اس کہ ہندوستان کی آسمانی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدس دوسرا دیوان غالب۔ حسرت موہانی سے میں بھی واقف ہوں ایک اوسط درجہ کے شاعر ہیں ان کی شاعری میں جان کتنی؟ ان کی فکر کی رسائی کتنی؟ بڑا شاعر ہونا تو بڑی بات ہے حسرت تو حضرت آرزو لکھنوی کو بھی نہیں پہنچتے۔ گزشتہ ۲۵ سال کی مدت میں میں نے کسی زمانے میں حسرت کی شاعری میں وہ زور شور نہیں دیکھا جو اک حقیقی شاعر میں ہوتا ہے حسرت کی سپاٹ شاعری کے متعلق آپ کی عجیب بلند آہستگی دیکھ کر میرا خیال اور بھی راسخ ہو گیا کہ فن شعر و سخن پر کوئی صحیح محاکمہ کرنا آپ کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ آپ کچھ فیشن کی رد میں یہ بھی جاتے ہیں۔ انگریزی لٹریچر میں آپ کا مطالعہ کتنا ہی وسیع ہو جب تک آپ ایرانی لٹریچر کے ماسٹر نہ ہوں گے کبھی آرزو شاعری پر صحیح محاکمہ نہ کر سکیں گے۔ بقول شخصے "لکھنوی نوپورٹی کے اک پروفیسر" آپ کا مضمون دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مضمون نگاری کرتے وقت سوچتے ہیں انگریزی میں اور لکھتے ہیں اردو میں۔ غالب پر بھی فارسی کا رنگ اتنا چڑھا ہوا تھا کہ وہ سوچتے تھے فارسی میں اور لکھتے تھے اردو میں۔

مائی ڈیر ظاہر ہے کہ میرے آپ کے ظاہری تعلقات میں کسی امر ناگوار کو دخل نہیں ہے۔ مگر دوستانہ تعلقات کے باوجود میں اور آپ اپنی اپنی جگہ شخصی رے پر قائم رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر آپ میری شاعری کی نسبت کوئی رائے قائم کرنے کا جائز حق (اپنے خیال کے بموجب) رکھتے ہیں تو میں بھی اپنی نسبت رائے قائم کرنے کا حق

رکھتا ہوں۔ آپ نے اپنے غایت نامہ میں میری شاعری پر جو کچھ بھی رائے ظاہر فرمائی ہے غالباً نیک نیتی ہی پر مبنی ہوگی مگر کیا کہئے آپ کی اس رائے کی نسبت میری رائے یہ ہے کہ آپ کے قلم نے دانستہ نہ ہی نادانستہ یگانہ آرٹ جسی حقیقت سے انکار کیا ہے یا یہ کہ مجھے چڑھائے دکھایا نہ بنانے کے لئے یہ دل لگی کی ہے۔ خیر کج مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ میرے آپ کے درمیان کتنی بڑی خلیج حامل ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ آپ جیسے وسیع المطالعہ شخص کی رائے سے میری کچھ اصلاح ہوتی کچھ اثر پڑتا مگر افسوس ہے کہ مجھ پر آپ کی رائے کا کچھ اثر نہ ہوا بلکہ آپ کی اس الٹو انسی رائے پر مجھے میرزا صاحب اسفہانی کا اک شعر یاد آگیا ۵

جائے حرم است بر آن شمع غلط میں کز جہل خواب بید و سید ارمسا ید خود را
آپ ہی کی طرح مولانا مسید سلیمان ندوی کو بھی سخن فہمی کے مرض میں مبتلا پاکر
خواجہ آتش کا یہ شعر اکثر یاد آتا ہے ۵

(آتش) میری ایذا کے لئے مرے میں جان آتی ہے
کاٹنے دوڑتی ہے ماہی بے آب مجھے

ذرا آپ اپنے ضمیر سے مشورہ کریں کہ آیا یگانہ آرٹ پر آپ کا یہ محاکمہ کسی تحقیقی غور و فکر کا نتیجہ ہے یا جلد بازی و کم بینی و سہل انکاری کا؟ یا اس ذہنی تنزل و ادس ذہنی بے اعتدالی کا دوسرا رخ ہے جو حسرت موہانی کی شاعری پر رائے زنی کرتے ہوئے آپ سے سرزد ہوئی ہے۔ آپ کے خیال میں یگانہ آرٹ فلسفہ حیات و کائنات اور مفکرانہ تجزیہ و تحلیل سے خالی ہے۔ وہ بھٹی دا فلسفہ زندگی ہی تو یگانہ آرٹ کا اصل موضوع ہے اور اسی سے آپ کو انکار ہے۔

اس میں شک نہیں آپ کا یہ محاکمہ بڑا دلیرانہ مظاہرہ ہے انکار عظیم کا۔ اس کے ساتھ ہی اک مطالبہ ہے غلط اور غیر ضروری امور کا۔ یعنی آپ میری غزل میں بعض ایسے مضامین بھی دیکھنا چاہتے ہیں جو میرے معیار غزل کے اعتبار سے میرے نزدیک متروک ہیں۔ میں لفظی منہ و کا کا پابند نہیں۔ البتہ بہتر سے پار نہیں چلاؤں جو پہلے غزل میں داخل تھے میری دادر سے خارج ہیں۔ چنانچہ معاملات حسن و عشق، نری معصومی، سپردگی وغیرہ میری غزل کے لازمی عناصر نہیں ہیں اہ کیوں ہوں؟ آپ نے یگانہ آرٹ کو شاعرانہ عظمت سے بھی خالی باور کرانے کی کوشش فرمائی ہے مگر یہ چیز میرے باور کرنے کی تو ہے نہیں۔ ہاں طلباء کو آپ باور کرا سکتے ہیں کہ یہ عجیب و غریب انکار عظیم کا مجھ پر تو کوئی اثر ہو نہیں سکتا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ شید کو جولاہہ کہا اس نے ہنس کر ٹال دیا اور جولاہے کو جولاہہ کہا کھینا نا ہو گیا۔ آپ اطمینان رکھیں میں کوئی جولاہہ شاعر نہیں ہوں کہ کسی کے چڑھانے سے کھینا نا ہو جاوے گا۔ اپنی ذات اپنے قلم پر بھروسہ رکھتا ہوں۔

غالباً یہ امر آپ کے پوشیدہ نہیں کہ ملک کا ادبی طبقہ قریباً نوے فیصدی یگانہ کا مخالف ہے۔ آج سے نہیں پچیس سال سے مخالفین میں ایک طبقہ تو وہ ہے جو عملی طور پر تحریر و تقریر اور قلم و قلمندوں سے خاصانہ پروگنڈا کرتا رہتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو عمل سے نہیں ترک عمل سے خاصیت کا حق ادا کرتا ہے۔ جولوگ سنجیدہ۔ عیار اور زمانہ شناس ہیں ان کا طریقہ خاصیت یہ ہے کہ اپنی اپنی تصنیفوں میں اپنے اپنے رسالوں میں اپنے اپنے مضامین میں یگانہ کا نام آئے ہی نہیں دیتے۔ گویا خاموش طریقے سے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یگانہ کی شخصیت اردو ادب میں قابل ذکر ہی نہیں پچیس سال سے

یہی رنگ دیکھ رہا ہوں اور دل ہی دل میں منتا ہوں کہ مینکرانہ پالیسی کب تک؟
خدا بخشنے مولانا سید محمد حسین آزاد دہلوی نے آب حیات کی پہلی اشاعت میں حکیم
مومن خاں کو زمرہ شعراء سے اس طرح نکال پھینکا جیسے دودھ کی مکھی اور اپنے استاد
ذوق کی طرح میں آسان زمین کے قلابے ملا دئے جیسے آپ نے حسرت موہانی کی طرح
میں۔ مگر اس سے کیا ہوا۔ کیا آزاد کا زبردست قلم ذوق کو زندہ رکھ سکا یا مومن خاں
کو یہ بجاہل عارفانہ مٹا سکا؟

آپ کی اس ستم ظریفی کے کیا کہنے ہیں کہ چند آفاتیوں۔ چند ناقص غزل بازوں
میں یگانہ کو آپ نے اک درمیانی کڑی سے تعبیر فرمایا ہے۔ مگر میں کیونکر
(آیات و جدائی۔ ترانہ اور غالب شکن کا مصنف ہو کر) اپنے تئیں ان چھٹ بھٹیوں
کے سلسلہ کی ایک کڑی سمجھ لوں؟

ہیں تو آپ کے موجودہ دور میں کسی ایک کو ایسا نہیں پاتا جس پر صاحب کمال کا
اطلاق ہو سکے۔ سب کے سب بے گڑبے آتائی۔ ان چھٹ بھٹیوں میں دو ایک ایسے بھی ہیں
جنہیں مفکر کہہ سکتے ہیں مگر ان سے بھی بڑھ کر مفکرین ملک میں موجود ہیں۔ تو کیا ہر مفکر کے
لئے یہ ضروری ہے کہ وہ شاعر اور آرٹسٹ بھی ہو۔ مولانا کبیر الہ آبادی مرحوم کوئی بڑی

حسرت موہانی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا بہت بڑا غزل گو یا رئیس المتفردین
ٹھہرانا ظاہر ہے کہ محض مفکر انگریز پر یگانہ ہے۔ ان کی شاعری کچھ ایسی بلند تو ہے نہیں
البتہ بعض غیر شاعرانہ وجوہ کی بناء پر انہیں چکائے کی کوششیں کی جاتی ہیں کوئی
شریف آدمی خواہ وہ کتنا ہی خوش مزاج ہو اور بہت سے عجیب بھی کرچکا ہو یہ کیا ضرور ہے کہ
ان خوبیوں کے پیش نظر وہ اک بڑا شاعر بھی بنا دیا جائے؟

فاضل متوجہ تھے مگر ایک جلیل القدر مفکر اک زبردست شاعر۔
آپ نے مجھے موجودہ دور کے چھٹ بھٹیوں سے الگ رکھا ہے (اور یہ بالکل صحیح
ہے کہ میں ایسوں سے بالکل الگ ہوں) مگر سچ بتائیے آپ نے الگ رکھنے
کا یہ سبق کس سے سیکھا؟ یہ تو آپ نے میرے قول کو اپنا بنا کر پیش کیا ہے غالباً
میرے پڑھانے کے لئے۔ مگر میں تو بارہا اس امر کا تحریری اعتراف کر چکا ہوں
کہ میں موجودہ دور کے چھٹ بھٹیوں کی برابری سے بالکل الگ ہوں۔

(یگانہ)

شاعر تو ہیں ہتیب۔ اُدھوے بے ڈول
داغ و جگر و حسرت و فانی جیسے
آپ کسی مصالحت سے یگانہ کو دور حاضر سے الگ ٹھہرائیں یا خود یگانہ دور حاضر
سے الگ تھلگ رہنا چاہیں، یہ امر قانون قدرت کے خلاف ہے کہ وہ دور حاضر
سے الگ رہ سکیں۔ کیونکہ جو شخص دور حاضر کی انگریزی تعلیم سے کافی بہرہ رکھتا
ہو اور انگریزی ادب کے مطالعہ سے برابر استفادہ کرتا رہا ہو نا ممکن ہے کہ اس
کی ذہنی استعداد غیر ارادی طور پر دور حاضر کی برکات سے متاثر نہ ہو۔ دور حاضر
سے وہ کتنا ہی الگ تھلگ رہنا چاہے قانون قدرت اسے الگ نہیں رہنے دینگا
یا درکھے یگانہ آرٹ وہ آرٹ ہے جو ہر دور میں اپنی افادیت منواتا رہے گا۔ کیونکہ
یہ آرٹ کوئی وقتی چیز نہیں ہے۔ *eternal* ہے ایسے حقائق علیہ
کا مظہر ہے جو صدیوں بعد بھی اسی طرح موجود رہیں گے جیسے صدیوں پہلے تھے۔
البتہ آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ شاعرانہ عظمت کے لئے صرف بڑا بول کافی

نہیں ہوتا مگر کیا آپ کا یہ قول نیک نیتی پر محمول کیا جاسکتا ہے یہاں سچ محسوس ہوتا ہے
میں حقیقی شاعرانہ عظمت کے لوازم معدوم ہیں۔ صرف بڑبول ہے اور کچھ نہیں ہے
اگر واقعی ایسا ہے تو آپ کیا ہر شخص حق رکھتا ہے کہ اس بڑے بول پر لعنت
بھیجے۔

بات تو اتنی ہے کہ آپ نے اپنی منکرانہ پالیسی کے تحت یگانہ کی شاعرانہ عظمت
سے انکار کرنے کی غرض سے بڑے بول کو پکڑ لیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے
بھی اپنے رسالہ معارف میں ترانہ پر رپو پکڑتے ہوئے یہی پالیسی برتی ہے یگانہ کی
دہریہ باعیاں چین چین کر پیش کی ہیں جو خود پرستی کی ترنگ میں کہی گئی ہیں۔ اور
یگانہ آرٹ کے وہ شامکار جو اردو ادب کے لئے ہمیشہ مایہ ناز رہیں گے قصداً
پس پشت ڈال دئے گئے ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ آرٹ کے اعلیٰ نمونے پیش
کردئے جاتے تو سلیک کو ترانہ کی جلد میں خریدنے کا خیال پیدا ہوتا۔ یگانہ کے
ہنر سے بھی ردِ شناس ہوئے کاموقع مل جاتا اور یہ منظور نہ تھا! منظور تو یہ تھا کہ
بڑے بول کے نمونے پیش کر کے پبلک میں جذبہ منافرت پھیلا دیا جائے۔ یہ ہے قبلہ
کی ادبی و تنقیدی دیانت داری! آپ کے مکتوب سے صاف ظاہر ہے کہ یگانہ کی
بلند آہنگی اور بڑے بول کا آپ پر بھی ناگوار اثر پڑا ہے جس طرح سارے ملک پر
پڑا۔ مگر کیا یہ اثر لے کر اور بڑے بول کو بڑا بول کہہ کر آپ نے خود اپنے قلم سے یہ
ثابت نہیں کر دیا کہ یہ کوئی خالی خالی ڈینگ نہیں ہے بلکہ بڑا بول ہے جو کسی نہ کسی
بل بوتے ہی پر بولا جاتا ہے۔ بڑا بول وہی بولے گا جو اس کی اہلیت رکھتا ہو۔
اگرچہ یہ حرکت سخت مذموم ہے یگانہ کو بھی معلوم ہے۔ ڈینگیں ہانکنے کو ہر کوئی احمق

ہانک سکتا ہے مگر سچ کہیے کیا باد ہوائی ڈینگوں سے بالغ نظر اصحاب متاثر ہو سکتے
ہیں۔ ہرگز نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی نااہل کی باد ہوائی ڈینگوں سے سارا ملک
برافروختہ ہو کر مخالفت پر آمادہ ہو جائے۔ ہرگز نہیں۔ برافروختگی کا سبب تو کچھ
اور ہی ہے۔ جب ایسا ہو نہیں سکتا تو صاف ظاہر ہے کہ یہ بڑا بول کسی حقیقی
کسی زندہ رہنے والی طاقت پر مبنی ہے۔ باد ہوائی ڈینگ ہوتی تو کوئی کان بھی
نہ دھرتا۔ بندہ نواز حقیقی عظمت زمانے کی غیر مستقل ہلکی ہوئی ذہنیت کے رد و قبول
کی تابع نہیں ہوتی عظمت یہ کسی کے سٹریٹکٹ دینے سے پیدا ہو سکتی ہے نہ ملا متی
اوٹ پاس کر دینے سے معدوم ہو سکتی ہے۔ البتہ پروگنڈا کرتے غلط فہمی پھیلائے
سے غبار آلودہ ضرور ہو جاتی ہے بہت کچھ نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ مگر بڑی
سے بڑی شخصیتوں میں جو آثار عظمت پائے جاتے ہیں وہی آثار اپنی ذات اپنے
آرٹ میں دیکھ کر کیوں نہ یقین ہو اپنی عظمت کا؟ میرزا غالب کے خلاف
اُن کے زمانے میں جیسی مخالفت برتی گئی بچارے کو جیل خانے جانا پڑا۔ اُن کی نامہ
لکھنا پڑا۔ مثنوی بارخالف میں۔ یگانہ کے خلاف آج ۲۵ سال سے جو
مخاصانہ پروگنڈا ہو رہا ہے (پس پردہ یا کھلم کھلا) کیا یہ سب حقیقی عظمت
کی دلیل روشن نہیں ہے۔ ادبی دنیا کا کون سا شخص ہے جو اس حقیقت سے
واقف نہیں؟

میرزا غالب اور حکیم عمر خیام کی فلسفیانہ شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آرٹ کا بھی

کیوں نہ اعتراف کروں جب کہ بدیہی طور پر دیکھ رہا ہوں کہ یگانہ کے قلم سے آرٹ کے جیسے جیسے شاہکار وجود میں آئے وہ یگانہ ہی کے حصے کے ہیں یگانہ ہی کی انفرادیت کے کرتے ہیں اور ان کا صحیح مطالعہ کرنے والوں پر (جن کی تعداد کم ہی ہے) وہی تعمیری اثر ہوا جو آرٹسٹ کا مقصد تھا اور یہی ہے آرٹ اور آرٹسٹ کی کامیابی کا ثبوت میں نے تو دیوان غالب میں آرٹ کے اتنے مکمل اتنے نادر نمونے دیکھے نہیں جتنے آیاتِ وجدانی اور ترانہ میں ہیں۔ نہ عمر خیام کے ہاں زندگی کے رنگارنگ اور مختلف پہلوؤں پر اتنی مکمل رہا عیال دیکھیں یہ جو میں کہہ رہا ہوں اس کی صداقت کا اندازہ وہی محدودے چند اشخاص کر سکتے ہیں جو دیانت داری کے ساتھ اردو اور فارسی لٹریچر کو جانچنے پر کھنے کی اہلیت رکھتے ہیں) عمر خیام نے محض چند موضوع پر اپنا کمال دکھایا ہے۔ مثلاً دنیا کی بے ثباتی، شراب و ساقی وغیرہ وغیرہ مگر انسانی زندگی کی کشمکش اور انسانی ذہنیت کی تحلیل و تشریح کے متعلق جتنا تنوع ترانہ میں پایا جاتا ہے وہ عمر خیام کے ہاں کہاں؟ مولانا سید سلیمان ندوی نے یگانہ آرٹ کے شاہکاروں سے چشم پوشی کر کے اک بڑے بول کو پکڑ لیا تو وہ جانیں اور ان کا اسلامی ایمان۔ مانی ڈیر فراق۔ یہاں تک تو بڑے بول پر گفتگو اس ناگوار اثر کے اعتبار سے تھی جو آپ پر اور سارے ملک پر ہوا۔ مگر ملک میں اک ایسا جو ہر شناس فہمیدہ طبقہ بھی ہے جو یگانہ کو اک انسان سمجھتا ہے، محظوظ اس یا Common sense سے بے بہرہ نہیں سمجھتا۔ یہ مردم شناس طبقہ یگانہ کے ”بڑے بول“ کو اک دل لگی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس بڑے بول ہی کو یگانہ کی کائنات نہیں سمجھتا بلکہ یگانہ کی حقیقی وجدانی شاعری کا معترف ہے اس حیرت انگیز آرٹ اس وسیع المعنی

مختصر نگاری اس سادگی و پُرکاری کی بنا پر جس کا ایک مرتع ہے آیاتِ وجدانی اور دوسرا ترانہ۔

اچھا اب یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ بلند آہنگی یہ بڑا بول یگانہ کی شاعرانہ زندگی کے دستور العمل میں کیا مرتبہ کیا افادہ حیثیت رکھتا ہے۔ یاد رکھیے کلا اعمال بالنیات کے فلسفہ کے تحت ”میری نیت“ میرے ارادے کے لحاظ سے یہ بڑا بول بھی اک کار خیر ہے۔ مگر وہ بے خبر مردہ پرستوں یعنی زندہ شیر کو چھوڑ کر مردہ بھیڑوں کی پوجا کرنے والوں کی۔ یہی ہوئی ذہنیت کو جھنجھوڑنے والا، جو اس باختم علیچوں کو ہوش میں لانے والا۔ یہ ہے اس بڑے بول کی افادیت۔ دکھ پہنچا نا علی العموم گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے مگر عام ذہنی بیماری کی خطرناک حالت میں بڑا بول بول کر ذہنیت عامہ کو صدمہ پہنچا نا ہرگز گناہ نہیں ہے۔ اک کارگر طریقہ علاج ہے۔ یہ ہے یگانہ کے بڑے بول کا فلسفہ۔ دلوں میں جب کینہ و بغض نے گھر کر لیا ہو تو ایسے ناپاک دلوں کو پال کر ڈالنا تخریب نہیں ہے تعمیر ہے۔ تخریب کے اس تعمیری پہلو پر ملک الشعراء ابو طالب کلیم وجدانی کے قلم سے اک ایسا الہامی شعر نکل گیا ہے جو مردانِ عمل کے لئے ہر زمانہ میں دستور العمل کا کام دے گا۔

گر دل میں مخزن کینہ است کہ مردم دارند
(کلیہ جہانی) ہر کہ یک دل شکستہ کعبہ آباد کنند

ایسے جس دنیا پاک دلوں کو توڑنا ایسا ہی ہے جیسے کعبہ کی تعمیر کرنا۔ ایسے ہی

الہامی اصولوں کی بدولت شبلی نے شاعروں کے حق میں کہا ہے
"Poets are the un-acknowledged legislators of the world."
 خوب ہو یا زشت دنیا میں کوئی شے بذات خود کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ محل اور موقع کے لحاظ سے ہر شے کی قیمت اضافی بدلتی رہتی ہے۔

ہاں فکرِ رسا دیکھ بڑا بول نہ بول (یگانہ) گنجینہ راز اندھی نگر میں نہ کھول
 جسکی جتنی ضرورت، اتنی قیمت (یگانہ) میرا کبھی کنکر ہے کبھی ہے انمول

بڑا بول مذموم ہے، یگانہ کو بھی معلوم ہے۔ مگر یگانہ کا یہ بڑا بول اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ یہ بڑا بول صدقِ نیت کے ساتھ ابطالِ کلیہ کے قول (کہ کیدل شکستہ کعبہ آباد کند) کا مصداق ہے۔ یہ بڑا بول کوئی غرور کی راہ سے تو ہے نہیں۔ بلکہ ہلکی ہوئی ذہنیتوں کے لئے اک کارگر طریقہ علاج ہے۔ اب کوئی یہ کہے کہ اس بڑے بول کو شستا ہی کون ہے؟ تو یہ اپنے دل کو محض جھوٹی تسلی دینا ہے۔ اس بڑے بول کا اثر تو اتنا ہوا کہ پشاور سے لیکر دکن تک اور کراچی سے لیکر کلکتہ تک یگانہ کے ہزار ہا دیدہ و نادیدہ دشمن پیدا ہوتے گئے اور جس سے جتنا بن پڑتا ہے (اپنے نظرِ عمل سے یا خاموشی سے) دشمنی کا حق ادا کرتا رہتا ہے۔ غالباً اس حقیقت سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہو گا کہ ملک میں یگانہ کے خلاف جتنی برہمی پائی جاتی ہے وہ دورِ حاضر کے پھٹ بھٹیول میں سے (جو آپ کے نزدیک موجودہ دور کے چھٹے ہوئے شاعر ہیں) کسی ایک کے حصہ میں نہ آئی۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان اور ایران کی ادبی تاریخ میں کس سخنور کے ساتھ اتنی عام اتنی شدید مخالفت برتی نہیں گئی۔ پارٹی بندی کی کشمکش تو

ہوتی رہتی ہے مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ سارا ملک ایک طرف اور شخص تنہا ایک طرف۔ مگر ایسا کیوں نہ ہوتا۔ یگانہ سے غالب کا انتقام لینا بھی تو گویا "انسانی" فرض تھا۔ کیا جذبہ انتقام کا یہ کھلا ہوا ثبوت نہیں ہے کہ آج تک یگانہ کا کلام کسی درسی کتاب میں انتخاب نہیں کیا گیا۔ بہت نہ ہوتا تھوڑا ہی ہوتا مگر نہیں یہ کیوں ہوتا۔ گزشتہ پچیس تیس سال کے اندر ملک میں ادب اردو برہتے تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں یگانہ کا نام کہیں نہیں شعراء اور ادیبوں کے مرقعے شائع کئے گئے مگر یگانہ کا نام و نشان نہیں معمولی سے معمولی لوگ دھڑے ہوئے ہیں۔ شعرو سخن پر مضامین لکھنے والے سٹرل سے سٹرل نام گنواتے ہیں مگر یگانہ کا نام آئے نہیں دیتے۔ حضرت نیاز نے نگارِ مستند کے اک خاص نمبر میں جو محض شعراء اردو کے لئے مخصوص تھا۔ لکھنؤ اور بیرونجات کے چھوٹے بڑے سب کا ذکر کیا مگر یگانہ کا نام تک نہ لیا۔ کسی ادبی جلسہ میں کوئی ادبی خطبہ صدارت یا کوئی ادبی مقالہ پڑھا جائے بہتر ہے ادیبوں کے نام گنوائے جائیں گے مگر یگانہ کا نام کبھی نہ آئے گا۔ مزہ تو یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو نے بھی گزشتہ تیس سال کے عرصہ میں کبھی اپنے رسالہ اردو میں مرزا یگانہ کا کوئی ذکر آنے دیا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ وہی جذبہ انتقام۔ اس خاموش انتقام سے ہی تو باور کرانا مقصود ہے کہ اردو زبان سے یگانہ کا کوئی تعلق نہیں۔ سچ کہئے۔ اس بائیکاٹ بازی سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ عداوت یا رواداری؟

لے جس قوم کی ذہنیت اتنی بکھر ہو اسکے لئے *have we never* قدرتِ خاموش کا فیصلہ نافذ ہو گیا کرتا ہو کہ وہ ہرگز حکومت کر نیکی قابل نہیں ہو سکتی۔ ڈھائی دن کی بھی حکومت نہیں کر سکتی البتہ قابلِ قوم کا دل بڑا ہوتا ہے۔ اپنے ہوں یا بیگانے سب کے حقوق کا لحاظ کرتی ہے کیسے کا حق تلف نہیں کرتی مگر انجمن ترقی اردو کا دل اتنا تشادہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ غیروں کے حقِ خدمت کا لحاظ کرے۔

یاروں کی ستم ظریفی تو دیکھئے کہ جب کبھی یگانہ کو یاد بھی کرتے ہیں تو کوئی بکر ؟
 ”ہاں ہاں وہی یگانہ غالب شکن۔ غالب کے چچا۔ گویا یگانہ کے پاس غالب شکن
 کے سوا اور کچھ ہی نہیں۔ آیات و حجابی یا ترانہ گویا کوئی قابل ذکر چیز نہیں بگیا آرٹ
 جیسے تعمیری آرٹ کو نظر انداز کر کے غالب شکن کا ذکر کرنا اس طعن کے ساتھ کیا
 ظاہر کرتا ہے ؟ یہ ثبوت ہے یاروں کی سٹری ہوئی حاسدانہ ذہنیت کا کہ وہ
 اسی تصنیف کے ذریعہ سے یگانہ کو یاد کرتے ہیں جو ان کی نگاہ میں بہت بڑا عیب
 ہے بہت بڑا جرم ہے اور اس جرم کو یاد دلانے والوں میں نفرت پیدا کرتے ہیں حالانکہ
 وہی غالب شکن جسے وہ بڑا ادبی جرم سمجھتے ہیں وہ بجاے خود اک تعمیری کارنامہ ہے
 کشادہ دلی کے ساتھ سمجھ کے جس نے پڑھا ہے ناممکن ہے اسے اس کے مطالعہ سے
 ادبی بصیرت حاصل نہ ہوئی ہو۔ بڑے بڑے غلیچوں نے مان لیا کہ غالب شکن ٹپھڑ کر
 بعد معلوم ہوا کہ ”ہم نے غالب کو اب صحیح طور پر سمجھا لیجئے کہ یگانہ آرٹ کو طاق نسیاں
 پر رکھ کر فقط غالب شکن کے ذریعہ سے یگانہ کو یاد کرنا آخر کیا ہے۔ عداوت یا رواداری ؟
 یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے کوئی غالب کے تمام شاعرانہ کمالات کو بالائے طاق رکھ کر
 یہ کہتا پھرے کہ ہاں ہاں وہی غالب جو قاطع برہان کے مصنف ہیں جنہوں نے برہان قاطع
 کے مصنف کو گالیاں دی ہیں۔ مگر کیا واقعی غالب کے پاس قاطع برہان کے سوا اور
 کچھ نہیں یا یگانہ کے پاس غالب شکن کے سوا اور کچھ نہیں ؟ یہ سب کیا ہے عداوت
 ہے کہ رواداری ؟ اب اسے اک اندھا بھی ٹٹول کر دیکھ سکتا ہے کہ شخص واحد کے
 خلاف فقط لکھنوی ہی میں نہیں ہندوستان کے چاروں دانگ اتنی سخت برہمی کا پایا
 جانا اس کے نکتے پن کی دلیل ہے یا کسی حقیقی طاقت و عظمت کا ثبوت ہے ؟

کون سی طاقت ؟ فقط شاعرانہ طاقت نہیں بلکہ کیریکچر اور حق کی طاقت بھی لگا کر ہی
 ہے۔ آپ یگانہ کی شاعرانہ عظمت سے لاکھ انکار کریں، قدرت کا قانون تو بدل
 نہیں سکتا۔ قدرت کا قانون تو یہی ہے کہ کسی نکتے شخص کے خلاف عام قومی برہمی
 پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ لگتا تو وہی ہو گا جس کا کوئی دشمن نہ ہو۔ آپ کو غالب یہ بھی
 معلوم ہو گا کہ یگانہ کے خلاف جو اتنی محاسبت پھیلی ہوئی ہے وہ یگانہ کی شاعرانہ زندگی
 سے متعلق ہے گھریلو زندگی سے تو متعلق ہے نہیں۔ حالانکہ پرائیویٹ زندگی کے
 معاملات میں عداوت پیدا ہو جانا معمولی سی بات ہے۔ مگر کسی کے ذاتی جوہر کا
 دشمن ہو جانا اور کچھ نہیں تو بائیکاٹ کے اچھے حربے پر اتر آنا قوم کی ذہنی بیماری
 نہیں تو اور کیا ہے ؟ یگانہ نے ڈاکا تو نہیں مارا۔ چوری تو نہیں کی ہے۔ ہمسایہ کو کبھی
 ایذا تو نہیں پہونچائی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ملک کے ادبی مفاد کی خاطر کھری کھری
 کہہ دینے میں غالب جیسی شخصیت کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ مگر یہ جو کچھ کئی ادب کے واسطے
 کیا۔ ادب کے واسطے کتنوں کے دل دکھائے ہیں۔

(یگانہ)

ہاں شوخی طبع ہے۔ لڑائی تو نہیں کہتا ہوں کھری اس میں برائی تو نہیں
 کیوں ہر کس و ناکس ہے یگانہ دشمن ؟ قاضی کی گدھی کوئی بھگائی تو نہیں
 وہی حق پسندی وہی حق گوئی وہی حریت فکر و عمل جو انسانی عظمت کے جوہر
 ہیں یگانہ کے حق میں قاضی کی گدھی بھگالے جانے سے بدتر ثابت ہو تو پھر اس کے
 سوا اور کیا کہا جائے ؟
 الٹی تھی مت زمانہ مردہ پرست کی
 میں اک ہوشیار کہ زندہ ہی گر گیا

ملک کی بد نصیبی دیکھیے ملک کے نوجوانوں نے یگانہ سے حریت و بغاوت کا سبق سیکھا تو سہی مگر اس کا الٹا مصروف لیا۔ یگانہ نے تو کورانہ تقلید کی روکھام کی غرض سے میرزا غالب کا بخجہ اُدھیر کر رکھ دیا۔ ملک کی پہلی ہوئی ذہنیوں کو سیدھا کر دیا۔ مگر ملک کے نوجوانوں نے نئے ادب کے بھیس میں ترقی پسندی کے رُوپ میں نظام ادب ہی میں بد نظمی پھیلا دی اور غضب تو یہ ہے ہندوستان کی پاکیزہ نسوانیت کو بھی بازار میں تنگا کر چھوڑا۔ افسوس

مائی ڈیر فراق ملک کے آزاد خیال جو ہر سناسوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ یگانہ کو *mental slavery* ذہنی غلامی سے پیدا شدہ نفرت ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو ازل سے یگانہ میں ودیعت ہوئی ہے اور جس کا ثبوت قدم قدم پر یگانہ کی ادبی زندگی سے بھی ملتا رہا ہے اور مادی زندگی سے بھی۔ آخر یہ وہ نعمت ہے جو بڑی سے بڑی قوم کے لئے سرمایہ عظمت ہے۔

آگے چل کر آپ اپنے غنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔
آیاتِ وجدانی بیشک استادانہ کلام ہے لیکن جب ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ تشہی کے رنگ اور طرز کی ارتقائی صورت ہے تو پھر بہت کم کہنے کو رہ جاتا ہے۔
چ خوش۔ بندہ نواز آپ کا یہ ارشاد تو اک بیان ہی بیان ہے تحقیقی مطالعہ

سے بعید جس میں آپ اتنا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ پھر کچھ کہنے کو باقی نہیں رہتا۔ خود اک دعویٰ کرتے ہیں اور اسی دعویٰ کو دلیل بھراتے ہیں اسی دعویٰ پر دوسرا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔ یہ کس نے آپ کے کان میں چھونک دیا کہ یگانہ آرٹ آتش ہی رنگ کی ارتقائی صورت ہے؟ آپ کی اس غلط بیانی میں سچائی کی پٹ بس اتنی ہے کہ

عام لوگ دھوکے میں پڑ جائیں۔ اور وہ پٹ یہی ہے کہ مردانہ بانپن کے لحاظ سے یگانہ کی شاعری پر اول اول خواجہ کا اثر ضرور پڑا ہے۔ اور یہ اثر اس لئے پڑا کہ بانپن کے لحاظ سے یگانہ اور خواجہ آتش کے مزاج میں طبعی مناسبت و مشابہت ہے۔ اس انداز مزاج کی مشابہت کی وجہ سے یہ کہہ دینا کہ یگانہ آرٹ آتش ہی کے رنگ کی ارتقائی صورت ہے اک دھوکا ہی دھوکا ہے آپ کے اس بیان کی حقیقت بس ویسی ہی ہے جیسی اس شخص کی جو لکھنؤ کی گلیوں میں ویلو کی قلمیں عطر کی قلمیں بنا کر (تیل میں دوچار بوندیں عطر کی ڈال کر) نادقف گاہکوں کو ٹھک لیا کرتا تھا۔ آپ غلط فہمی پھیلا یا کریں اس سے کیا ہوتا ہے۔ ملک اتنا ضرور جانتا ہے کہ یگانہ کی شاعری کا موضوع ہے حیاتِ انسانی اور اس کی تنقید و تشریح۔ یہ تو ہوا موضوع جو بجائے خود نامحدود چیز ہے۔ مگر اس موضوع یعنی حیاتِ انسانی کی شرح و تنقید میں یگانہ نے سوکھا فلسفہ نہیں بگھارا ہے۔ بلکہ جذبہ صادق کے تحت حیاتِ انسانی کی تشریح و تنقید کی ہے، ایسی الہامی زبان میں ایسی تازہ و نادر توت بیانہ کے ساتھ ایسے چمچے تلے مکمل آرٹ کی صورت میں جو یگانہ ہی کا حصہ ہے ناقابل تقلید کوئی دیانت دار نقاد اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ طنز یہ آرٹ اردو ادب میں یگانہ کی انفرادیت کا

۱۵ انفرادیت۔ زبان اور فنِ شعر کی باقاعدہ تحصیل تکمیل کے خلاف خصوصاً ادب کی سب سے زیادہ مکمل اور بجا آمد صنفِ جل کے تعمیری اثرات کا مقابلہ دنیا کا کوئی لٹریچر نہ کر سکا یعنی غزل اسی غیر فانی غزل کے خلاف تخریبی کوششیں تائیں اٹھائیں سال یعنی (بقیہ صفحہ ۲۰۶ پر ملاحظہ ہو۔)

منظہر ہے کسی کی نقل نہیں ہے۔ بیگانہ آرٹ کی خصوصیات کی ایک فہرست بنا کر سامنے رکھے تو معلوم ہوگا کہ کبھی تو بیگانہ پر کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ ابھی تو بہت کچھ کہنے کو باقی ہے۔ ابھی تو یاروں کو صرف بڑا بول ہی نظر آتا ہے یا مصلحت کا تقاضا ہے

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۵۔ عظمت اللہ خاں دہلوی کے زمانے سے ہو رہی ہیں۔ اب آٹھ دس برس سے ترقی پسندوں کی بغاوت غفل کے خلاف اور زور پکڑتی جا رہی ہے مگر افسوس ان خدا روں نے قدرت کے بخشے ہوئے جو ہر انفرادیت کے خلاف بھی بغاوت شروع کر دی ہے نتیجہ معلوم ۱۱ بے ہنروں کی حاسدانہ ذہنیت کا تقاضا ہی ہونا چاہیے۔

مارو۔ لوٹو دھادو مگر دو گنوار دل (Mars) کے ہاتھوں اور کیا ہونا ہے۔ باجن کو پڑی سے گر کر چلنا چور تو کر سکتے ہیں مگر کوئی ذرا سا پرزہ بنا نہیں سکتے۔ انفرادیت اک عطیہ فطرت ہے۔ انفرادیت کے خلاف بغاوت کرنے والے فطرت سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ ایسوں کا پھولنا پھلنا معلوم۔ شاعر ہو۔ فلسفی ہو۔ سائنٹسٹ ہو کوئی سا صمن صمن ہو فطرت کی پیداوار ہے سماج کا ساختہ پر داخت نہیں ہے بلکہ عموماً سماج کے مجرمانہ طرز عمل کا کتہ ہوتا ہے۔ علوم و فنون کے موجد فطرت کے برگزیدہ اصحاب تھے۔ سماج کے پروردہ نہ تھے۔ اسی طرح شاعر اور غیر شاعر نہ تو سماج سے الگ تھلگ رہ سکتا ہے نہ سماج کی ہوائے نفسانی یا غلط رجحان کا پابند ہو سکتا ہے کیونکہ وہ معلم ہے۔ مصلح ہے۔ فرد دور نہیں خوشامدی نہیں کہ قصیں غلط راہ جانے دے۔ ہاں اک خاص حد تک رسم و رواج کا اور زیادہ تر اپنے طبعی اقتضا اپنی ذمہ داری تو توں کا تابع ہوتا ہے۔ کوئی صمن صمن اپنی انفرادیت کو وہ صمن صمن کی پستی میں گم کر دینا واجب (بقیہ صفحہ ۲۰۷ پر ملاحظہ ہو)

کہ اسے بڑا بول ہی باور کرایا جائے۔

بیگانہ پر خواجہ آتشؒ یا اور کسی استاد کا اثر پڑتا اور بات ہے (مناخین پر متقدمین کا اثر پڑتا ہی ہے۔ ہر مناخرا اپنے متقدمین کا ورثہ دار ہے) مگر بیگانہ کی شخصی و انفرادی خصوصیات طبعی امکانات اور ان کی تدریجی نشوونما اور چیز ہے آتشؒ ہی کا اثر نہیں میر کا اثر بھی پڑا ہے اور بیدل کا بھی۔ تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا بیگانہ کی انفرادیت بدل جائے گی۔ بیگانہ کا اچھوتہ طنزیہ آرٹ کوئی مانگے کا خلعت تو ہے نہیں کہ آج نہیں کل امار نا پڑے گا۔ آپ کے قول کے برخلاف بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بیگانہ کا کلام گویا مولانا شاد عظیم آبادی کے کلام کا ارتقائی نمونہ ہے

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۶۔ ہمیں جان سکتا۔ ہاں سماج کے ساتھ ربط و توازن بقدر کتاب قائم رکھنے پر بیشک مجبور ہے۔ مگر اس پر بھی انفرادیت اپنا عمل کر کے رہے گی کیونکہ فطرت کا حکم ایسا ہی ہے۔ انقلاب انقلاب کا شور مچانے والے انفرادیت کو نقصان پہنچا کر فطرت کی بخشی ہوئی اعلیٰ اور ادنیٰ استعداد کا فرق متاخر چند دن کے لئے اپنی تخریبی تحریک میں کامیاب ہو بھی جائیں (کیونکہ تخریب کوئی مشکل کام نہیں ہے) تو کیا ہوگا۔ ان کے دور تخریب پر بھی اک دن انقلاب آئے والا ہے۔ فطرت کا آئین ہر انفرادیت ہی کو پروان چڑھائے گا۔ یہی ہوتا آیا ہے ہی ہوتا رہے گا۔ (مراد بیگ)

نوٹ۔ میرا بیگانہ کے کلام پر اس کتاب میں جو کچھ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ یہ سمجھا غلط ہوگا کہ یہ سب ایک ہی شخص کے خیالات ہیں بلکہ مختلف اصحاب کے خیالات ہیں جو وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ بیگانہ کے کلام میں جو زندگی پائی جاتی ہے وہ یہ دور تو گیارہ گزشتہ ادوار میں بھی پائی جاتی تھی حضرت نیاز خاں کی آواز جو ایک پرانے نوٹ تخریب میں ظاہر ہو چکی تھی اور اس وجہ کہ علانیہ اعتراف کرنا انسان

شاید اس وجہ سے کہ میں اُن کا شاگرد ہوں مگر
استاد فقط راہ بتا دیتا ہے
شاگرد تو شاگرد ہے۔ بندہ تو نہیں
یاد پاؤں میں پہنچے بھی لگا دیتا ہے
بندے کو جو دیتا ہو خدا دیتا ہے
اچھا اور سُنے۔ اکثر اصحاب یہ بھی کہتے ہیں کہ میرزا یگانہ غالب کو غالب ہی
کے رنگ میں نیچا دکھانا چاہتے ہیں گو یا یگانہ آرٹ غالب ہی کے رنگ کی ارتقائی صورت
ہے۔

غرض یہ کہ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ ہاں خوب یاد آیا لکھنؤ کے بعض اصحاب نے
غالب اور غلبچوں پر میری مزاحیہ رباعیاں دیکھ کر یہاں تک کہہ دیا کہ یہ مشیر لکھنوی
(ہر سیہ گو) کے رنگ کی ارتقائی صورت ہے اب فرمائیے کیا فرماتے ہیں آپ
ہر کس خیال خوش خطیہ دارد۔ صاف ظاہر ہے کہ یگانہ آرٹ کو آتش۔ غالب
مولانا شاد وغیرہ کی ارتقائی صورت ٹھہر لے والے اپنی اپنی کھسپائی یا ہلکی ہوئی ذہنیت
کا ثبوت دیتے ہیں۔ یگانہ کی ذاتی انفرادیت جسے نہ سوچھے وہ فنِ شعر و سخن پر چاچا کما
کیا کرے گا۔

حُسن یگانہ آپ ہی بنا حجاب ہے
حُسن حجاب دُور سے دیکھا کرے کوئی
مائی ڈیرہ ماشاء اللہ آپ یگانہ کے فلسفیانہ تغزل میں حُسن و عشق اور حُسنی
تعلقات کی معاملہ بندی بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسے عیاں شانہ و اوابا شانہ معاملات
جراتِ دل و جگر جیسے اشخاص کے لئے مایہ ناز ہوں تو ہوں میرے ہاں اس قسم کے
مضامین متروک مردود ہیں۔

(کہی جاتی ہے مُنہ تک آئی بات)

میں نے اس بیسویں صدی میں مولانا اکبر الہ آبادی کے سوا کوئی بڑا شاعر نہیں دیکھا
مگر اتنی جودتِ تخیل ایسی تنگستِ ربانی پر بھی اُن کا کلام آرٹ کی خصوصیات کے لحاظ
سے مکمل نہیں ہے۔ میں آپ کا کیا شکریہ ادا کروں کہ نگار میں غزل گوئی پر تھوکر تے
ہوئے آپ نے مجھے ناچنے کو بھی دُور حاضر کے چھٹ بھٹیوں کے ساتھ یاد فرمایا ہے۔ بدی
کے ساتھ نہیں نیکی کے ساتھ۔ غالباً قدر افزائی کے خیال سے۔ مگر مجھے تو یہ یاد آوری
اک اعجوبہ سی بات معلوم ہوئی۔ ادبی دُنیا میں یگانہ کا ذکر خیر ہے

عجب اک سانچہ سا ہو گیا ہے

وجہ یہ ہے کہ مردِ وجہ اوزان میں ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ کسی خیال
یا جذبہ کو کلامِ موزوں کی صورت سے قلمبند کر دینا میرے نزدیک کوئی شاعری
نہیں ہے۔ وراے شاعری چیزے دگر ہست۔ یہی چیزِ فکر جب کلام کی روح
اور قالب دونوں پر عمل کرتی ہے تو وہ کلام شعر ہو جاتا ہے اور پڑھتے بڑھتے
مرتبہ کمال پر پہنچ کر آرٹ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے تئیں دُور حاضر
کے مشابہ میں داخل نہیں سمجھتا۔ شاعر اور آرٹسٹ کی حیثیت سے میرا مرکز وجہ
عورت نہیں ہے۔ جنسی تعلقات کی بکھان کرنا۔ حُسن و عشق کے واردات کو
موضوعِ سخن بنالینا میرا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ میں کوئی ہنسنگ لاڈلا سا سبھی
نہیں ہوں کہ ترانہ عشق کا تاچھروں میرا ترانہ زندگی ترانہ عشق و محبت سے الگ
اور زیادہ وسیع زیادہ اہم ہے۔

دیوانہ روی کا حق ادا کرنا چیل (یگانہ) چلنا تو ہنسی شور مہا کرتا چل
گردش میں بھجور ہے۔ بوڑھا لاکھڑیوں! ہاں تو بھی یوں ہی قصِ فنا کرتا چل

چھٹ بھٹیوں کے نزدیک حسن و عشق ہی عین زندگی ہے۔ میرے نزدیک زندگی حسن و عشق کے علاوہ اور کچھ ہے بہت کچھ ہے۔ خدا بچائے ایسی عاشقانہ شاعری ہے۔ سنئے اور سر دھنیے ۵

ادامار ڈالے گی جانی تمھاری (نامعلوم) غضب ڈھار ہی ہو جانی تمھاری
ایسی قسمت کو کیا کرے کوئی مرے ہم مزا کرے کوئی
آستینوں کا وہ چڑھا لینا (نابغہ) گوری گوری کلاسیاں تو بہ
مے دفور تمنا کا کچھ خیال نہیں بچا جاتے ہیں دامن چھڑائے جاتے ہیں
دو جیا وہ ترنم وہ سخی نظر میسے لئے سینہ شفاف وہ زیرِ دربر میسے لئے
بھلا ایسی گندمی جوان شاعری میرا موضوع سخن کیونکر بن سکتی ہے۔
معلوم ہوتا ہے اس بے حیا کے تن پر انگیا کرتی تک نہیں سینہ شفاف صاف
تہ و بالا ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ بھٹو۔

نوجوانوں کے جذبات شہوانی کو بھڑکانے والی فساد انگیز شاعری جس میں عیاشانہ
اوباشانہ جذبات، کیف و سرمستی، نغمہ و ترنم، رقص و سرود وغیرہ کا ڈھول پٹیا جاتا
ہے اور اسی قسم کے لغت زدہ افسانے جن میں مرکز خیال فقط عورت ہی عورت
ہوتی ہے۔ عورت ہی کے ظاہر و باطن کا پردہ فاش کیا جاتا ہے۔ عورت کے
بال بال رگ رگ کی تشریح و تجللیں، تفسیر یا تشہیر کی جاتی ہے۔ تصویروں میں
چھاتیوں کا ابھار اور نگیلیا پن نمایاں کیا جاتا ہے۔ دو شیرازہ کی ڈائری شائع کر کے

۵ نابغہ اور گوٹڈی سے بڑھ کر اس مصرع کا مزا کون اٹھائے گا ؟

چھٹال پنہ کی تعلیم دی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ سب آجکل اردو ادب کی گرم بازاری
کے ذریعے ہیں۔ یہ سب کیا ہے ؟ یہ سب اوباش شاعروں اور اوباش ادیبوں اور
خود غرض لکچر بچے اور ٹیڑوں کا وہ فعل قبیح ہے جسے ٹھیکہ اردو میں تجارتی بھڑوپن
کہیں تو سچا نہیں۔ جس طرح دکانوں پر ہونٹوں میں۔ چار خانوں میں کسین
چھو کرے اور چھو کر مایاں گا کہوں کے رجھانے پھانسنے کے لئے نوکر رکھی جاتی ہیں
اسی طرح بے غیرت اور ٹیڑوں نے گندی عاشقانہ شاعری، گندے افسانے
اور نیم برتنہ تصویریں شائع کر کے ”ادب جمیل“ کے پردے میں گا کہوں کے پھانسنے
کا شیوہ قبیح اختیار کر لیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ چرکین کی گھپیل شاعری فقط لفظی
اعتبار سے گندی اور منہجیہ انگیز ہے مگر اثر کے لحاظ سے ایسی مخرب اخلاق ایسی مجرمانہ
نہیں ہے جیسی غیر ذمہ دار اتائیوں کی شبابیاتی جمالیاتی شاعری۔ ایسی عاشقانہ
شاعری کی مقبولیت عامہ کارا زہی ہے کہ وہ لفظاً فحش نہ سہی مگر معنوی اثر کے
اعتبار سے نہایت فحش۔ نابغہ مراد آبادی نے میری اک غزل کے جواب میں اپنی
”نیا پاک جوان شاعری“ کا حق ادا کیا ہے۔ خدا دیکھے تو سہی ۵

سینہ شفاف وہ زیرِ دربر میسے لئے

آپ کے چاروں چھٹ بھٹیوں کی چوگرٹی میں اس شخص کو جو شہرت عامہ یا
شہرت کا ذبہ حاصل ہے وہ کسی کو بھی نہیں۔ مگر اس شہرت عامہ کے باوجود وہ کیا
ہے۔ ایک نابغہ۔ اک انارٹی موزوں طبع۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسا بیگانہ ادب

۵ نابغہ سے مراد اک موزوں طبع انارٹی شاعر۔

شاعر یا ارٹسٹ کے مرتبہ کو پہنچ سکے خواہ وہ داغ سے بھی زیادہ شہرت پا جائے
دیکھئے خبردار آپ اس دھونڈے میں نہ پڑیں کہ میرا یہ قول خدا خواستہ اس شخص کے
ساتھ رشک و حسد پر مبنی ہے۔ آپ کو جاننا چاہیے کہ مجھے غالب جیسے استاد کے
ساتھ بھی حسد کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ فطرت نے مجھے جو کچھ بخشا ہے اس کے
ہوتے غالب سے حسد کروں تو بڑی نادانی بڑا کفرانِ نعمت ہوگا۔ غالب جیسے استاد
پر مجھے رشک کرنے کی ضرورت نہیں تو پھر اور کسی کا ذکر کیا۔ ممکن ہے آپ کو تعجب ہو
کہ میں نے اس شخص کو نابغہ کیوں کہا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بازار میں او
بھی بعض مشاہیر نابغہ اپنے اپنے ڈھول میٹ رہے ہیں اور پیٹتے ہیں گے۔ ایران
میں بھی چند زور غیاث حلوائی کا کوئی بول چکا ہے۔ مگر وہاں کے مبصروں نے
باوجود اس کی مقبولیت کے اُسے معتبر شعراے ایران میں شمار نہیں کیا۔ شخص مذکور
کو میں غیاث حلوائی کے زمرہ میں تو نہیں شرف جہاں فردوسی یا ہلای جیسے غزل گوؤں
میں شمار کر سکتا ہوں۔ اور یہ وہ طبقہ ہے جس کی شاعری کی افادی حیثیت زیادہ
سے زیادہ تفریحی ہے تعمیری نہیں ہے۔ یہی حال آپ کے نابغہ کا ہے جس کے کلام
کا بہترین انتخاب (یعنی وہ حصہ جو اس کے فطری مذاق کی پیداوار ہے) زیادہ
سے زیادہ تفریحی قیمت رکھتا ہے۔ اعلیٰ مراتبِ انسانیت۔ ارفع ذہنی استعداد و شاعر
ریاضت کی پختگی سے اُسے کیا تعلق؟ اس شخص کا کلام اول سے آخر تک پڑھ جائیے
اک لذتِ ضرہ محسوس ہوگی مگر یہ لذت اک ایسے شربت کی سی ہے جو پہلے بھی
پی چکے ہیں اب بھی پیتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے کوئی ایسی حقیقت تازہ ہاتھ نہیں
آتی جس سے انسانیت کی تعمیر و ارتقا میں مدد مل سکے۔ شخص مذکور کی غزل بازی

سر سے پاؤں تک قلم برداشتہ شعر گوئی ہے جس میں جانکاہی فکر اور باقاعدہ شاعر
ریاضت کو دخل نہیں۔ مگر آرٹ کوئی سا ہو قلم برداشتہ تکمیل نہیں پاسکتا۔ آپ
جانتے ہیں روم ایک دن میں نہیں بناتا ج محل قلم برداشتہ تیار ہو گیا۔ نابغہ کا
ایک مصرع ہے ۵ ایک شیشہ ہے کہ ہر تھیرے مگر اتا ہوں میں مصرع صاف
ہے برجستہ ہے جسے پڑھ کر اک لذت حاصل ہوتی ہے مگر یہ ایسی لذت ہے کہ
پہلے بھی حاصل ہو چکی ہے۔ شعر و سخن میں شیشہ و سنگ کا ٹکرانا پُرانی بات ہے
ذوق بھی کہہ گئے ہیں ۵

میں وہ بلا ہوں شیشہ سے پتھر کو توڑ دوں

اسکا زور تو اور بڑھا چڑھا ہوا ہے۔ خیر آگے چلئے ۵

میری اتنی سی پیہم، میری فطرتِ انقلاب کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں
کائنات کا ذرہ ذرہ معرض تغیر و انقلاب میں ہے۔ کوئی شے اپنی جگہ پر قائم
نہیں ہے۔ اس فلسفہ کو امام الغزل میرزا یگانہ پہلے یوں بیان کر چکے ہیں ۵
کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا فکر کی بلندی یا حوصلہ کی پستی ہے
(یگانہ)

منزل ہی نہیں کوئی ٹھہرنے کے لئے عالم عالم ہے سیر کرنے کے لئے
ہر سبب و بلند ہے نزلنے کے لئے یہ پاؤں ہیں کیا زمین پہ دھرنے کے لئے ہے
منزل انقلاب و تغیر دکھانے کے بعد یگانہ نے چوتھے مصرع میں اک
ایسا سوال کیا ہے جو جانِ شعربت ہے۔ یعنی میری فطرت بلند کب اس کی تقاضی
ہو سکتی ہے کہ زمین پر پاؤں رکھوں (اہل ذوق اس والا الغزلی کی لذت اٹھا سکتے

سبحان اللہ) اسی سے نابغہ نے تھوڑا سا مضمون (تقدیر گنجائش) اخذ کر کے یوں کہہ دیا ہے

کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں

ہاں یہ ضرور ہے کہ اخذ کرنے میں نابغہ نے قوتِ اکتساب سے اچھی مدد لی ہے ہر خاص و عام کے سامنے یہ ثبوت تو موجود نہیں کہ ان دونوں میں مقدم کون ہے ؟ مگر میں تو جانتا ہوں کہ نابغہ دنیا سے شاعری میں بیگانہ سے دس برس بعد پیدا ہوا ہے اور مذکورہ بالا رباعی جب معرض طباعت میں آچکی ہے اس کے بعد نابغہ کی یہ غزل جس کا شعر زیر بحث ہے وجود میں آئی ہے۔

(بیگانہ فروری ۱۹۱۷ء)

آئینہ رکھ کے آپ بھی سجدے میں جھک گئے اب کیا کہیں گے کافر و دیندار دیکھ کر
(بیگانہ دسمبر ۱۹۲۲ء)

آئینہ ہے وہ زیارت گاہ جس کے سامنے خود پرستوں کے لئے سجدہ روا ہو جائیگا
نابغہ (مؤخر)

دیکھئے کیا شور اٹھتا ہے حرمِ ناز سے سامنے آئینہ رکھ کر خود کو اک سجدہ کر میں
اس خیال کو امام الغزل سے پہلے کسی نے شعر کا لباس نہیں پہنا یا۔ جن پر طعن کیا ہے کہ جب آپ آئینے کے سامنے جلالِ جن سے مرعوب ہو کر خود سجدے میں جھک گئے تو کافر و دیندار آپ پر کیا کیا آواز کے کیں گے۔

آئینہ اک ایسی زیارت گاہ ہے جس کے سامنے جن خود پرست کو بھی سجدے میں جھک جانا روا ہو جائے گا۔ آئینے کو زیارت گاہ کہنا اک تازہ عبارت ہے۔

لفظ کے تازہ ایست بہ مضمون برابر است۔ اور خود پرستوں کا سجدے میں جھک جانا اک طرفہ معاملہ ہے۔ یہاں فقط ایک ہی لفظ کی تازگی پر فکر ختم نہیں ہو گئی بلکہ ایک سے زیادہ معانی تازہ پیدا ہوتے چلے گئے ہیں آئینے میں اپنا مشاہدہ کر کے حسن کی یکتائی کا باطل ہو جانا تو پڑنا مضمون ہے مگر آئینے کے سامنے جن کا خود سجدے میں جھک جانا اور اس پر کافر و دیندار کا طعن بارنا ان مطالب پر بیگانہ سے پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ نابغہ نے انھیں معانی تازہ سے متاثر ہو کر اور بات کا رخ پلٹ کر یوں بات بنائی کہ آئینے کے سامنے ہم اپنا آپ کو سجدہ کر کے دیکھیں حرمِ ناز سے کیا شور اٹھتا ہے۔ یہ بھی اخذ و اکتساب کا اک طریقہ ہے کہ ایک مضمون سے متاثر ہو کر اس کا رخ پلٹ کر اک اور شعر کہہ دیا جائے مگر اخذ و اکتساب کے لئے بھی سلیقہ چاہیئے۔ نابغہ نے یہاں سلیقہ سے کام لیا ہے۔

گر قنار ان ساحل کو دھڑپے ڈرنکل جاتا
(بیگانہ) کبھی تو نیست شکل آزمائی مرگ آساں کو

موت کے منہ میں جا پڑنے کا خیال پہلے بھی بہت نظم ہو چکا ہے مگر اس تازہ انداز سے دیکھا نہیں گیا۔ کہتے ہیں ارے او نادانو اس کھن زندگی کو تم نے کیوں گلے باندھ رکھا ہے۔ موت تو اس سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ کبھی تو اس آسان مرحلہ کی آزمائش کی ہوتی۔ دریا سے قنا کا ہول جھوٹ موٹ تھا ارے دل میں سمایا ہوا ہے ارے یہ دریا کچھ بھی نہیں کو دھڑپو ابھی ڈرنکل جاے۔ اس جذبہ برباد کا کیا کہنا ؟

دریا کی زندگی پر صدمہ پہنچا جانے (تالیف) مجھ کو نہیں گوارا ساحل کی موت مرنا
 دیکھ لیجئے یہاں بھی تالیف پر یگانہ کا سایہ پڑ گیا ہے یا نہیں۔ الٹ پلٹ کر
 کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔ آخر کیوں دریا کی زندگی پر ہزار جانیں صدمہ پہنچا
 کوئی وجہ بھی ہو۔ ساحل کی موت مرنا کیوں گوارا نہیں کیا وجہ ہے کچھ اشارہ ہی
 بتایا ہوتا۔ اولیٰ نوکھا تقابل تو دیکھئے۔ دریا کی زندگی کو ساحل کی موت مرنے پر پیچھ دینا یعنی چہ زندگی
 زندگی پر دریا کی ہونواہ ساحل کی۔ موت پھر موت ہے خواہ کہیں آئے۔ دو چیزوں میں تقابل کے لئے
 ایک قدر مشترک ضرور ہوتی جو دریا و ساحل کے درمیان قدر مشترک ان کر ایک بات تو یہ ہو سکتی
 ہے (۱) دریا کی زندگی گوارا ساحل کی زندگی ناگوار کسی معقول وجہ کے ساتھ (۲) دریا
 کی موت گوارا ساحل کی موت ناگوار کسی معقول وجہ کے ساتھ۔ مگر دریا کی زندگی گوارا
 اور ساحل کی موت ناگوار یہ کون سا تقابل یہ کون سی تلک ہے۔ تالیف کے اس
 شعر میں کوئی قدر مشترک ہی نہیں۔ شعر مہمل ہے۔ بات یہ ہے کہ یگانہ کے مصرع
 میں گزرتا رہا ساحل کو دھڑکتے ڈنکل جاتا ایک تازہ جوش و خروش دیکھ کر
 لے اڑنے کی کوشش تو کی مگر بن نہ پڑی مطلب خبط ہو گیا۔ جو کچھ ہوتا عہ
 میں تو داخل ہی گئی ہوگی !
 ہر ذرہ آد جس کا لبریز تشنگی ہے (تالیف) اس خاک کی بھی جا اے بے تر گزرتا
 (یگانہ)

دیکھوں کب تک گلوں کی تیشہ ہی فطرت کا گلہ کروں تو ہے بے ادبی
 پیا سے تو ہیں جاں بلب مگر ابر کرم دریا پہ برتسا ہے، نہ ہے بوجہ عجبی

جل جلالہ بستم ظریفی فطرت کا ایسا درد انگیز مرقع اُردو تو کیا فارسی میں بھی
 نایاب۔ کیا ممکن ہے آپ انگریزی لٹریچر سے کوئی ایسا ہی مکمل ایسا ہی
 حیرت انگیز شاہکار اسی موضوع پر پیش کر سکیں جو چارہ مصرعوں میں ختم ہو گیا ہو۔
 اللہ اللہ پھول کھلا رہے ہیں۔ مارے پیاس کے جاں بلب ہیں مگر ابر کرم ایسے
 جاں بلب تشنہ کاموں کو چھوڑ کر برس رہا ہے کہاں؟ دریا پر! اف ری بوجہ عجبی!
 بھلا اس شاہکار کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ فطرت کی اس ستم ظریفی کا مشاہدہ
 تو سبھی کرتے ہیں۔ مگر اصل مشاہدہ سے اتنی حیرت نہیں ہوتی جتنی اس رباعی
 کے مطالعہ سے۔ خدا جلنے شاعر پر اس مشاہدے کا کتنا زبردست اثر پڑا ہے
 جس نے اس الہامی آرٹ کی صورت اختیار کر لی۔ یہ رباعی یگانہ کی زبان سے خود
 فطرت کا اک شاہکار ہے اور خود شاعر بھی اگر فی الحقیقت کوئی *Genius*
 ہے تو فطرت کا اک شاہکار ہے۔ مانو تو بت نہیں تھیر۔ اس الہامی آرٹ کی نقل
 تالیف نے یوں اُتار لی چاہی کہ وہاں تو ابر دریا پر برس رہا تھا یہاں اس خاک پر برسے
 کے لئے بلایا جا رہا ہے جو لبریز تشنگی ہے۔ مگر کیا اس ایک لفظ ”لبریز تشنگی“
 سے یگانہ آرٹ کی نقل اُتر سکتی ہے؟ چہ نسبت؟

(یگانہ)
 دیوانہ وارد ڈر کے کوئی لپٹ نہ جاے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجے
 یہ شعر بھی دنیا کے شعر و سخن میں قیامت برپا کر چکا ہے۔ پہلے عرض کر چکا ہوں
 کہ عاشقانہ شاعری یگانہ کے دائرہ تغزل سے خارج ہے اور داخل ہے بھی تو
 جیسے دال میں نمک۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا کیا برقی اثر دکھایا ہے

یعنی بے اختیار دُر کر لپٹ جانے کی ہوس۔ اس کی بھی نابغہ نے نقل اتارنے کی کوشش کی مگر بن نہ پڑی۔
آج اک حسین نے شک کے قابل بنا دیا (نابغہ) آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے میدل بنا دیا بالکل ٹھیس چھسا شعر ہے کہاں وہ کہاں یہ۔ اصل و نقل کا فرق ظاہر ہے۔

سانس لیتا ہوں تو آتی ہر صد بار گشت
(یگانہ) کون دن ہو گا کہ اک نالہ رسا ہو جا بیگا

موت کی آرزو۔ اس موضوع پر ہزاروں شعر دیکھ جلیے مگر ایسا اچھوتا انداز کہیں نہ ملے گا۔ ہر سانس گویا صدائے بازگشت کی صورت پلٹ آتی ہے۔ یہ ہے شعر و حکمت کا امتزاج۔ کون دن ہو گا کہ اک نالہ رسا ہو جائے گا۔ ایسا کہ پھر پلٹ کر نہ آئے منزل مقصود سے۔ کیا شوق فنا کیا آرزوے وصال ہے۔ کیا انداز فکر ہے۔ نابغہ نے اس کی بھی نقل اتارنی چاہی۔

ڈھونڈھ کے اب لے کیونکر انھیں (نابغہ) ہے وہ نالے کہ رسا ہو گئے
نقل کیسا ہی بھیس بدلے چھپ نہیں سکتی۔ وہاں تو یگانہ نے ہر سانس کے پلٹ آنے کو صدائے بازگشت سے استعارہ کیا ہے جو اک تازہ اختراع ہے (صدائے بازگشت پر یگانہ کے اور بھی چند اشعار ہیں۔ جو سلف سے آج تک کسی کے حصے میں نہ آئے) وہاں تو یہ آرزو ہے کہ کاش اک نالہ ایسا رسا ہو جائے کہ پھر پلٹ کر نہ آئے وصال دوام ہو جاوے اور نابغہ کو یہ فکر ہے کہ جو نالے رسا ہو چکے انھیں پھر ڈھونڈھ لائیں۔ بالکل بے اثر مصنوعی تمنا ہے۔ نالے جب رسا ہو گئے منزل مقصود

کو پہنچ گئے تو پھر انھیں ڈھونڈھنا یعنی چھ ۹
حقیقت حال یہ ہے کہ جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ جب نابغہ نے شاعری کے کوچے میں قدم رکھا ہے اس وقت عزیز لکھنوی اور میرزا یگانہ (دوران حال یا اس) کا کلام ملک میں معیاری حیثیت سے خاص و عام کے پیش نظر تھا۔ اس جدید رنگ تغزل کی پذیرائی اور تقلید ہو رہی تھی۔ شہر و بیرونجات کے لوگ بقدر ذوق و استعداد فائدہ اٹھا رہے تھے۔ چنانچہ نابغہ پر بھی جا بجا یگانہ کا سایہ پڑ جانے کا ثبوت ملتا رہا ہے۔ غور سے دیکھئے۔

یگانہ
ہیں سے سیر کر لو یا س اتنی دور کیوں جاؤ ۱۹۱۷ء
دل ویراں نہیں اک محشر تانِ نخل ہے ۱۹۱۵ء
اس کے بعد نابغہ کا شعر ملاحظہ ہو۔

ہیں سے روز کر لیتے ہیں سیر دو جہاں خوشی ۶۲۵ء
نابغہ کا یہ شعر یقیناً ۱۹۲۵ء یا اس کے بعد کہا گیا ہے کیونکہ یہ علیگڑھ جوہی کے مشاعرہ کی طرح تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ نابغہ کے اس شعر پر یگانہ کے مذکورہ بالا اشعار کا سایہ پڑ گیا ہے بلکہ قریب قریب وہی سب الفاظ آگے ہیں۔ یگانہ کے دو شعر سے تھوڑا تھوڑا مضمون اخذ کر کے نابغہ نے بھی اک شعر کہہ لیا۔ جادو وہ سر پر چڑھ کے بولے۔

(یگانہ)
نملے بھر کا منہ تکتے ہیں کیوں؟ اپنی طرف کھیں
بسر کرنا ہے جن کو رنگ بولے لا لگاں ہو کر

دنیا کے بڑے بڑے اولوالعزم افراد چونکہ اپنے زمانہ کے معیار سے بہت بلند ہوتے ہیں اس وجہ سے اپنا زمانہ انھیں صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتے۔ پس نامساعد ماحول کے سبب ایسی بلند ہمتیوں کو جس رائیگاں کی طرح بسر کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ وہ اپنے مرتبہ سے واقف ہوتے اس لئے عالم کس میسر میں بھی اپنی طرف دیکھتے ہیں۔ زمانے کے رد و قبول کی پروا نہیں کرتے۔ پرا یا منہ نہیں تکتے۔ اسی کو نابغہ نے یوں کہہ دیا ہے

گل ویرانہ ہوں میں مجھ کو کیا مطلب گشتاں سے تو ہی دیکھ اے مجھے خلاق حسن رائیگاں میرا
یہ کھلی ہوئی چوری نہیں تو اور کیا ہے۔ حسن رائیگاں کے مفہوم کو یگانہ نے رنگ بوے رائیگاں سے ادا کیا ہے۔ لفظ حسن کو قصد ترک کر کے اس کے لوازم یعنی رنگ و بو سے وہی مفہوم بالکنا یہ ادا کیا ہے۔

علم بلاغت کا یہ طرہ اگر ہے (بالکنا یہ مفہوم ادا کرنا) جس سے امام الغزل میرزا یگانہ چنگیزی خوب واقف ہیں اور خوب کام لیتے ہیں۔ نابغہ نے وہی پیش یا افتادہ لفظ ۱۵ اور میرزا یگانہ کی شخصیت تو اتنی عجیب و غریب ہے کہ دور سے دیکھنے والی تعصب اور غبار آلودہ آنکھوں کا تو ذکر کیا قریب دیکھنے والی آنکھوں یعنی اُن کے جاننے پہچاننے والوں نے اُنکی اجابت بھی انکو صحیح طور پہچانتے اور سمجھنے میں ہمیشہ غلطی کی ہے۔ یہ اک ایسا راز حقیقت ہے جس کے سمجھنے والے محدود چند ہیں۔

۱۶ شعر و شعریت پر لکچر دینے والے تو بہت ہیں مگر آپ نے یہ بھی کہیں پڑھا ہے کہ شعروائی کے اصول اور اس کے گمہ کیا کیا ہیں۔ آپ نے سنا تو ہو گا علم سفینہ کے علاوہ اک علم سینہ بھی ہوتا ہے۔

”حسن“ اختیار کیا جسے یگانہ نے قصد ترک کر دیا تھا۔ فکر یہ کس بقدر محنت اوست۔ اصل و نقل کا فرق ظاہر ہے نابغہ کا حوصلہ تو بس اتنا ہی ہے کہ حسن رائیگاں کا دیکھنے والا کوئی میسر نہیں آتا تو وہ خلاق حسن سے التجا کرتا ہے کہ تو ہی دیکھ میرزا یگانہ کا حوصلہ یہ ہے کہ وہ خلاق حسن کو بھی متوجہ کرنا نہیں چاہتے بل اپنی طرف دیکھتے ہیں۔ جل جلالہ کیا ثبوت دیا ہے انسانی عظمت و شرافت کا۔ کوئی لاکھ پردہ ڈالے یگانہ کی انفرادیت چھپ نہیں سکتی۔

و بال رنگ بو سے چھوٹے ہی پر نکالیں گے
(یگانہ) گراں بار بہار آخر بسکد و ش خزاں ہو کر

انداز کلام کی تازگی و شگفتگی بلا حنطہ فرمائیے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کلام کی شگفتگی اور چنی ہے۔ اور موضوع کی شگفتگی اور چنی ہے۔ موضوع خشک بھی ہو تو کلام بجائے خود شگفتہ و دل آویز ہو سکتا ہے۔ چمن کے پھول پتے خزاں آتے ہی و بال رنگ بو سے چھوٹ کر پر نکالیں گے (یعنی اڑ کے کہیں سے کہیں پہنچ جائیگی) اس مفہوم کو آج تک کسی نے ان الفاظ میں بیان نہیں کیا۔ اک معمولی سا روزمرہ ہے مگر مابین تازہ انداز تصرف سے اسی میں الہامی شان پیدا ہو گئی ہے۔

جہنم ہو کہ جنت طائر جاں تھم نہیں سکتا (یگانہ) کہیں پرواز کی حد مل سکے گی لامکاں کر طائر جاں قید عنصری سے چھوٹ کر لامکاں ہو جاتا ہے پھر کہیں تھم نہیں سکتا۔ روح مجرد کے لئے کوئی قید مکانی نہیں۔ نہ جنت نہ جہنم۔ ان دونوں اشعار سے اخذ کر کے نابغہ نے بھی اک شعر گڑھ لیا ہے

خزاں آتے ہی ٹوٹیں جلوہ ظاہر کی قیدیوں شکستِ رنگ نے پرواز بخشی طائرِ جاں کو
 وہاں رنگِ نو سے چھوٹے ہی پر نکالیں گے اسی کو الٹ پھیر کر بلکہ توڑ ٹوڑ کر
 نابغہ نے یوں کہہ دیا سے شکستِ رنگ نے پرواز بخشی طائرِ جاں کو کیوں حساب
 پوری اور کسے کہتے ہیں؟ ان سب مثالوں کو پیش نظر رکھ کر اور کلامِ نابغہ کے
 رطبِ یابس دونوں کو میزانِ خرد میں تول کر دیکھئے اور محالہ کیجئے کہ اہلِ کمال
 کے سامنے وہ ایک خوشہ چیں آسانی ہے یا کوئی معتبر شاعر؟ ہاں جنسی شاعری
 او با شانہ شاعری میں چاہے وہ کتنا ہی مشہور ہو جائے کسی کا حق تلف کرنا بڑا
 جرم ہے جس کا جتنا حق ہو اسے ملنا چاہئے۔ آپ کو غالباً یہ تسلیم کرنے سے انکار
 نہ ہو گا کہ شاعر کے لئے اویس ہونا ضروری ہے۔ مگر آپ ہی غور فرمائیں کہ نابغہ کو
 ادیبانہ زندگی سے کیا تعلق؟ اتنا کیوں کی طرح گناہ بجا نا۔ شعر و شاعری کر لیتا اور
 بات ہے۔ شہرت عامہ کی نہ کہیے۔ اک درزی بھی شاعرانہ شہرت حاصل کر لیتا ہے
 اک عینک فروش بھی۔ نابغہ نے اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھا ہے۔
 ”مجھے اپنے شعر و ادب پر سب بڑا فخر ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری
 میں بالکل مطابقت ہے۔ تضاد نہیں۔“

اس بلند آہنگی سے اس شخص کی شہرت عامہ کے سبب لوگ دھوکا کھا جائیں
 تو عجب نہیں۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ زندگی اور شاعری میں بالکل مطابقت
 قابلِ فخر جیسی ہو سکتی ہے کہ خود اپنا طرزِ زندگی کوئی قابلِ فخر اہمیت رکھتا ہو محض
 لا اُ بالی زندگی (جس کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں نہ ہوں) اور شاعری میں بالکل مطابقت
 ہوئی بھی تو کیا اور ممکن ہی نہیں کہ شاعر کی شاعری اور اس کی زندگی میں بالکل

مطابقت ہو سکے کیونکہ وہ آپ بیتی بھی کہتا ہے اور جگ بیتی بھی۔ اور یہ فخر کچھ اسی
 شخص کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ مرزا دارغ کو بھی یہ فخر حاصل تھا جیسی اول
 کی زندگی ویسی اُن کی شاعری۔ حالانکہ دارغ کے ساتھ وہ سب ذمہ داریاں بھی
 تھیں جو اک دنیا دار کے لئے ضروری ہیں۔ مگر اک ہنگ لاڈلا سا سکھی جس کے
 بیوی نہ بچے۔ نہ کنبہ نہ قبیلہ۔ نہ بیوی بچوں کی پاکیزہ و معصوم محبتوں کا مزہ جانے نہ
 اُن کے دکھ درد کا تجربہ رکھتا ہو اور یہ وہ تجربہ ہے جس سے انسان مرتبہ رشد
 کو پہنچتا ہے (جس کے ہاں نہ کوئی بچہ پیدا ہوا نہ مرادہ کیا جائے دارغ جگر
 کیا ہے اور زندگی کا درد سر کیا ہے آہ آہ! بھلا ایسا شخص کیوں نہ جن عشق
 کی تانیس اڑتا پھرے۔ زندگی کی صبر آزمائیاں اور سختیاں تو اس کے لئے ہیں
 جو صاحبِ ناموس ہو۔ لا اُ بالی زندگی کی اہمیت ہی کیا؟ اک مطلق العنان غیر ذمہ دارانہ
 زندگی کے ساتھ کسی نے اپنی شاعری کو ”بالکل مطابق“ بنا بھی لیا تو یہ کون سا
 کمال ہے۔

اس تنازعے است کہ ہر بے سرو پاے دارد
 ایسی سہل ایسی سبک زندگی بسر کرنے والا اگر قص و سرودہ سرخوشی و سرمستی
 کے راگ الاپے نفسیات جنسی کی بکھان کرتا اور نوجوانوں کے جذبات جنسی کو
 ابھارتا پھرے۔ ہجر و وصل کے پرانے فرسودہ معاملات کو اپنی شاعری کا موضوع بنائے تو
 کونسا تعجب کیونکہ بازار میں انھیں چیزوں کی آگاہی بچے اور تعمیرِ آرٹ کے گاہک کہاں؟

Favour is not always gained by good
 actions or laudable qualities

ایسا ہنگ آدھی بڑے بڑے راجاؤں۔ ہمارا جو کو بھی خطرے میں نہ لائے اس کے لئے کیا مشکل ہے۔ سارے ملک ساری قوم سے حق یا ناحق لڑ پڑے تو کوئی اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے (مگر نابغہ سوارے ہیں اننادم کہاں سے آتا ہے) یہ امور مشکل تو اس کے لئے ہیں جو صاحب ناموس ہو۔ دنیا دار ہو۔ تعلقات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو۔ پابندیوں کا بندہ ہو۔ اور وہ جو فکر معاش و معاد سے آزاد و مطلق العنان ہو۔ بیک بینی و دو گوش جدھر چاہے چل پکڑا ہو اور خود اپنی شاعری کا چلتا پھرتا اشتہار ہو اس کی زندگی اور اس کی شاعری میں کتنی ہی مطابقت ہو، ادھر سے کا ادھر وہی رہے گا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ شاعری زندگی کو اس کے کلام سے مطابق کرنا مغالطہ میں پڑنا ہے محض اس کے کلام سے اس کی شخصی زندگی کی حقیقت اس کے گھر گھاٹ تک پہنچنا ممکن نہیں۔ کیونکہ شاعر کا کلام اول سے آخر تک قال مطابق حال نہیں ہوتا کچھ ہوتا ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ آپ بیتی بھی کہتا ہے اور جگ بیتی بھی شاعروں اور واعظوں میں ایسے لوگ بہت ملیں گے جن کا کلام تو نہایت پاکیزہ و بلند ہو گا مگر ان کی عملی زندگی اس کے برعکس ہوگی۔ بقول مولانا سلیمان ندوی نابغہ مذکور کے ”معنوی خیالات بہت مختصر ہیں جنہیں وہ الٹ پلٹ کر دہرا لیتے ہیں مگر سننے والوں کو

بقیہ نوٹ ۲۲۲ Careases & preferments are often bestowed on auxiliaries of vice, the procurers of pleasure or the flatterers of vanity. لے معنوی خیالات کیسے ہوتے ہیں اور فطری خیالات کیسے ہوتے ہیں ؟

وہ باتیں ہی معلوم ہوتی ہیں۔“

بہت صحیح فرمایا۔ مگر سننے والوں میں کچھ اہل نظر بھی ہوتے ہیں جو کچھ لیتے ہیں کہ شاعر کے ذاتی جوہر کیا ہیں اور مانگے مانگے کی مستعار طرح داری لباس رانی کہاں تک ہے۔ شخص مذکور کے کلام میں انہیں جنسی معاملات (حسن و عشق) کی کثرت ہے جن سے برأت و داغ کے دوا دین بھرے پڑے ہیں۔ مگر انداز بیان میں انفرادی خصوصیت نمایاں ہے۔ نابغہ مذکور کو خود بھی اقرار ہے کہ حسن و عشق ہی اس کی زندگی ہے اور یہی موضوع ہے اس کی شاعری کا۔ خیر حسن و عشق کی دولت جسے حاصل ہے اسی کو مبارک ہو۔ شعر و سخن میں تو یہ موضوع بہت پرانا اور فرسودہ ہو چکا ہے عشق و محبت کا جسکے ہر کس و ناکس کو ہوتا ہے۔ عاشقانہ شبابی شاعری اک عامی کے لئے دشوار نہیں ہے۔ عاشقانہ ماحول اور بھڑی سی لہ بل بکھڑے کوئی دیوانہ وار آہی گویا تم کو پیار آئے نہ آئے ہکو پیار آہی گویا گوری گوری کلاسیاں تو یہ ہائے کج اداسیاں تو یہ!

اس قسم کے مصرعے نابغہ مزاد بادی کے ذریعہ سے اردو ادب میں داخل ہو گئے۔ حالانکہ یہ سستی شاعری لکھنؤ کے مانگے والوں کے لئے چھوڑ دی گئی تھی۔ ذمہ دارا صاحب کبھی ایسی شاعری کو اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کرتے۔ مگر یہ سستی سے لوگ اسی ادبی تنزل کو ترقی سے سو گرا کر لگے تھے جگر کی شاعری، جاپانی مال

(میرزا یحیٰٰں چنگیزی)

دور و زہ فوجوانی، حسن نسوانی کے کیا کہنے
جگر کی شاعری یا مال جاپانی کے کیا کہنے

وہ شاعری جس کا موضوع ہے حیات انسانی اور حقایق کائنات (ملاحظہ ہو ص ۲۲۲)

موزونی طبع کی ضرورت ہے۔
البتہ میرزا بیدل جیسے حکیم عالی منزلت کی غزل گوئی غالب جیسے استادوں
کو لوہے کے چنے چوڑتی ہے۔
اچھا "عاشقانہ غزل گوئی" اگر اذروئے فن مکمل بھی ہو ناقص کا ذکر ہی کیا)
اوس کی افادی حیثیت محض تفریحی رہ جاتی ہے۔ تعمیری نہیں ہو سکتی۔ دنیا کے
جتنے بھٹوں سے فراغت پالنے کے بعد اک تھکا ماندہ شخص عاشقانہ کلام سے

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۲۵۔ شرح و تفسیر یعنی حکیمانہ و فلسفیانہ شاعری بازار میں یا نثر
شاعرہ میں اس عاشقانہ وادبائشانہ شاعری سے کیونکر کشش یا سکتی ہے جس کا موضوع
ہے لذت نفسانی۔ ترغیب جنسی وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ نواب مرزا شوق لکھنوی
داغ دہلوی اور جگر مراد آبادی کی شاعری کا مقابلہ بازار یا اسٹیج پر نہیں کیا جاسکتا۔
اور یہ بھی اک دلچسپ حقیقت ہے کہ ادبائشانہ جنسی شاعری باوجود جنسی ترغیب کے
مزاحیہ۔ ہزلیہ۔ ہجویہ شاعری کے سامنے بازی نہیں لے جاسکتی۔ ایک ہزل گو داغ اور
جگر جیسے مشہور و معروف اشخاص کو چٹکی بجاتے نیچا دکھا دیتا ہے جب چاہو آزاد بخیر
کیونکہ ہزل میں جولذت ہوتی ہے وہ عاشقانہ وادبائشانہ غزل میں کہاں؟ ادبائشانہ
کلام میں جولذت ہوتی ہے وہ حکیمانہ شاعری میں کہاں؟ ان حقایق کو پیش نظر
رکھ کر شاعرہ کی واہ واہ اور بازاری قدر دانی کی حقیقت معلوم۔

ظاہر ہے کہ حکیمانہ شاعری کوئی تفریحی مشغلہ نہیں بلکہ تعمیری آرٹ ہے جس سے
زندگی کو غذا اور طاقت پہونچتی ہے اور طاقت پہونچانا کوئی آسان کام نہیں۔

تھوڑی دیر تفریح حاصل کر سکتا ہے۔ مگر حیات انسانی کی تعمیر و توسیع ملک و ملت
کی صلاح و فلاح کے لئے "عاشقانہ" غزل بازی کوئی زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی
ایسے اعلیٰ لٹریچر کے لئے بڑے دل و دماغ۔ بڑی جانکاہی فکر۔ بڑی ریاضت۔
بڑے اعلیٰ مذاق کی ضرورت ہے۔ یہ کام ہے ایسے جو ہر قابل ایسے مفت کر ایسے
Genuine کا جو زندگی کے مشکل سے مشکل اور پیچیدہ حقایق پر شاعرانہ تصرف

گذشتہ سے مرپستہ۔ برخلاف اس کے ادبائشانہ جنسی شاعری سے نفس کو لذت ملتی
ہے زندگی کی طاقت خرچ ہوتی رہتی ہے)۔ جمعی تو عیاشانہ شاعری آسان اور
عام پسند ہوتی ہے زیادہ سے زیادہ گاہک پیدا کر لیتی ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے
آسان پیش پا افتادہ ہوتا ہے جس کے گھنے کے لئے بالغ نظروں 'ترقی یافتہ دماغوں کی
ضرورت نہیں ہوتی کہہ کر *The little he has to say is obvious at once*۔
اچھی اور سلی باتیں فوراً سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ نفس مضمون کا سطحی اور پیش پا افتادہ ہونا
(جنسی ترغیب کے ساتھ) کبھی ہے شہرت عامہ یا شہرت کا ذریعہ۔ شہرت عامہ کے طالب
کے لئے ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ گاہکوں کے رجحان اور خوشنودی کا خیال رکھے
آسان اور سستے لٹریچر کی کامیابی یا چند روزہ زندگی کا راز یہی ہے۔ جاپان کی طرح
داغ اور جگر نے اس راز کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ ذرا ملاحظہ تو فرمائیے۔

اُف یہ تیغ آزمائیاں تو بہ تیری نازک کلاسیاں تو بہ

آستینوں کا وہ چڑم لینا گوری گوری کلاسیاں تو بہ

گوری گوری کلاسیاں تو بہ! یہ ہے لکھنؤ کے پیکے والوں تانگے والوں کی شاعری

کر کے وجدانی رنگ میں پیش کر سکے جس کے مطالعہ سے انسان کو تکمیل انسانیت میں مدد ملے۔ ظاہر ہے کہ ایسا معیار شاعری محض جنسی معاملات کی بکھان کرنے سے مکمل نہیں ہو سکتا۔

Love is one of the many passions, which of course has a great influence on life, but it is not the sum-total of life." (Dr. Johnson)

(گذشتہ سے پیوستہ)۔
 یکہ ہا نکتے جاتے اور شعریوں کرتے جاتے ہیں یہ خدا کی دین ہے۔ میلے ٹھیلوں میں عورتوں اور طوائفوں کو دیکھ کر دیکھ کر دالے اسی قسم کے آوازے کستے رہتے ہیں۔ گوری گوری کلاسیاں تو بہ ہا سہ یہ کج او اکیاں تو بہ! بھلا کوئی ہندو ادیب ایسے سستے ایسے گھٹیا لٹریچر کی طرف کیونکر توجہ کر سکتا ہے؟ لکھنؤ کے مانگے والے اپنی زبان کے اعتبار سے تو کسی تو خاص میں لائیں سکتے مگر اس پر بھی وہ اپنی تنگ بندیوں کو تنگ بندی ہی سمجھتے ہیں ترقی پسندوں کی طرح اپنی تنگ بندی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ جاہل سہی ترقی پسندوں کی طرح جاہل مرکب میں مبتلا نہیں ہیں۔ دیکھئے تو سہی نازک کلاسیوں سے تیغ آزمائیاں ہو رہی ہیں گویا دہنی بائیں دونوں کلاسیوں سے۔ غور تو فرمائیے تلوار اور ہاتھ سے چلائی جاتی ہے کو اس ہاتھ سے۔ مگر نازکیوں کی آسان سستی شاعری کا معنوی ربط۔ معنوی حسن سے کیا واسطہ؟ وہاں تو نازک کلاسیوں اور شاعرہ کی جھوٹی واہ واہ سے مطلب ہے۔ (بقیہ ۲۲۹)

میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ حسن و عشق کو دو دھ کی مکھی کی طرح نکال کر پسینک دیا جائے۔ عشق و محبت کے بغیر انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ بغیر اس کے انسان انسان نہیں، ٹھنڈی مٹی کا اک پتلا ہے۔ مگر محبت عملی طور پر برتنے کے لئے ہے بکھان کرنے کے لئے نہیں ہے۔ محبت کا جذبہ کیوں ودیعت کیا گیا ہے؟ کیا اس لئے کہ انسان کیف محبت میں ڈوب کر محبت ہی کا ہو ہے؟

اپنی بے دست و پائیاں تو بہ
 کوئی عورت سامنے ہے۔ اس کی نگاہیں اس کی ارمان بھری جوانی کی غمازی کر رہی ہیں۔ کسی مرد کو آنکھوں آنکھوں میں اپنی طرف بلا رہی ہے مگر مرد بیچارہ مجبور ہے۔ دست و پا ہے کیونکر پیوچ جائے؟ یہ ہے خلاہ شعر۔ کتنا او با شائہ تخیل ہے۔ مولانا حالی کے زمانے سے اب تک اردو کی غزل گوئی پر جو اعتراضات ہوئے ہیں یہ شاعری بھی انہیں او با شائہ لغویات کا نمونہ ہے۔ بے دست و پائیاں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے لکھنؤ میں چند روزہ قیام کی وجہ سے جگر کو بھی خواہ مخواہ جمعیں پونے کا شوق چڑایا۔ مگر یہ کیا بے لگھی جمع بنائی ہے۔ کوئی ادیب تو ہرگز ایسی جمع نہ بناتا۔
 راج میں فارسی کا دا و عطف موجود ہوتے اردو کے قاعدے جمع بنانا بے خبری کی آماری پن کی دلیل ہے۔ مگر جس گھر سے ادیبانہ ذمہ داری کی توقع فضول۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مانگے والوں سے بھی ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ دل لگی تو یہ ہے کہ شہرت عاثر یا شہرت کا ذہن کے زخم نے اس شخص کو حد سے زیادہ ڈھیٹ بنا دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے بدھ سے حسن کا اک گوشہ نقاب اٹھا۔ تمام ذرے پکے کہ آفتاب اٹھا

ہرگز نہیں کیا محبت محض محبت کے لئے کرنا غایت فطرت ہے ہرگز نہیں بلکہ انسان و حیوان کے دل میں محبت کا بیج ہو کر فطرت کچھ اپنا کام لینا چاہتی ہے محبت میں دُوب کر انسان نے اپنے تئیں گم کر دیا دنیا سے بے خبر ہو گیا تو یقیناً منشائے فطرت کے خلاف کیا۔ قیس کی طرح محبت میں اپنے تئیں گم کر دینا محبت کا غلط مصرف ہے منشائے فطرت خلاف ہے۔ البتہ محبت کے بل بوتے پر

گزشتہ سے پیوستہ۔ اس شعر کے فٹ نوٹ میں آفتاب اٹھا کو خلاف محاورہ مانتے ہوئے جگر نے بڑی جرأت کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ”مذاق سلیم سے کام لیا جائے تو یہ ایک اجتہاد ہو گا جسے رائج ہونا چاہیے“ انوس ہے اس جرأت پر اس اجتہاد پر اسے کہا ہے چچا سعدی نے ”ہمنزندان میرند و بے ہنزاں جاسا ایشان گیرند“ مذاق سلیم تو آفتاب اٹھا یا آفتاب بیٹھا کو کبھی رواج دے نہیں سکتا۔ جگر اور اجتہاد؟ چھوٹا سٹنڈ بڑی بات۔ عجب نہیں بے دست پائیاں جیسی ہل جمع کو بھی اجتہاد کہہ دیا جائے۔ تھو۔

شبنم آلودہ وہ حسین آکھیں مرغ پر اڑتی ہوائیاں تو یہ پکھی غالباً کسی عورت کی تصویر ہے آنکھوں میں آنسو۔ منہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئی۔ اشک آلودہ آنکھوں کو شبنم آلودہ کہنا بھی ایک دہقانی قسم کی جدت ہے۔ شبنم بجائے خود خوبصورت لفظ ہے مگر آنکھوں کے ساتھ شبنم کا کوئی معنوی رشتہ نہیں شبنم چھوٹوں پر پتوں پر بہا رکھاتی ہے آنکھوں پر شبنم کوئی بہا نہیں دیتی۔ یہ کوئی جدت نہیں ہے لفظی بازیگری ہے جس سے کوئی معنوی حُسن پیدا نہیں ہوتا۔

فرہاد صفت پہاڑ کاٹ کر جو شیر نکال لانا شاہجہاں کی طرح دنیا کو جنت کا نمونہ بنادینا محبت کے مائے ناز کارنامے ہیں۔ یہ تھا محبت کا صحیح مصرف۔ یہ ہے محبت کا صحیح فلسفہ۔ محبت اک بڑا سہارا ہے۔ بڑی قوت محرکہ ہے۔ زندگی کی شین کا بڑا چلتا ہوا پرزہ ہے۔ بڑے بڑے مردانِ اولوالعزم کے لئے بھی اور عوام الناس

گزشتہ سے پیوستہ۔ اس کی غم التفاتیاں ہے ہے اپنی بے اعتنائیاں تو یہ یہ شعر بھی کسی عورت مرد کا معاملہ ہے۔ مرد عورت کے ساتھ بے اعتنائیاں کرتے لگے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ غمگین رہنے لگے گی۔ مگر خود غم کی طرف التفات کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی غمگینی کی جگہ غم التفاتی یعنی چہ؟ اتاری پھر اتاری ہے جمع ہونے کے لئے سلیقہ چاہئے۔

سرسودا کی شورشنیں پیہم ہر طرف جگ ہنائیاں تو یہ سرسودا فہم؟ اصل مقصد تو تھا سرسودا زردہ کی شورشنیں۔ مگر وزن میں سرسودا زردہ کی گنجائش نہ تھی مجبوراً سرسودا کہہ دیا بندہ ضرورت کیا کرے۔ رفتہ رفتہ وہ بے پناہ سکوت سب سے نا آشنائیاں تو یہ

سرسودا زردہ کی شورشنیں جاتی رہیں۔ اک سکوت بے پناہ سکوت سوار ہو گیا۔ سب سے بیگانگی یا نا آشنا ہو گئی۔ مگر یہاں نا آشنائیاں خواہ مخواہ کی جمع کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اہل زبان اس محل پر جمع (نا آشنائیاں) کبھی نہیں بول سکتے۔ معلوم ہوتا ہے اہل لکھنؤ کی دیکھا دیکھی آپ ابھی جمع ہونے کی عادت ڈال رہے ہیں۔ موت سے ہر نفس وہ رازنیاں موت کی ہمنوائیاں تو یہ

کے لئے بھی۔ اس راز حقیقت کو کبھی بھولنا چاہیے کہ قدرت کے کارخانے میں نخت، زندگی کا عین مقصد نہیں ہے بلکہ حصول مقصد (مقصد آفرینش) کا بڑا ضروری آلہ کار ہے۔ وہ مقصد کیا ہے؟ مقصد وہ نہیں ہے جسے تم نے اپنی خام خیالی، کوتاہ نظری و سوسے نفسانی کے تحت خود اپنا مقصد سمجھ رکھا ہے۔ تم کیا

گذشتہ سے پیوستہ: کچھ کہو تو سہی موت کی کیا ہمنوائیاں ہو رہی ہیں۔ پیٹ کی بات کون سمجھے؟ مطلب خطہ شعر مہمل۔

ایک بہ یک آنکھ چار ہو جانا دیر تک روئیاں تو بہ
اچانک سامنا ہو جانا دیر تک و دنوں کا محو دیدار رہنا تو عین فطرت ہے۔ مگر یہاں روئیاں کا کیا موقع ہے؟ روئنائی کے لئے پہلے سے تیار ہونا پڑتا ہے۔ اچانک روئنائی نہیں ہوتی۔ دیدار کی جگہ روئنائی کہنا گوارا نہیں ہے۔
حُسن میں رقص کا سا اک عالم شوق کی لئے نوائیاں تو بہ

لئے نوازیاں کی جگہ نئے نوائیاں واہ جی واہ کیا کیا جمعیں اگل رہے ہو۔ ذرا ہوش کی دوا کر دفارسی ادب میں تو اس مہمل ترکیب (نئے نوائی) کا کوئی وجود ہی نہیں۔ ہاں لے نوازی (بائسری بجانا) معروف ترکیب ہے۔ جو فارسی کے مصدر نواختن سے بنائی گئی ہے۔ نواختن سے لے نوائی تو بن ہی نہیں سکتی۔ البتہ خوشنوائی تلخ نوائی۔ ہمنوائی تعارف ترکیبیں ہیں صحیح اور بامعنی۔ ان میں سے کسی ایک کو نواختن سے کوئی لگا نہیں۔ مگر یہ یوں صحیح ہیں اور ”نئے نوائی“ کیوں غلط ہو۔ اسے ادیبانہ لہجہ کہہ سکتے ہیں۔ تلخ نوائی، ہمنوائی وغیرہ نواختن سے نہیں ”نوا“ سے بنے ہیں اور ”نوائی“ نہ نواختن سے بن سکتی ہے نہ ”نوا“ سے! (بقیہ مد ۲۳۳)

تھارا مقصد کیا۔ مقصد تو وہی ہے جو فطرت نے مقرر کر دیا ہے۔ سوچو اور سمجھو وہ کیا ہے؟ وہ ایک لفظ ہے ڈیوٹی! مگر سرانجام فرایض کے لئے دل میں قوت ہونی چاہیے اور وہ قوت ہے محبت پس وہ شاعر ناقص جو محض محبت ہی کے پارینہ مضامین دہرایا کرتا ہے وہ زندگی کے عین مقصد کو چھوڑ کر محض آلہ کار تک اپنی

گذشتہ سے پیوستہ اناڑی کیا جانے۔ اناڑیوں کے وصلے اب اتنے بڑھ گئے کہ جہل مرکب کے زعم میں اپنی ادبی لغزشوں کو بھی اجتہاد سے موسوم کرنے لگے تھو افسوس ہے مجھے اب ایسے لوگوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ کام تھا لکھنؤ کے نوجوان ادیبوں مثلاً میرزا جعفر علی خاں اثر اور حکیم آشفقت جیسے اصحاب کا کہ گزشتہ بیس سال میں جگر اور جوش وغیرہ نے ملک میں جو ادبی گمراہی پھیلائی ہے اور اواباشانہ جنسی شاعری نے ملک کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق کو جیسا تباہ کیا ہے اس کا جائزہ لیتے جاچتے۔ پر کھتے روک تھا کرتے۔ مگر وہاں کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی افسوس!

اچھا اب یہ بھی دیکھ لیجئے کہ اس شعر کا حاصل کیا ہے۔ یہی تو ہے کہ اک مرد عالم شوق پس یا نسری بجا رہا ہے اور اک حسین عورت ناچ رہی ہے تھرک رہی ہے وہی جنسی ترغیب وہی اواباشی جس نے ملک کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے اندر مستانہ زہر جھٹکا دیا۔ اس کے سوا اس شعر میں اور کون سی معنوی خوبی ہو سکتی ہے جگر نے ترنم کے ساتھ اسٹیج پر یہ شعر پڑھا ہو گا تو مشاعرہ کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اچھل پڑا ہو گا۔ ایسی جھوٹی اور بے معنی تعریفوں سے اپنی حقیقت کو فراموش کر کے

شاعری کو محدود رکھتا ہے۔ اگر وہ معاملات حسن و عشق ہی کو زیادہ تفصیل زیادہ
تکرار کے ساتھ بیان کرنے میں مصروف رہے گا تو بہترین ناگفتہ بہ امور کی تشہیر
کا مرتکب ہوگا۔ محبت عملی طور پر صدق نیت کے ساتھ برتنے کے لئے ہے بیان کرنے
بکھان کرنے کے لئے نہیں ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ۔ اک انارٹی "نے نوائی" کی سی پہل ترکیب کو بھی اجتہاد کہہ دو
تو کیا عجب ہے۔ میرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے ۵
ہرزہ شتاب کئے جاوہ شاساں بردار ایک در راہ سخن چون تو ہزار آمد و رفت
منزل عشق لے خدا کی پناہ ہر قدم کر بلائیاں تو بہ
کر بلائیاں۔ نئی جمع ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ لکھنؤ کی ہوا کھا کر سدا ہوئی
ہے۔ اس آب و ہوا میں جتنی من گڑھت جمیں بنائی گئی ہیں ان میں یہ جمع کچھ
معنویت رکھتی ہے یعنی کر بلائیاں بمعنی قربانیاں۔ جان نثاریاں وغیرہ بلکہ وہ تمام
مفہوم و لفظ کر بلا کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ مفہوم تسلیم کرنے کے بعد شعر کا مطلب یہ
ہوا کہ منزل عشق وہ منزل ہے جہاں قدم قدم پر ایک نہیں دو نہیں ہزاروں ایسی مثالیں
ملتی ہیں جو کر بلا والوں نے پیش کی ہیں۔ یہ ہے اس شعر کا مفہوم۔ بظاہر کتنا اونچا
تخیل ہے جس کے آگے واقعہ کر بلا بھی شاعر کی نگاہوں میں اک معمولی سا واقعہ
نظر آتا ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس دعویٰ کی بلند آہنگی میں کچھ بڑے صداقت بھی
ہے یا نری زیت زیت ہے۔

بجئے اور پھر جناب جگر پی پلا کر برائیاں تو بہ

یہی وجہ ہے کہ ایران کے اکابر شعرا نے غزل کو محض حسن و عشق تک
محدود نہیں رکھا بلکہ حیات انسانی کے نازک سے نازک اسرار و خفایاں کو
غزل میں داخل کر کے اپنی بہترین قوت صرف کی ہے جن کے مطالعہ سے دل داغ لگتا

گزشتہ سے پیوستہ۔ دوسرا مصرع نہایت برجستہ۔ مگر جگر تو ایک ہی مصرع کا شاعر
ہے۔ مصرع پر مصرع لگانا آتا نہیں۔ دیکھو یوں مصرع لگاتے ہیں ۵
کیوں جگر بجوے اسی منہ سے پی پلا کر برائیاں تو بہ؟
اپنے ناقص معیار کے لحاظ سے جگر نے یہ غزل "بڑے زوروں کی" کہی ہے مگر
اول سے آخر تک طفلانہ۔ بواہو سناہ عورت بازی کے سوا اس شاعری میں کیا رکھا
ہے۔ زندگی کی وسعتوں اس کی ذمہ داریوں اور دشوار مرحلوں سے کیا واسطہ؟ خیر
دیکھئے یہ جا پانی مال کے دن چلتا ہے۔ ایک غزل میں اتنی ٹھوکریں افسوس!
یہ تو وہ شاعری تھی جو زیادہ سے زیادہ گاہکوں کے رجحان اور خوشنودی کی
تالیق ہے۔ مگر حقیقی سخنور بالادست اپنے بل بوتے پر بھروسہ رکھتا ہے۔ عوام
کی ہلکی ہوئی ذہنیوں کو کچلتا رہتا ہے۔ اپنی خوشنودی اپنے فرائض کے سامنے
کسی کی خوشنودی کی پروا کیوں کر ہے؟

تو آپ اپنی بے شمیر آپ اپنی سپر
یگانہ باگ اٹھا اپنے بل پر کتا جا

In his original form of spirit we discern the highest gift of
mankind, without any deficiency of the lower: he has an eye
as keen as a hawk's for the sublime, the common and the ridiculous.
The elements of a poet, a thinker & a wit."

شگفتگی کے ساتھ ساتھ تکمیل انسانیت ہوتی رہتی ہے خواہ وہ خفایق زندگی
خوشگوار ہوں یا تلخ و ناگوار سب کے مطالعے سے بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اور
بعض اوقات ان اشعار کے مطالعہ سے انسان کی ذہنی و عملی زندگی کا رخ بدلتا
ہے، جیسے میری ذہنی زندگی کا رخ ابوطالب حکیم ہمدانی کے اس شعر نے بدل دیا ہے
گردلِ این مخزنِ کینہ است کہ مردم دارند
ہر کہ یک دل شکستہ کعبہ آیا دکنند

کتنے افسوس کی بات ہے کہ اکثر غیر ذمہ دار شاعری پیشہ اشخاص زندگی ہوسنا کی
رقص و مستی، عیش و نشاط وغیرہ کی تبلیغ کر کے اپنے ساتھ اوروں کے ضمیر کو بھی آلودہ
کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو اتنا بھی احساس نہیں کہ زندگی و ہوسنا کی
کارنامے جن عشق کے معاملات تشہیر کے قابل نہیں ہوتے۔ فطرت کا قانون ہی
کچھ ایسا ہے کہ عشق کے معاملات و واردات پردے ہی میں رہیں۔ ان کی
تشہیر نہ ہونے پائے۔ ہر ملک ہر قوم کی روزمرہ زندگی میں عیش و نشاط۔ سرمستی و
سرخوشی کے واقعات عورت مرد کے درمیان عشق و ہوس کے معاملات روزانہ
پیش آتے رہتے ہیں۔ مگر ان میں سے فی صدی کتنے واقعات اخبار میں جگہ پاتے ہیں
بہت کم۔ ان ناگفتہ بہ امور کا بے تکلف اعلان کہاں تک کیا جاتا ہے۔ بہت کم۔
آخر اس کا سبب؟

سبب یہی ہے کہ قانون قدرت اس قسم کے واقعات کی تشہیر نہیں چاہتا۔ بلکہ پردہ
ڈالنا چاہتا ہے۔ زندگی کے عیش آلودہ پہلو کو چھوڑ کر دوسرے پہلووں پر غور کیجئے

کیسے ہنگامہ خیز عبرت انگیز خوفناک۔ دردناک واقعات سے اخبار بھرے ہوتے ہیں۔
گلی کوچوں میں ان کے چرچے ہوتے ہیں جلے کئے جاتے ہیں۔ روز و لیوختن پاس ہوتے
ہیں۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتے ہیں تاریخوں میں
درج ہو کر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں اور ان سے سبق حاصل کئے جاتے
ہیں۔ آخر یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ فطرت خود زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنے
میں اعانت کرتی ہے۔ مزاحم نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے عیش و نشاط سرخوشی و
سرمستی کے واقعات اتنی طاقت ہی نہیں رکھتے کہ دنیا کو زیادہ دیر تک متوجہ
رکھ سکیں۔ المختصر شاعری میں مضامین حسن و عشق کی چاشنی اگر چاشنی کی حد
تک ہے تو کوئی بُری بات نہیں اور اگر کوئی احمق اسی ایک نوالہ کو اگلتا نکلتا
رہے گا تو یقیناً گھٹن آئے گی۔

کسی کے غم میں کوئی رورہا ہو
ذرا غور تو فرمائیے یہ کوئی شعر ہے کہ باز بچہ اطفال؟ اسی کا نام ہے شاعری تو
پھر اس سے بڑھ کر کوئی آسان کام نہیں قلم برداشتہ لکھتے چلے جاؤ
کسی کے غم میں کوئی رورہا ہو
کسی کے گھر میں بیٹا ہو رہا ہو
کوئی ٹانگیں پیارے سو رہا ہو
کوئی قسمت پر اپنی رورہا ہو
کوئی تنہا محبت بورہا ہو
کوئی اپنے کئے پر رورہا ہو
کوئی ٹانگیں سکڑے سو رہا ہو
کوئی بیٹی سے چٹپٹا رورہا ہو
اُس شخص کا دیوان اٹھا کر دیکھئے ایک ایک غزل میں پانچ پانچ اور بعض میں
دس دس مطلعے کہتا چلا جاتا ہے۔ قلم رکتا ہی نہیں۔ کیا کہنا ہے ایسی قلم برداشتہ

ایسی سستی شاعری کا۔ اب تو سمجھ میں آگیا ہو گا کہ شاعری کی اہمیت اور قدیمیت اس کے برتن پر موقوف ہے۔ آسان سمجھ لو تو آسان ہے مشکل سمجھ تو مشکل۔ لکھنو کے کپڑے اور تانگے والے بھی کسی سے پیٹے نہیں۔ نابغہ جیسے شخص کو آسانی کہنا کچھ بددیانتی کی راہ سے نہیں ہے۔ آسانی کہنا ہی پر گو کتنا ہی موزوں طبع ہو اک ذرا سے میں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ دیکھ لیجئے۔

چھپ کے رہ نہیں سکتی عاشقی وہ سستی ہو (نابغہ) دل سے بادل اٹھتے ہیں لکھ سے مورتی ہو یہ بھی غالباً بیگانہ کی اک مشہور غزل کے جواب میں کہا گیا ہے مگر ایک مصرع کی بڑھ گئی ہے دم۔ نواب صاحب بہادر مدظلہم۔ جی ہاں۔ جب تک لفظ آنکھ سے (نکھ) کو خارج کر کے یوں نہ پڑھتے (دل سے بادل اٹھتے ہیں) آسے مورتی ہو (مصرع موزوں ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھ لیا آپ نے انارٹی پھر انارٹی ہے خواہ وہ کتنی ہی شہرت پا جائے۔

(مہر شش نیز بگو)

نابغہ مذکور کا سرمایہ لے دے کے اس کی "عاشقانہ شاعری" ہے۔ عورت مرد کے جنسی تعلقات کے تحت اس کی شاعری اگرچہ بہت سستی چیز ہے مگر سچی ہے۔ اس میں کوئی فریب نہیں کوئی گندم نمائی نہیں۔ مگر اس کی زیادہ سے زیادہ قدر و قیمت تفریحی ہے تعمیری نہیں۔ شاہیر حال میں اک اور نابغہ ہیں بہت اچھے خاصے مشاق ناظم، نظم بازوں میں سب سے مگرے۔ مگر ان کی طلسم بندی الفاظ میں گندم نمائی کو بہت زیادہ دخل ہے۔ جو شیلے شوکت زدہ (مگر بے ربط و ہل) الفاظ کی نمایش سے فریب دینا خوب جانتے ہیں مگر نہیں وہ خود دھوکے میں ہیں۔

اس دھوکے میں مبتلا رہ کر وہ ناقص کے ناقص رہ گئے۔

آدم برسرِ مطلب۔ مائی ڈیر فراق۔ آپ بیگانہ کی غزل میں معاملات حسن و عشق بمعصومی۔ گم شدگی۔ سپردگی وغیرہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ چند غیر ضروری شرطیں اپنی طرف سے بڑھا کر آپ بیگانہ آرٹ کو شاعرانہ عظمت سے گویا خالی باد کرنا چاہتے ہیں۔ آپ دھوکے میں ہیں۔ یاد رکھئے ہر صنف میں گو آرٹ خود اپنے معیار پر پرکھا جاتا ہے۔ پر اسے معیار پر جانچا نہیں جاتا کسی آرٹ کے کمال کو پرکھنے کا معیار یہ نہیں ہے کہ اس کا آرٹ فلاں فلاں موضوع یا فلاں فلاں کیفیتوں سے خالی ہے۔ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے ہاں کچھ موجود ہے وہ کیا ہے اور کیسا ہے؟ کس حد کمال پر فائز ہے۔ ہر صنف میں خواہ وہ کسی فن کا ہو۔ بجائے خود عظمت ہے۔ خواہ وہ مفتی ہو۔ مقصور ہو۔ شاعر ہو۔ *Genius* اور عظمت لازم و ملزوم ہیں۔ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ آیات و جہانی میرے سامنے ہے۔ پڑھنا ہوں اور دیکھنا ہوں۔ اور جو کوئی پڑھے گا دیکھ کرے گا بشرطیکہ مطالعہ صحیح کی قوت رکھتا ہو اور دل میں غبار نہ رکھتا ہو۔

سنانہ رقص کیے گردابِ حال میں بڑا ہے پارِ دُوب کر اپنے خیال میں اللہ اللہ۔ یکسوئی خیال بھی کتنی بڑی طاقت ہے۔ ماحول کتنا ہی ناموافق ہو اپنی دھن کے پکے اپنے ہی خیال میں ڈوبے ہوئے سنانہ دارِ رقص کرتے چلے جاتے ہیں۔ آخر کار وہی یکسوئی خیال وہی سچی لگن ان کا بڑا پار لگادیتی ہے جیسا دھیان باندھتے ہیں رفتہ رفتہ ویسے ہی ہو جاتے ہیں زمانہ کتنی ہی مخالفت کرے۔ کتنا سچا فلسفہ کتنا سچا درس عمل ہے۔ ذرا غور تو فرمائیے آپ کے دورِ حاضر کے لئے اور

اس کے بعد آنے والی صدیوں کے لئے اس میں کوئی درس عمل ہے یا محض ایام جہالت کی خرافات ہے؟ شعر و حکمت کی قدر کرنے والا بلکہ یوں کہئے کہ زندگی کی قدر کرنے والا اس شعر سے درس حاصل کرے گا۔ مگر اک حاسدیہ کہہ کر مال دے گا کہ اس میں گرداب، بڑا، ڈوب کر۔ پار چند لفظی رعایتوں کے سوا کیا رکھا ہے۔ خیر ارباب فکر و نظر جان سکتے ہیں کہ ماحول (Environment) کو "گرداب حال" سے تعبیر کرنا کتنی اچھوتی تخیل کتنی اعلیٰ قوت اخلاقی کا ثبوت ہے۔ جس کی مثال غالب کے ہاں بھی نہیں ملتی۔ ناموافق ماحول کی جیسی تصویر "گرداب حال" کے لفظ سے کھینچی گئی ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں خود قوت اخلاقی سے بہرہ ہو۔ یہاں لفظ "ڈوب کر" جس محل پر آیا ہے اور جسے بیڑے اور خیال دونوں کے ساتھ معنوی ربط ہے (جیسے شرطیہ کا ٹہرہ کہ ہے تو اپنی جگہ پر مگر رخ چاروں طرف ہے) یہ بھی آرٹ کی نزاکتوں کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ آپ الفاظ کے معنی تو سمجھ لیں گے مگر نشست الفاظ اور ان کے اثر اور اثر کے تفاوت کو سمجھنا آپ لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ آرٹسٹ ہی جانتا ہے اور بت کر دکھا دیتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ شعر کو سمجھ لینا اور بات ہے اور شعر گوئی کے ہنر اور اس کے گر کو جاننا اور بات ہے۔ یگانہ آرٹ چونکہ بظاہر نہایت سہل اور برجستہ ہے اس وجہ سے مولانا۔ وغیرہ کی طرح آپ بھی اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیں تو کچھ بعید نہیں۔ دیکھئے اس شعر میں کتنا بڑا درس عمل ہے مگر یہ کوئی خشک درس نہیں ہے کیفیت شعری میں اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ درس معلوم ہی نہیں ہوتا۔

دیکھئے جو حسن دوست کو شگلاں میں آجائے آفتاب قیامت وال میں! قیامت برپا کر دینے والا شاہنشاہ ہے۔ آرٹ کی یہی سادگی و پرکاری دیکھ کر اہل نظر حیران رہ جاتے ہیں اور حریفوں کا جی چھوٹ جاتا ہے۔ مارا فریب حسن کا پیپے تو جانئے سکتے خدا رسیدہ کے اس مال میں "پیپے تو جانئے" دیکھا آپ نے یہ ہے یگانہ آرٹ کا کس بل۔ بڑے بڑے خدا رسیدوں کا فریب حسن میں آکر تباہ ہو جانا بجا ہے خود اک غیرتناک حقیقت ہے۔ مگر شاعر کے طنز پر آرٹ نے (پیپے تو جانئے) اس حقیقت کو چار چاند لگا دیئے چونکہ زور پہنچا دیا۔ یاد رکھئے حقیقت بجا ہے خود اک طاقت ہے تو سہی مگر شاعر کا انداز تصرف اسی حقیقت کو قوی سے قوی تر بنا دیتا ہے۔ یہاں روزمرہ کے اک معمولی سے لفظ میں الہامی شان پیدا ہو گئی ہے۔ کیا زندگی کے بعد بھی ہے کوئی زندگی؟ پھر جان آچلی چین پامال میں! حیات بعد المات کے فلسفہ پر کوئی ہزار لکیر دے لکیر لکچر ہی رہے گا۔ خواہ وہ لکچر کسی پروفیسر کی شرکی صورت میں ہو خواہ نظم کی صورت میں۔ یہاں شاعر نے حیات بعد المات کے عینی مشاہدے سے متاثر ہو کر شاعرانہ جذبہ کے تحت فلسفہ کو آرٹ کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ عالم حیرت میں سوال کرتا ہے کہ کیا واقعی زندگی کے بعد پھر کوئی زندگی ہے؟ چین پامال کو نئے سرے سے ہابھرا دیکھ کر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ پھر جان آچلی اس حیرت انگیز سادگی کی لذت کا کیا کہنا۔ سچ فرمائیے گا یہ شاعری آپ کے دور حاضر کے لئے مایہ ناز ہے یا باعث تنگ؟ اس سادگی میں کوئی غفلت پائی جاتی ہے یا جہالت؟

واللہ نفس میں آئی ہے کیا بہت کٹ گئی آخر ہمیں تو ہیں کہ پھرتے تھے حال میں
 کیا جواب ہو سکتا ہے یگانہ کی اس مخمور نگاری اور شائستہ کا سلسلہ خیال
 کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے؟ اس عالم مستی کا خدا اگر کوئی ہے تو ماحول
 ہے۔ ماحول جسے جیسا چاہے بنا دے۔ نوگزدارانِ بلا پہلے تو دامِ بلا میں پھنکر
 بہت پھر پھرتے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ مگر آخر اسی قید و بند سے ایسے
 مانوس ہو جاتے ہیں کہ آزادی کا خیال تک نہیں آتا۔ ماحول نے ہمیں ایسا
 بدل دیا کہ معلوم ہی نہیں ہم کون تھے کیا تھے۔ دیکھئے یہ حال کا قافیہ آپ
 کے چھٹ بھیلوں کے نزدیک تھا تو چڑی مار کا مال مگر یگانہ کے انداز تصرف
 نے اسی میں فلسفیانہ حقایق پیدا کر کے دکھا دیئے۔ یہ قوتِ تخلیق *ventilation* کا
 آواز بازگشت پہ کیا دیتے ہو صدا؟ کس آئینہ ہے جو جواب سوال میں؟
 اپنے نفس سے خطاب ہے کہ تم کس سے سوال و جواب کر رہے ہو۔ یہاں
 تمہارے سوا اور کون ہے؟ اپنی ہی صدا بازگشت کو صدا کے غیر سمجھ کر
 الجھ رہے ہو۔ کس دھوکے میں ہو؟ فطرت کی برگزیدہ ہستیاں ہیں تو اسی ہنگامہ زار
 ہستی میں گروہ اپنے معیار بلند کے سبب یکہ و تنہا ہیں۔ ان کی آواز صدا الصبحا
 کی مصداق ہے۔ خود ہی کہتے ہیں خود ہی سنتے ہیں۔ بھلا ایسوں کے در و دل
 کو کون سمجھے؟

جز ترنم ہائے درد افزا اندام چارہ بیل تنہا نشیں رانست در مانے دگر
 کیا پرواہ ہے۔ آپ اس انداز سخنوری کو عظمت سے خالی ٹھہرائیں مگر میں تو اپنے
 اوپر بھروسہ رکھتا ہوں۔

لذت ہی اور ہوتی ہو چوری کے مال میں
 یگانہ نے شعر کہا تو ہے تفرقِ طبع کے طور پر مگر اس پر بھی فلسفہ وارث
 کا عاقبہ سے اتنا مکمل اتنا شیریں کہ ماہرینِ نفسیات سن پائیں تو منہ میں پائی
 لائیں۔

یہ ہونی لگتا ہوں یہ بچہ کیجئے کب تک یہ امتیازِ حرام و حلال میں
 لائے اس شاہکار کا جواب اگر ممکن ہو۔ مگر شرط یہی ہے کہ فقط معنوی
 بہت نہ ہو۔ بہ اعتبار آرٹ بھی اتنا ہی مکمل ہو۔ یہ ہے حیاتِ انسانی
 کی تنقید و تفسیر۔

اب کیاں نہ پار اتر جلوں خیالِ جھیلگر ڈوبے مری بلا عرقِ انفعال میں
 یہ ہے یگانہ کا اچھوتا شخصی انداز فکر گناہ ہو تو ہوا۔ اس پر شرم و ندامت
 تو بلا کیسی؟ یہ حرکتیں روح کو ذلیل کرنے والی ہیں۔ گناہ ہو گیا تو اسکا صحیح
 مار کا رپی ہے کہ خمیازہ جھیل کر پار اتر جاؤ۔ عرقِ انفعال میں ڈوب کر امید کر
 لے خود اپنی ذات کو تباہ لگانا ہے۔

دیکھئے، جاپے یہ مضامین عالیہ۔ یہ کیفیات نفسی، اس صفائی اس
 کی سے کس زبان میں ادا ہو رہے ہیں۔ غالب کی دیو زادی اردو ہے یا آدمیوں
 کی ہل حال؟ زمانہ بہت کرو میں بدل چکا ہے جب کہیں شاعری اس طنز پر آرٹ
 کے مرتبہ کو پہنچتی ہے۔ مگر آپ اسے (*مستند و مستحق*) کہہ کر مال دنیا
 ہاتھ میں۔ واہ رسی بوالعجبی! یہی تو یگانہ کا وہ جو خدا داد ہے جسے کوئی بزرگ
 اور عامل نہیں کر سکتا۔ شاعرانہ عظمت جسے کہتے ہیں وہ تو اس بیسویں صدی کی

مست آتا بھلے کو پیغمبر نہ بن گیا! سوچی تو خوب نشہ بے اعتدال میں
نشہ بے اعتدال میں کیا خوب سوچی ہے؟ یہی وہ الہامی انداز فکر ہے جو
بڑے سے بڑے شاہیر کے حوصلے سے بھی بالا ہے۔ کیا جواب ہو سکتا ہے اس
نشہ بے اعتدال کا؟ اور مصرع پر جو مصرع لگایا ہے (بھلے کو پیغمبر نہ بن گیا)
کتنا حیرت آفریں ہے؟ مست آنا (منصور) نے انا الحق کہہ کر فی الحقیقت
وحدت الوجود کا اقرار کیا۔ اور یہ عین عرفان ہے۔ اگر پیغمبری کا دعویٰ کر بیٹھتا
تو غلط ہوتا۔ نشہ بے اعتدال کے عالم میں اس دیا نے کو کیا دور کی سوچی
ہے؟ کس میں اننادم ہے کہ اتنے پڑنے اور پامال مضمون میں اتنی نازکی
پیدا کر سکے؟

ہوش و خرد حقیقت روشن کہیں ہے ہواک جھلک سی پردہ صدا احتمال میں
والسہ نگاہ شوق کی معراج ہے یہی وہ خواب دیکھے جو نہ آئے خیال میں
نگاہ شوق کی قوت تخلیق اور اس کی معراج کو روزمرہ کے پیش پا افتادہ
الفاظ (خواب و خیال) میں اس سادگی سے بیان کر جانا اک حیران کرنے
والا شاہکار ہے۔ لازوال۔

ممکن کی آرزو میں موعے کتنے نامراد اچھی گزر گئی مری فکرمحال میں!
ناممکن ہے کہ شاعر ایسے شاہکار کی عظمت خود بیان کر سکے بجز اس کے کہ
خود اپنی عظمت کے سامنے سجدہ تعظیمی بجالائے کہ یہ بھی عین عرفان ہے۔
حکم سقراط تو استہزا کے پیرایہ میں کہہ گیا کہ شاعر خود اپنے کلام کا مطلب

ایسی وضاحت سے بیان نہیں کر سکتا جیسی خوبی سے اور لوگ اس کا مفہوم
بیان کرتے ہیں۔ مگر بعد کے حکماء نے فیصلہ کیا کہ سقراط نے اپنی دانست میں
تو شعر ارکو الحق ٹھہرانا چاہا مگر فی الحقیقت اس نے شاعر کی ذات میں اک بڑی
خطمت کا پتا لگایا، نہیں بلکہ بتا دے گیا اک *Discovery* کر گیا۔
پھر ارادی طور پر یہ بتا گیا کہ شاعر فی الحقیقت قوت تخلیقی کا مالک ہوتا ہے۔
وہ اپنی فکر سے جو کچھ پیدا کرتا ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہ خود
نہیں کر سکتا۔ بلکہ جو لوگ اس کے نتائج فکر کو اپنے تجربات، اپنی زندگی
کے آئینے میں دیکھ کر مستفیض ہوتے ہیں وہی اس کا صحیح اندازہ کرتے
ہیں۔ اس کی صحیح اور سچی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ مرد خواہ کتنا ہی
طاقتور اور حسین ہو بجائے خود اپنے حسن اور طاقت کا صحیح اندازہ نہیں
کر سکتا عورت ہی کو صحیح تجربہ ہو سکتا ہے کہ مرد کے حسن اور طاقت نے
اس پر کیا اثر ڈالا؟

کیا بزم اتحاد ہے کیا حسن اتفاق؟ بیگانہ و بیگانہ ہیں سب ایک حال میں
بندہ نواز آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ یہ سب اشعار ایک ہی غزل کے بلا انتخاب
پیش کر دئے گئے ہیں۔ ایک ہی غزل میں آرٹ کے اتنے اچھوتے اتنے مکمل
نمونے کیا اور کہیں مل سکتے ہیں؟ کہیں نہ ملیں گے *Here is a mind*
of the most subtle tumultuous elements; but it is governed
by peaceful diligence & its impetuous faculties work gently

نظر آئے گا کیا ظلمت کدے میں چشم حیراں کو
اندھیرے کا آجالا جائے خواب پریشاں کو

یہ سنسار یہ عالم کائنات اپنی تمام حیات افروزیوں کے ساتھ اور انسان کے تمام ذہنی و روحانی ارتقا کے بعد بھی اک پراسرار و حیرت افزا ظلمت کدہ بنا ہوا ہے اور بنا رہے گا۔ انتہائی منزل ارتقا تک پہنچنے کے بعد بھی کوئی انسان یہ دعویٰ نہ کر سکے گا کہ اس جاگتی جوت میں جو کچھ نظر آ رہا ہے جیسا کچھ محسوس ہو رہا ہے وہی عین حقیقت ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے آنکھ والے بھی اندھیرے ہی میں رہیں گے کیونکہ۔

ہوش و خرد حقیقت روشن کہیں جسے ہواک جھلک سی پردہ صداقت میں یہ ہے حقیقت کبریٰ۔ یہ ہے وجود کی تحلیل و تفسیر کہ ہوش کو اس جن مریضات و محسوسات کو حقیقت روشن سمجھتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ اک جھلک ہو تو ہو اور جھلک بھی کیسی؟ جس پر پردہ صداقت پڑا ہوا ہے۔ دو اور دو چار پر ایمان رکھنے والے ایسے الہامی آرٹ کو بھی جھوٹ یا شاعرانہ مبالغہ سے موسوم کر دیں تو کچھ بعید نہیں۔ مگر فلسفہ و سائنس اس آرٹ کی صداقت پر حلف اٹھانے کو تیار ہوں گے کہ ایک ایک نقطہ صداقت سے معور ہے کیونکہ ایک جھنگل ایک پتھر کی حقیقت سے بھی سائنس کما حقہ آگاہ نہ ہو سکا۔

اب اول الذکر شعر پر دوبارہ نظر ڈالئے۔ نفس مطلب تو بس اتنا ہے کہ عالم میں کسی شے کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر اس بات کو انھیں الفاظ میں بیان کیجئے تو کوئی کیفیت شعری پیدا نہ ہوگی۔ نرا خشک فلسفہ ہو کر رہ جائے گا۔ مگر

اسی کو یوں بیان کیجئے (نظر آئے گا کیا ظلمت کدہ میں چشم حیراں کو) تو عالم اک پراسرار تاریکی بن کر سامنے آجاتا ہے اور اس تاریکی کا اثر نگاہ کی حیرانی و پریشانی کی صورت میں ظاہر ہو کر معنویت و کیفیت شعری میں اضافہ کر دیتا ہے۔ شاعری فقط سپاٹ حقیقت نگاری کا نام نہیں ہے بلکہ حقیقت کو شاعرانہ لذت کے ساتھ بیان کرنے کا نام ہے۔

نظر آئے گا کیا؟ اس سے شوق تحقیق کی ناکامی کا مفہوم پیدا ہے۔ دیکھئے اس تنقید انکاری سے (نظر آئے گا کیا؟) جو علم بلاغت کا اک گرہ ہے کلام میں کتنا دور پیدا ہو گیا۔ وہ کیوں؟ وہ اس لئے کہ اس میں شاعر کا جذبہ بھی شریک ہو گیا رعیسینی جذبہ شوق کی ناکامی (محض فلسفیانہ بیان نہیں رہا۔ حقیقت تو جو ہے وہی رہتی ہے۔ مگر حقیقت کی قدر و قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے شاعر کے انداز تصرف و انداز بیان سے۔ اسی کا نام ہے شاعری۔ محض حقیقت نگاری کوئی شاعری نہیں۔

یہاں پہلا مصرع ظلمت کدہ عالم میں چشم تحقیق کی ناکامی کی تصویر پیش کرتا ہے رنقل مطابق اصل کی صورت میں نہیں بلکہ شاعرانہ جذبہ کی رنگ آمیزی کے ساتھ) دوسرے مصرع میں (اندھیرے کا آجالا جائے خواب پریشاں کو) شاعر نے اسی تاریکی اسی ناکامی کے عالم میں اک صورت تسکین بھی پیدا کر دی ہے (یہ ہے علاج ناکامی اور اسی میں لذت شعری پنہاں ہے) یعنی اس عالم تاریکی میں جو کچھ

نظر آ رہا ہے (حقیقت نہ ہی خواب پریشاں ہی) اسی کو اندھیرے کا اُجالا سمجھ کر اسی پر راضی رہ کر اسی کو غنیمت جان کر دل کو بہلاتے رہنا چاہیے۔ باطل کو باطل سمجھ کر اس کی طرف سے منجھوٹا لینا نہیں چاہیے بلکہ اسی بھی حقیقت کا اک پردہ رنگین سمجھ کر دل بہلاتے رہنا عین حکمت ہے۔ یہ ہے *Pessimism* میں *Optimism* یہ ہے تلخیوں میں لذت کا پہلو نکال لینا۔ یہ ہے کائنات حیات کی تنقید و تفسیر جس سے آپ بیگانہ کی شاعری کو خالی باور کرنا چاہتے ہیں۔ اک دیانت دار نقاد سمجھ سکتا ہے کہ یہ دور حاضری کی چیز ہے یا ایامِ جہالت کی؟ اس شاعر کی عظمت کا پتا چلتا ہے کہ جہالت کا وہ آپ ہی دیکھے آپ کی وہ *Healing power* قوت تسکین اس شعر میں موجود ہے یا معدوم؟ ہے اور بدرجہ اتم ہے۔

اندھیرے کا اُجالا جائیے۔ کیا شاعر نے اس ٹھیکہ مگر الہامی زبان سے کام لیا؟ *Pessimism* میں *Optimism* پیدا کر کے *Healing power* کا ثبوت نہیں دیا۔ صورت تسکین پیدا نہیں کی؟ شعر جس زبان میں کہا گیا ہے اس کے الفاظ تو وہی ہیں جو اسی دنیا میں بولے جاتے ہیں مگر ظلمت کدہ عالم کو اندھیرے کا اُجالا کہنا خصوصاً اس موقع پر آسانی اور الہامی زبان ہے حیرت انگیز و سکون افزا محل وقوع ہی کے لحاظ سے الفاظ کی بلکہ ہر شے کی قدر قیمت بدلتی رہتی ہے۔ سلف سے آج تک اس حقیقت کو کسی نے ایسی ٹھیکہ الہامی زبان میں بیان نہیں کیا۔ ہاں یہ بھی یاد رکھئے آپ ہر کلام کو محض موضوع کی بلندی اور فلسفیانہ گہرائی کے لحاظ سے پرکھیں گے اور قوت بیانیہ کی معجزاتیوں کو

اس خدا داد و ناقابلِ اکتساب جو ہر کو محض زورِ طبع کہہ کر ٹال دیں گے تو یقین جانئے آپ شعر و شعریت کا صحیح ذوق نہیں رکھتے۔ فلسفیانہ حقائق کو حیرت انگیز الہامی زبان میں بیان کرنے ہی کا نام ہے شاعری۔ ورنہ حقائق کا انبار تو کتب خانوں میں اور مفکرین کی کھوپڑیوں میں بھرا پڑا ہے۔ مگر یہ گوئیے کہ کس کس کام کا؟ مایا کے فلسفہ پر مسیوں اشعار پڑھ جائیے گرنہ ممکن ہے کوئی شعر (بحیثیت شعر نہ کہ بحیثیت کلام موزوں) بیگانہ کے اس شعر زیر بحث کے مقابل لایا جاسکے۔ کہنے کو تو چچا جان نے بھی کہا ہے۔

مستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقہ دام خیال ہے
مگر کس بے ڈھنگے پن سے کہا ہے۔ مستی کے مت فریب میں؟ لاجول یہ کون سی اردو ہے؟ مت اور آجائیو کے بیچ میں "فریب" کس بُری طرح گھس پڑا ہے۔ یہ شعر کاٹ کے پھینک دینے کے قابل ہے۔ اگر کوئی شخص غالب کے اس بے ڈھنگے کلام موزوں کو بیگانہ کے مذکورہ بالا شعر کے مقابل لائے تو سمجھ لیجئے *Common dense* سے بے بہرہ ہے۔ غور تو فرمائیے اس فلسفہ قنوطی میں بیگانہ کے جو ہر خدا داد نے رجائی پہلو نکال کر جو اندھیرے میں اُجالا پیدا کر دیا کیا یہ شاعر کی قوتِ ادبی اور شاعرانہ عظمت کی دلیل نہیں ہے؟ کیا کوئی دیانت دار بھلا آدمی اسے بڑ بولا پن کہہ کر ٹال سکتا ہے؟

دل بیدار گھبراے نہ کیوں اس اندھی گہری میں؟
نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں اک ڈیوارِ بے بہشتاں کو

کسی دانشمند کا یہ مقولہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سخن دلپذیر اور دل بخشنہ بشرط است
 نفسیات کے جس مقام پر پہنچ کر لنگانہ کے قلم سے یہ شعر نکلا ہے اگر آپ بھی اس مقام
 پر پہنچ کر دیکھ سکتے کہ شاعر نے کس سادگی کس پُرکاری کس تازگی کس شرم انداز
 کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا ہے تو آپ کو بھی ایک شاعرانہ وجد آجاتا جس معنی و
 بیان کے ان نازک مقامات سے جب تک آپ آشنا نہ ہوں گے آپ کا دل ہرگز
 سخن پذیر نہیں ہو سکتا۔ ایسی بیگانگی و بے نسبتی کی حالت میں شعر بھی دلپذیر ثابت
 نہ ہو سکے گا خواہ کتنا ہی دلپذیر ہو۔ اعلیٰ مذاق اعلیٰ کرکیر رکھنے والی ہستیاں اپنے
 زمانے اپنے ماحول سے بیزاریا آمادہ پیکار کیوں ہو جاتی ہیں؟ آپ جھٹ بول
 اٹھیں گے کہ ایسے لوگ اپنے ماحول کو مطابق بنالینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے
 مگر یہ محض جلد بازی ہوگی۔ ایسے افراد اپنے ماحول کو مطابق بھی بنا لے سکتے ہیں۔
 بشرطیکہ وہ اپنے اعلیٰ مذاق اعلیٰ کرکیر کو اپنے ماحول پر قربان کر دینا گوارا کر لیں۔
 ماحول سے آمادہ پیکار ہو جانے کا سبب یہی نہیں ہوتا کہ ماحول کی مطابقت
 نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ سبب ہوتا ہے کہ وہ ایسے تاریک و پست ماحول کو روشن اور
 بلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ کس قدر دھوکا دیتے ہیں وہ لوگ جو ماحول سے برسرِ پیکار
 رہنے والی برگزیدہ ہستیاں کو خطا وار ٹھہراتے اور ناقص سے ناقص ماحول کی بھی
 مطابقت کو ضروری ٹھہراتے ہیں۔ اگر دنیا کے الو الغرم افراد تاریک و پست ماحول
 کی اصلاح کی خاطر جنگ نہ کرتے تو آج تمدن اس مرتبہ پر پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔
 وہیں رہتا جہاں آج سے دس سو برس پہلے تھا۔ ماحول سے جنگ کرنا ایک تعمیری کام
 ہے جسے عقل کے اندھے تخریب کہتے ہیں۔ اس کشمکش پیکار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

یا تو ایسی ہستیاں غالب آکر ماحول ہی کو بدل دیتی ہیں یا ماحول کی طاقت سے
 مغلوب ہو کر بیزار و کنارہ کش ہو جاتی ہیں۔ اور اک ایسے روشن ماحول ایسی
 نورانی فضا کی متعینی ہوتی ہیں جسے یگانہ نے اپنی الہامی زبان میں ”دیارِ بہشتان“
 سے تعبیر کیا ہے۔ نفسیات کی تشریح و تفسیر میں دو مصرعوں کے اندر اک دنیا
 مطلق تعمیر کر دینا دورِ حاضر کے چھٹ بھٹیوں کا تو کیا ذکر غالب کے بھی بس کی بات
 نہیں۔ مگر اس نئی روشنی کی تاریکیوں کا یہ فیض ہے کہ آپ اسی فرد واحد کی
 شاعرانہ عظمت سے انکار کرتے ہیں۔

(۱) جس کے سوا دورِ حاضر میں کوئی زبردست حقیقی شاعر کوئی رہتا ہو
 موجود نہیں۔

(۲) جس آرٹ کے کمال کا تصور بھی غالب کے لئے ممکن نہ تھا وہی آرٹ آپ کے
 چھٹ بھٹیوں کی اوجھی پونجی کے سامنے بھی ناقابلِ ذکر سمجھا جاتا ہے۔ شرم شرم۔
 (۳) جو آیات و حدیث جیسے جدید ترین فلسفیانہ و طنزیہ معیار لغزل کا بانی
 ہے جو ترانہ جیسے حیات افزا انسانیت آموز مکمل اور ناقابلِ تقلید آرٹ کا

“Maupassant sees that the world, as it is, the
 material world is not only not the best of worlds,
 but might on the contrary be quite different - & that
 it does not satisfy the demands of reason & life.
 He sees that there is some other world, or at least
 the demand for another world in the soul of man!”

الک ہے، جو چراغ سخن جیسے سالہ عروض و قوافی کا مولف ہے جس سے آپ کے چھٹے بچے سبق حاصل کر سکتے ہیں، جو بیسویں صدی کے حیرت انگیز ادبی و تنقیدی کارنامہ یعنی غالب تنکین کا مصنف اور اپنے زمانہ کا ادبی نجاد ہے، غلیچوں کا بنانا یا گھر و نڈا بگاڑ دینے والا۔ ہنسی ہوئی ذہنیوں کو سیدھا کر دینے والا۔ زندہ باد۔ زندہ باد تو کیا سچ یگانہ کی شاعری اتنی لغو ہے شاعرانہ عظمت سے اتنی بعید ہے کہ بالکل بیچ و نفا قابل ذکر سمجھی جائے ادبی تاریخوں یا ادبی رسالوں میں ایسے لوگوں کا بار بار ذکر کرنا اور میرزا یگانہ غالب جنگ کو یک فلم ترک کر دینا سچ کہیے ملک کی کھسیانی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ سنجیدہ دیانت داری کا ہر خیر اس سے اتنا تو ثابت ہو گیا کہ ملک نے میرزا یگانہ کو ادبی حلقہ سے خارج کر دیا۔ مگر میرزا صاحب پر اس بائیکاٹ کا الٹا اثر ہوا۔ اس بائیکاٹ بازی سے شاعرانہ عظمت میں تنک آنے کے بجائے یگانہ کا یقین اور بڑھ گیا اور ملک کے سنجیدہ و فہمیدہ طبقے پر بھی اس بائیکاٹ کے حربے کی حقیقت کھل گئی۔

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

یہ ہے ہندوستان کی اندھی نگر کی بالغ نظری کہ آیات وجدانی و ترانہ جیسے ناقابل تقلید آرٹ کے موجود ہوتے یاروں کو شرم نہیں آتی۔ اسی ایک ٹھیکرے (دیوان غالب) کو چاٹ رہے ہیں۔ شاباش۔

(رباعی)

شریں لکھنے دو، بول ہی دن کا دو
آیات و ترانہ کا مزہ کیا جانیں؟
اتنا رنگا رنگے دو گڑھے پاٹنے دو
غالب کے سگوں کو ٹھیکرے چاٹنے دو

یکس نے گرم رفتار فنا کی راہ کھوٹی کی؟

بٹھا کر پردہ فانوس میں شمع شبستان کو

حسن و عشق کی دنیا میں اس شعر کی روشنی کچھ اور ہی رنگ دکھاتی ہے۔ فلسفہ الہیات میں کچھ اور ہی حقائق پر روشنی ڈالتا ہے۔ شاعرانی وجدانی قوت سے کیا کیا حقائق بیان کر جاتا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا شعر کن کن علوم و فنون کا حامل ہے۔ بظاہر گرم رفتار فنا کتنا یہ ہے پروانے سے جو شمع سے واصل ہو جانے کے لئے اندھا دھند چلا آ رہا ہے اور پردہ فانوس نے اس کی راہ کھوٹی کر رکھی ہے۔ فانوس سے سڑک پر مارا ہے منزل مقصود تک پہنچ نہیں سکتا۔ مگر اس مجاز کی حقیقت کچھ اور ہے۔ اس پردہ میں فلسفہ وجود پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ہر ہستی آمادہ فنا ہے۔ ہر دی روح اپنے مبداء حقیقی سے واصل ہو جانے کے لئے بیتاب ہے۔ مگر درمیانی حجابات نے راہ روک رکھی ہے شمع حقیقت حجاب اندر حجاب اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ یہ ہے رفتار زندگی۔ یہ ہیں منازل ارتقا۔ سبحان اللہ۔

مگر یہ فلسفہ وجود محض اک خشک فلسفہ کی صورت سے بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ اک بدھی مثال دے کر شمع کو پردہ فانوس میں بٹھا کر گرم رفتار فنا کی راہ کھوٹی کر کے طالب وصل کے جذبہ شوق و اضطراب کی تصویر کھینچ دی ہے شعر سن کر محض اک فلسفیانہ حقیقت ہی مانتے نہیں آتی بلکہ جذبات عالیہ میں اک لہر دوڑ جاتی ہے (چاہے اسے رنگ مجاز میں دیکھیں چاہے رنگ حقیقت میں) شعر کا مقصود بالذات یہی ہوتا ہے کہ زندگی کی لہر دوڑا دے۔ فرمائیے یہ آرٹ

اس نوک نلک کے ساتھ اور کسی کے بس کا تھا؟ یہ محض بڑبولا پن ہے کہ فلسفہ
حیات کی تنقید و تفسیر؟

اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن رنگ لائے گی
قفس سے چھوٹ کر سر پر اٹھالیں گے گلستاں کو

اسیرانِ قفس کے پردے میں جباروں کے جبر و تشدد کا ردِ عمل دکھایا ہے۔
زمانے نے ایسی کروٹ لی کہ ٹرکا ہو گیا۔ ہٹکا بٹکا ہو کر رہ گئے کہ یہ کون سا طوفان
آیا۔ روس کی جابرانہ شہنشاہیت نے جیسی قلابازی کھائی وہ گویا کل کی سی بات
ہے۔ اسیروں کی خاموشی آخر کیا رنگ لائی۔

طلسمِ رنگت بولکیسا۔ فریب آرزو کیا؟
اٹھا کر رکھ دیا جب طاقِ نسیاں پگھلتاں کو

شعر کا حسن صورت دیکھئے تو سانچے میں ڈھلا ہوا۔ معنوی اعتبار سے وہ
کیفیت بے نیازی پیدا ہے کہ نگاہ میں کچھ سہما تا ہی نہیں۔ سب بیچ۔ زندگی میں
اک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ سارا طلسمِ فریب ٹوٹ جاتا ہے کوئی منتظر نہیں
پھنسکتی۔ ہم بے نیازی ہم بے دلی۔ کلام کے ترنم پر نظر کیجئے کتنا سامعہ نوا کرتا ہے۔

ترا دیوانہ کیوں آزادی موہوم کی دھن میں
سہرا پنا آپ پھوٹے تو گر کر زنجیر احساں کو

آہ۔ آزادی کس قدر موہوم و بے معنی لفظ ہے۔ قدرت نے ہر نفس کو اپنے
قانون میں جکڑ رکھا ہے اور یہ پابندی عین احسان ہے جسے شاعر نے زنجیر احساں
سے تعبیر کر کے حکمت بالغہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس زنجیر احساں اس قانون
کو توڑ کر کوئی آزاد و مطلق العنان ہو جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ بس اختلالِ حال۔
ایسی مطلق العنانی کا انجام دیوانہ وار سر پھوٹنے پچھانے کے سوا اور کیا ہوگا؟
یہ ہے حیات انسانی کی تفسیر یہ ہے حکیمانہ سخنوری جو حکمت کے ساتھ آرٹ کے
سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اسی کو فلسفیانہ و غیر شاعرانہ زبان میں ہر کوئی بیان کر سکتا
ہے مگر وہ شاعری نہ ہوگی نظم ہوگی یا تنگ بندی۔

مزارِ حسن بدلے۔ آسمان بدلے۔ زمین بدلے
منزلِ عشق کیا بدلے گی ذوقِ ناپشیاں کو

کیا طنطنہ کیا ہمہ کیا بانگین ہے عشق کی ذہنیت، مذاق عاشقانہ کی صحت
استقامت کا یہ عالم ہے کہ مزارِ حسن کتنا ہی بدل جائے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے
عشق کا خمیازہ جو کچھ بھی کھلبلتا رہے اپنے مذاق عاشقی میں فرق آجائے کیا معنی؟
وہ عشق ہی کیا جسے پشیمانی لاحق ہو۔ یہ ہے تپانِ مذاق عشق۔ یہ ہے شانِ غزل گوئی
کہ دو مصرعوں میں ذہنیت عشق کا موقع کھینچ دیا۔ عاشقانہ غزل گوئی بیگانہ کے
دائرہ عمل سے خارج ہے مگر کبھی کبھی لہر آتی جاتی ہے۔

سہرا پنا عرق ہو کر لذتِ ترک تماشا میں
دکھاؤں کا تماشا ایک دن حسنِ پشیاں کو

یہ بھی اک نمونہ ہے شاعر کی انفرادیت کا۔ یہاں ذہنیت عشق کی تصویر کھینچی گئی ہے جس سے انداز بے رخی و کج ادائی پیدا ہے۔ بے رخی کس کے ساتھ؟ حسنِ پیشیاں کے ساتھ۔ کہتا ہے تو سہی میں خود ترک تماشا تماشا نہیں ترک تماشا کی لذت میں ڈوب کر حسن کی طرف سے منہ موڑ کر تماشا دکھا دین فرہ چکھا دوں۔ بے رخی و کج ادائی کا عشق کی بے رخی کا اثر حسن پر کیا ہوگا؟ شکست غرور اور پیشانی۔ یہ اک نفسیاتی کیفیت ہے و ایسی حالت میں لازماً حسن پر طاری ہوگی۔

کہتا ہے اور کس طنطنہ سے کہتا ہے کہ لذت ترک تماشا میں ڈوب کر حسنِ پیشیاں کو فرہ چکھا دوں گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تماشا چھوڑ کر تماشا میں بھی کوئی لذت ہوتی ہے۔ ہاں یہی تو بات ہے۔ حسن کی طرف سے دانستہ منہ موڑ لیا جائے تو اس پر کیا گذرے گی؟ اس کے غرور و ناز کو کیا صدمہ پہونچے گا؟ حسن کو کڑھانے جلانے تپانے میں جو فرہ ہے وہ سمجھنے کی چیز ہے سمجھانے کی تو ہے نہیں۔ فرمایئے تو سہی یہ شعر کس دور سے متعلق ہے دورِ حاضر سے یا غائب سے یا ہر دور سے؟ اس میں محض بڑ بولا پن ہے یا حسن و عشق کی نفسیاتی تحلیل؟ عشق کی اس کج ادائی پر حسن کے ساتھ اس ظالمانہ سلوک پر بیکانہ لے اک شعر کہہ دیا۔ مگر عشق کی یہ بانگی ادا نابغہ کو اتنی پسند آئی کہ وہ بار بار اسی موضوع پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ اس کے دیوان میں بہتے اشعار ملین گئے جو اس شعر کی شرح ثابت ہوں گے۔

دل دیوانہ مجھ کو کس بلا کے بن میں لے آیا
اسی میں خیر ہے پھر لے چل لے پاؤں نڈال کو

مراحلِ حیات میں ہے یہ بھی اک مرحلہ ہے جو منچلوں کو پیش آتا ہے۔ اب رہی کامیابی و ناکامی تو یہ شخصی استقلال یا تلون پر موقوف ہے۔ اگر منچلے پن کے ساتھ استقلال بھی شامل حال ہے تو آگے بڑھنا جلتے گا اور حالات و اوقات سے مغلوب ہو کر محبت ہار دی تو پھر اٹے پاؤں بھاگنے کی سوجھے گی۔ یہ شعر اک ایسا آئینہ ہے جس میں متلون مزاج منچلے اپنی صورت دیکھ سکے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں کہ صحراے ہولناک سے اٹے پاؤں زندان کی طرف جانے کی فکر میں ہیں اور ایک وہ ہیں کہ

مبارک ہو مبارک ساحلِ حیرتِ دہم لینا
قدم مارا تو ڈر کیا پیر جادریا سے عصیاں کو

شعر سننے ہی رجائیت کی اک لہر دوڑ جاتی ہے۔ دریا عصیاں میں قدم مارا تو ظاہر ہے کہ اس کا دوسرا ساحل، ساحلِ رحمت ہے جس کی طرف اشارہ کر کے پہلے ہی سے مبارک باد دیتا ہے اور یہ کہہ کر جو صلہ بڑھاتا ہے کہ ڈرنا کیا ہے پیر جا اور ساحلِ رحمت پر پہونچ کر دم لے۔ کتنا سچا درسِ عمل ہے کہ جو کام کر دے دل سے کر دے۔ تھوڑے پن سے نہ کر دے گناہ ہی سہی۔ گناہ کا یہ درس عمل اتنا معنی آفریں (consequence) ہے کہ اس سے عمل خیر کا درس بھی بالواسطہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ یعنی خیر ہو یا شر جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہو تو دل سے

کرد۔ دُبدھ میں پڑا رہنا کیا۔ نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔ وہ مرد ہی کیا جو دُھن کا پکا لنگن کا سچا نہ ہو۔ اب فرمائیے یہ کس دور کی شاعری ہے۔ کیا دور حاضر میں یہ درس عمل قابل پذیرائی نہیں ہے؟ ہے اور آئندہ بھی ہے گا۔

گرفتارانِ ساحل کو دپڑتے ڈرنکل جاتا
کبھی تو رستِ مشکل آزمائی مرگِ آساں کو

بُردلوں پست ہمتوں کو کبارِ راہِ عمل دکھائی ہے کیا ہمت دلائی ہے کہ موجِ حوادث سے ڈرتے کیا ہو کیوں ساحل پر بندھے کھڑے ہو۔ یہ موجِ حوادث کچھ بھی نہیں کو دپڑو۔ ابھی ڈرنکل جائے۔ رباعی ۷

مردوں کا اصول جان لینے کی ہر دیر دشوار کو سہل مان لینے کی ہر دیر
منجھڑھار تو کیا ہے آگ میں کو دپڑیں کچھ بھی نہیں دلیں ٹھکان لینے کی ہر دیر

یہ ہے آزاد اور عالی ہمت قوموں کی اسپرٹ جو ذلیل غلامانہ زندگی کو موت سے بدتر سمجھتی ہیں۔ فطرت بھی ایسے ہی اولوالعزموں کا ساتھ دیتی اور بیڑا پار لگا دیتی ہے۔ کو دپڑنے کی دیر ہے۔ لائیے اس شعر کا جواب اگر لا سکتے ہوں۔ مگر بشرط یہی ہے کہ شعر کے مقابل شعر پیش کیا جائے، تنگ بندی یا کلام آموزوں کی سند نہیں۔ دو مصرعوں کے جواب میں دو ہی مصرعے پیش کیجئے اتنے ہی مکمل اتنے ہی برجستہ۔ اس کی سند نہیں کہ ایک شعر کے جواب میں کوئی

سلسل نظم پیش کر دی جائے۔ یہاں دو مصرعوں میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جس شاعرانہ آرٹ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور اس کے سننے سے دل میں جو جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی سب خصوصیات اور کسی کے دو مصرعوں میں موجود ہوں تو پھر دونوں کے فرق مراتب پر غور کروں گا کہ کون کس مرتبہ کمال پر فائز ہے۔ سچ کیے اس شعر میں کوئی پیام کوئی درس عمل ہے کہ نہیں۔ قوم میں مطالعہ صحیح کی قوت ہو تو ان اشعار کے مطالعہ سے انقلاب پیدا ہو جائے گیگڑے ہوئے کام سنور جائیں۔

اں خوب یاد آیا ایک بار آیاتِ وجدانی اور ترجمانہ کا مطالعہ اس نظر سے تو کیجئے کہ بیگانہ آرٹ میں کس قدر انقلابی طاقت موجود ہے۔ یاد رکھئے کلام میں فی نفسہ انقلابی طاقت کا موجود ہونا اور بات ہے اور انقلاب انقلاب پکار کر ڈھول بجانا بنکار تے پھرنا اور بات ہے۔ زندگی کا کس بل اور چیز ہے جھوٹا جوش و خروش اور چیز ہے۔

گناہ بے حقیقت کو قلم نے کتنا چمکایا؟

پھر کُٹھتا ہوں میں جب کٹھیا ہو فرورِ عصیان کو

مُبصروں کو چھوڑیے ایک اندھا بھی ٹول کر اس شاہکار کی عظمت اور آرٹ کے کمال کا اعتراف کرے گا۔ اس شاہکار کی عظمت سے جائز انکار تو جیسی ہو سکتا ہے کہ زیادہ نہیں آدھے درجن اشعار پیش کر دیئے جائیں جو اسی موضوع کے حامل اور اسی حد کمال پر فائز ہوں۔ بے گناہوں کے خونِ ناحق کو حلال

ٹھہرائے میں قلم نے جو کافر جوائیاں دکھائی ہیں اون کے تاریخی پس منظر کی ایک جھلک اس آرٹ کے پردے پر دیکھ کر اہل نظر پکڑ آئیں گے۔
حضرت میرزا محمد واجد علی شاہ شاہ اودھ کس خطا پر معزول اور جلا وطن کئے گئے۔ یہ کیا تھا قلم مخالف رقم کی کارگزاری تھی جس نے فرد جرم کو ایسا چمکایا کہ واہ جی واہ۔ غیروں کی قلم رانیوں کا کیا شکوہ خود نواب واجد علی شاہ بہادر کے بھائی میرزا سلیمان قدر بہادر نے ریزیڈنٹ کے پاس اک محضر بھیجا جس میں منجملہ اور شکایتوں کے اک فقرہ یہ بھی تھا کہ ”جب سے بھائی صاحب تخت پر بیٹھے ہیں ہم کسی دن پاؤں پھیلا کے نہیں سو سکے“ واہ۔ گناہ بے حقیقت کو قلم نے کتنا چمکایا؟

کیا واقعی واجد علی شاہ بہادر ظالم و جاہل تھا؟ حاشا! وہ ایسے تو نہ تھے ان کی ہر دل عزیزی کا تو یہ حال تھا کہ معزول ہو کر جب لکھنؤ کو خیر باد کہی ہے تو شہر بھر میں خواہ ہند و خواہ مسلمان کسی کے گھر میں آٹھ دن تک چوٹا نہیں جلا۔ ہر گھر میں کہرام مچا تھا۔ اگر واجد علی شاہ بہادر کچھ خطا وار تھے بھی تو اپنی قوم کے آگے۔ کسی غیر قوم کے خطا وار تو تھے نہیں۔ فرضی فرد جرم کو چمکا کر سیاسی بہانے پیدا کر کے معزول کر دیا۔ شاہ موصوف اگر عیش پسندی کے سبب نا اہل بھی ٹھہرائے گئے تھے تو ان کے خاندان کا کوئی اور رکن تخت پر بٹھایا جا سکتا تھا۔ مگر یہ ساری منطقی فضول۔ دنیا میں حق ناحق کا فیصلہ منطقی عدالت سے نہیں ہوتا۔ تلوار سے ہوتا ہے۔ تلوار جس کے ہاتھ میں ہو وہی حق پر ہے۔ امر کیہ والوں نے غیروں کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا۔ دنیا میں اپنے جذبہ حریت کا ڈنکا بجا دیا۔

اک غریب ہندوستانی تھے کہ اپنے ملک میں غیروں کے تصرف سے تنگ آکر تلوار پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے مگر کچھ بنا نہ سکے۔ جانیں بھی گواہیں اور خود اپنے ملک میں اٹے باغی ٹھہرائے گئے۔ عفا کا واقعہ صفحات تاریخ میں غدر کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ کیا تھا؟ وہی گناہ بے حقیقت کو قلم نے کتنا چمکایا۔ اگر کامیاب ہو گئے ہوتے تو ان کا یہی ”غدر“ تاریخ میں حب وطن سے موسوم کیا جاتا۔ سچ ہے ۵

کون دیتا ہے داد کا مانی؟
خون فرما دے سر فرما دے
حضرت سرمد علیہ الرحمۃ کو اورنگ زیب نے (علما کا فتویٰ لے کر)
کیوں قتل کر دیا؟

کیا سچ مح قتل کا سبب یہ تھا کہ حضرت سرمد خدا کے وجود کے منکر تھے۔ لا الہ سے آگے بڑھنا الا اللہ کہنا نہیں چاہتے تھے تو کیا واقعی یہ کفر کی راہ سے تھا۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو اک بہانہ ڈھونڈ لیا گیا تھا۔ جسے علما کے قلم نے چمکا کر کفر کی حد تک پہنچا دیا۔ قتل کا فتویٰ دے دیا۔ قتل کا راز تو اک سیاسی امر تھا۔ وہ یہ کہ دارا شکوہ کو حضرت سرمد سے خاص عقیدت تھی اور ملک پر حضرت سرمد کا بڑا اثر تھا۔ اس لئے کفر کا اک بہانہ پیدا کر کے اورنگ زیب نے اس سیاسی خطرے کو دفع کر دیا۔

پکڑا کھتا ہوں میں جب دیکھتا ہوں قلعہ عسکری
اس حیرت انگیز ادبی شاہکار کو آپ جیسے اصحاب بڑبڑلاؤں چیلان کہہ کے
مال دیں تو کیا ہوتا ہے کوئی کسی کی زبان تو پکڑ سکتا نہیں۔ مگر کلام کا یہی

تیکھاپن شعر اور آرٹ کی جان ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو نگانہ کی خصوصیت
انفرادی ہے جسے کوشش کر کے کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ شاعری کی بلندی
پستی کا معیار اوس کے موضوع کی بلندی یا پستی نہیں ہے۔ بلکہ معیار یہ ہے کہ
کسی موضوع پر شاعر نے جو تصرف کیا ہے اس کا انداز کیا ہے؟ انداز تصرف
ہی سے آرٹ آرٹ ہوتا ہے۔ سنگ مرمر کی عمارتیں ہزاروں ہوں گی مگر سنگ مرمر
پر جو تصرف، ہنرمندانہ تصرف تاج محل کی صورت میں کیا گیا ہے وہ آرٹ کا
مثانے کمال ہے۔

زمیمہ۔ بزمیہ۔ طریہ۔ المیہ۔ ظریفانہ۔ مہذب۔ مذہبی۔ سیاسی معاشرتی
غرض یہ کہ ہر موضوع پر آرٹ کا کمال دکھایا جاسکتا ہے بشرطیکہ کوئی برتنا جانتا
ہو۔ چرکین۔ جان صاحب۔ جعفر زبلی۔ بلکیم لکھنوی کے رنگ میں بھی میر تقی میر
میر انیس۔ آتش۔ اور غالب کے رنگ میں بھی۔ زمانہ بہت چکر کھالتا ہے
جب کہیں اک طائر آرٹ پیدا ہوتا ہے۔ کوئی صحیح مذاق دیانت دار نقاد
آج تک نگانہ آرٹ پر نہ موضوع کی پستی کا الزام رکھ سکا نہ باعتبار تصرف کوئی
حرف رکھ سکا۔ زندگی کی ایسی تنقید و تشریح طنز و آرت کی صورت میں اردو
کے کسی آرٹسٹ نے کی ہی نہیں۔ اردو زبان میں کوئی آرٹسٹ ہی نہیں کرے گا کیا؟
اس ستم ظریفی کا کیا جواب ہے۔ اک صاحب مجھے لکھتے ہیں کہ آپ خواہ مخواہ
اکبر الہ آبادی کا دم بھرتے ہیں۔ اتنا بڑا زبردست شاعر مانتے ہیں۔ ان کے
ہاں نظافت کے سوا کیا رکھا ہے۔ انھیں کے ہوں وطن بسمل الہ آبادی ان سے
ساڑھے تین گز۔ ساڑھے تین فٹ۔ ساڑھے تین انچ آگے ہیں۔

برخت عقل ز حیرت کہ اس چہ بوالعجبی است

کجا بے سئل۔ کجا اکبر؟

اسی بوالعجبی کا مظاہرہ یہ بھی کیا گیا تھا کہ اک گنوار گونڈی کو نگانہ کا مد مقابل ہی
نہیں ٹھہرایا گیا تھا بلکہ نگانہ پر اس شخص کو فضیلت دی گئی تھی۔ تجھو۔ کسی نے کیا
خوب کہا ہے۔

جاہل سے پوچھنے کسی ان پڑھ سے پوچھنے اٹھ کی شاعری کو علی گڑھ سے پوچھنے
ایسے گنواروں کے سامنے نگانہ کو نیچا دکھانے کی کوشش آپ جانتے ہیں
کیا ہے؟ ہندوستانی ذہنیت کی توہین ہے۔ ادب کی توہین ہے۔ شرم کی
بات ہے۔ وہ اک گنوار جاہل شخص جسے شاعری سے کوئی نسبت صحیح نہیں، بیکاری
کے زمانہ میں چھ مہینے گھر بیٹھا رہا اور اسی چھ مہینے کے ”مشغلہ بیکاری“ کے بعد
بادن گز کا شاعر بن کر نکل آیا۔ اور علی گڑھ کے پھندیت اُسے ایسا لے اڑے
کہ دور حاضر کے بہترین شعراء میں شمار ہونے لگا۔ اسی کو کہتے ہیں بے پر کی
آڑا ناں (رباعی)

دنیا ادب کی ایسی کا یا پلٹی کا لا کو ابھی بن گیا سفیر ازی!
دیکھو تو علی گڑھ کی یہ بالغ نظری چیل اڑتے جو دیکھیں تو کہیں پھنس اڑی
ارائے سے عمل تک کچھ تو اپنا دسترس نا بغل میں پالتے کیوں یا اس دشمن جان کہ؟
کس مجبوری کس اختیار نا بے اختیار کا عریض کھینچا ہے۔ کتنی دردناک
حقیقت ہے کہ انسان اپنے دشمن کی پرورش کرنے پر بھی مجبور ہے۔ جانتا
ہے کہ سانپ ہے مگر آستین میں پالتا ہے۔

بندہ نواز دیکھ لیا آپ نے۔ ان دونوں غزلوں کے اشعار ایک ایک کر کے پیش کر دئے گئے ہیں۔ کوئی انتخاب نہیں کیا گیا ہے۔ سچ فرمائیے یہ دو شعر کارنگ ہے کہ ایام جہالت کا۔ حقایق و جدائی کا یہ تنوع یہ زور شور کیا آپ نے اور کسی سخنور میں بھی دیکھا ہے ایسے مکمل آرٹ کی صورت میں؟ زبان سے تو یگانہ کی شاعرانہ عظمت سے انکار کر دینا آسان ہے ضمیر بھی انکار کر کے جب جائیے۔

آپ اپنے دور حاضر کی فلسفیانہ غزل گوئی پر جو ناز کر رہے ہیں تو دور حاضر کو دور حاضر بنانے میں ایمان سے کیسے گائیگانہ کی ادبی جدوجہد یگانہ آرٹ کے فیض کو بھی کچھ دخل ہے یا بالکل نہیں؟ یگانہ آرٹ سے۔ یگانہ کے تنقیدی کارناموں سے یگانہ کی مجاہدانہ زندگی سے گزشتہ تیس سال کے اندر آپ کے چھٹ بھٹیوں نے بھی کچھ استفادہ کیا یا نہیں۔ آپ کے چھٹ بھٹیوں میں سے بعض نے سادہ اور عام فہم زبان میں فلسفیانہ مذاق کے شعر کہنے کا سلیقہ کس سے سیکھا۔ غالب سے کہ یگانہ سے؟ اور کیا یگانہ نے بھی ان چھٹ بھٹیوں سے کچھ سیکھا؟ تو یہ کیسے!

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی
سب جبر سراسیمہ (دکن)

موج ہوا سے خاک اگر آستانہ ہو
دنیا سے گرد باد کی نشوونما نہ ہو

موج ہوا اور خاک کے ملنے سے گرد باد کا وجود میں آنا اور صورت نشوونما اختیار کرنا فلسفیانہ جدت کی تازہ مثال ہے *The fertility of his mind gives so novelty to familiar things.*

صورت نہ پکڑے جلوہ بے معنی حجاب
دنیا کا کارخانہ ہوا پر چل رہا ہے۔ حجاب کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ اک ہوائی طلسم ہے اک جلوہ بے معنی ہے جس کی ساری نمود ہوا کے دم سے ہے۔ قطرہ میں ہوا نہ بھرے تو حجاب کی جلوہ آرائی کیونکر ہو۔ دیکھو فلسفیانہ حقایق کتنے شاعرانہ انداز سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں فلسفہ بھی شعریت میں غرق ہو گیا۔ یہی حقایق دیوزاد کی زبان میں بیان کئے جاتے تو شعریت کا جوہر خاک میں مل جاتا۔

دل کو جلا کے سرمہ بنائے
آنکھوں سے معرفت کا اگر حق اوانہ ہو
نظر میں اتنی قوت نہیں کہ کمال معرفت تک پہنچ سکے تو دل میں سوز و گداز پیدا کر دیکھو کہ معرفت کا بہترین نسخہ یہی ہے۔
ایسا نہ ہو کہ خفا کے کہیں پیچھا چلے
دیر و حرم میں گم نگہ نارسانہ ہو
اندیشہ تو بجا ہے۔ مذہب کے پھیر میں پڑ کر اور کیا ہوتا ہے؟

شکل اس کی دیدنی بھی ہر نادیدنی بھی
جو تجھ کو جانتا ہو مگر مانتا نہ ہو

اس کتاب میں اشعار کا مفہوم سمجھانے کے لئے جو اشارات درج ہیں وہ شعراء کے لئے نہیں

کون ہے جو خدا کو جانتا ہو مگر مانتا نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا ہے تو اس کی شکل دیکھنے کے قابل ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ نادیدنی تو اس وجہ سے کہ جان بچا کر نہ مانے تو ایسے کی شکل کوئی کیوں دیکھے اور دیدنی اس وجہ سے کہ ایسے منکر کو ایک بار دفع حیرت کے لئے ضرور دیکھ لینا چاہیے۔

سجدہ وہ کیا کہ سر کو جھکا کر اٹھا لیا بندہ وہ ہے جو بندہ ہو بندہ نہ مانے ہو سر جھکا تو جھکا پھر اٹھنا کیسا؟ سر جھکا کر اٹھا لیا تو بزرگی ناقص۔

جذبہ عبودیت کی کتنی نادر مثال ہے۔ احسان کس کا مانے کس کا نہ مانے پردے میں نا خدا کے کوئی دوسرا نہ ہو

کیا دُور بینی۔ کیا حق شناسی۔ خدا کی ذات پر کتنا یقین ہے۔ سبحان اللہ دل کھول کر ٹپنے کے اے صبر الوداع پر ہنر کیوں کروں جب امید شفاء نہ ہو کتنا صیح کتنا نظری انداز تخیل ہے کہ جیب امتیہی باقی نہ رہی تو پھر ٹرپ

لینے میں پس و پیش کیا؟ امید صلاح کیا ہو کسی حق پسند سے پیچھے وہ کیا ہٹے گا جو حد سے بڑھانہ ہو

صلاح کا یہ نظریہ بھی غالباً اچھوتا ہے۔ پہلا مصرع بظاہر انوکھا معلوم ہوتا ہے کہ حق پسند سے صلاح کی امید نہ ہوگی تو پھر کس سے ہوگی؟ مگر دوسرے مصرع نے اس انوکھی بات کو کتنی گہری حقیقت سے مطابق کر دیا ہے۔ اس اجال کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں صلاح کا دستور تو یہ ہے کہ فریقین میں سے دونوں کو کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ کچھ ہم دے کچھ تم دے چلو صلاح ہو گئی۔ مگر ایک حق پسند کبھی اپنے جادہ سے ہٹ جانا گوارا کر ہی نہیں سکتا۔ وہ تو نہ خدا عادل سے

ہے آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے اپنے مقام پر قائم رہتا ہے۔ پھر ایسے سے صلاح کی امید کیونکر ہو سکتی ہے۔

دل نشہ خودی میں پڑا جھومتا ہو کیا؟ نذر آزمائی کو کوئی درد اٹھ کھڑا نہ ہو یہ ہے زندگی کا کس بل مگر اس کی بجائے حالات سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے۔ ترقی پسندوں کا فتور نیست دیکھئے کہ اس ترقی یافتہ ادب کو بھی پڑانی چیز یاد کرانا چاہتے ہیں۔

پچھلا پھر ہے کاتب اعمال ہوشیار آمادہ گناہ کوئی جاگستا نہ ہو کوئی جاگستا نہ ہو۔ شعر سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا دوسو برس

کے اردو لٹریچر میں یا ایرانی لٹریچر میں اس *Originality* کا جواب ہے؟ ہرگز نہیں مگر افسوس ہے ترقی پسندوں کی دھڑائی پر کہ اسے پڑانی چیز ٹھہراتے ہیں۔ *Shame*

پارا اٹکے کیا دوا ہے امید و بیم سے جب تک بیگانہ دل کو یقین خدا نہ ہو

تارِ نظر نے باندھ لیا ہے بہار کو نیرنگی تصور بے اعتبار کو

”تارِ نظر نے باندھ لیا ہے بہار کو الہامی زبان ہے اور بہار کو تصور بے اعتبار سے تعبیر کرنا زوالِ اندازِ فکر ہے۔ سبحان اللہ۔ معلوم ہوتا ہے میرزا بیدل بول رہے ہیں۔

دے کچھ تو داد طبعِ ندامت شعار کو کیا دیکھتا ہے لغزشِ بخت اختیار کو

اس لغزش بے اختیار کو کیا دیکھتا ہے۔ تجھے تو داد دینی چاہیے کہ گو میں
لغزش و خطا پر مجبور تھا مگر اس پر بھی نادم ہوں ورنہ مجبوری کے ساتھ ندامت

کیسی؟ دیدار تو دکھائے کہیں صبح منتظر حاضر ہے سر بھی سجدہ بے اختیار کو
صبح امید یا صبح قیامت کو صبح منتظر کہنا کتنا تازہ کتنا دلکش تصرف
ہے۔ اسی طرح سجدہ بے اختیار کی تازہ ترکیب سے شوق نیاز کی حد معلوم
ہوتی ہے۔ صبح منتظر کہیں جلوہ گر تو ہو میں سر نیاز جھکا دینے کے لئے
سرایا انتظار ہوں۔

خانہ خراب عشق نے دل میں پناہ لی دارالاماں مجھ کے اس اُجڑے دیار کو
دل کو اُجڑا دیار کہتا تو کوئی بڑی بات نہیں مگر اسے دارالاماں سے
تعبیر کرنا اور پھر عشق کا اس دارالاماں میں پناہ لینا کیا زور بیاں ہے

کیا جیکمانہ فکر ہے؟ کچھ ہوش ہو تو آنکھوں ہی آنکھوں میں لے
آغازِ پُرفریب سے انجام کار کو
غزل ہے کہ حقایق و معارف کا دریا اُمنڈنا آ رہا ہے؟

"The fertility of his mind is evident everywhere."
دل نے بزور عشق لگایا ہے راہ پر گم گشتگانِ غم کے ہر روزگار کو
حضرتِ مہربانِ ریاحی کا خاتمہ یا خیر آنکھوں میں پھر نے لگا خوش نصیب
زہے توفیق کہ آخر وقت راہ پر آئے اور امام حسینؑ پر جان نثار کر دی۔
"All is well that ends well"

بلکہ علامہ اور پیر درویش دکن کے ہیں۔

سے اس کتاب میں اشارات کا مفہوم سمجھانے کے لئے جو اشارات درج ہیں وہ شواہد کے نہیں

بیگانہ وار ایک ہی رخ سے نہ دیکھے دنیا کے ہر شاہدہ ناگوار کو
آرٹ کا لازوال شاہکار ہے۔ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے

زترین اصول ہے۔ کائناتوں سے تولدے ہیں جو کچھ لوگوں کے ہار کو
میزانِ عدل آئی اب سیول کے ہاتھ میں بعض کرسی نشینانِ عدالت کو اس شعر میں اپنے کیر کٹر کی تصویر نظر آتی
ہوگی۔ اور ان کے ضمیر کو کیا کہیے جو اس آرٹ کو ترقی پسندوں کے گندے
اور بے ڈھنگے ادب کے سامنے بھی فضول ٹھہرانا چاہتے ہیں۔

یاد آئی آشیانہ پر خار کی خلش دل ڈھونڈھتا ہے پھر اسی اُجڑے دیار کو
الدری حب وطن۔ پھر اسی اُجڑے دیار اُسی آشیانہ پر خار کی یاد
آئی۔ وطن میں دوست دشمن سمجھی ہوتے ہیں۔ دشمنوں کی عداوت کے
لحاظ سے وطن کو آشیانہ پر خار بیگانہ کے سوا کسی نے نہیں کہا۔

بیچے بد نصیب گرفتار آشیاں کیا جانیں گرم و سرد خزاں بہار کو
ان غریبوں کے درد کو کون پہونچے جن کا آشیاں بھی قفس سے بدتر ہے
بادِ سحر کجا؟ پریر و نہ شام سے بھر کا رہے تھے شعلہ بے اختیار کو
(*Allegory*) صبح تو بہت دور تھی مگر پردائے (منجھے عشاق) حسن و
شباب کو بھر کا بھر کا قبل از وقت فنا کے گھاٹ لے جا رہے تھے۔

سہو و خطا و دلیعت فطرت ہی مگر سمجھاؤں کیا ضمیر ملامت شعرا کو
سہو و خطا و زائل سے انسان کی فطرت میں ودلیعت کی لگی ہے۔ مگر
اس پر بھی ضمیر ملامت شعرا کی خلش انسان کو بے چین رکھتی ہے

معلوم نہیں کیوں؟
اللہ کے اختیار کے آمادہ کر لیا
انسان کا فاعل مختار ہونا تو سمجھ میں آیا ہے نہ آئے گا۔ اختیار یا قدرت
جو کچھ بھی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کسی بات کا ارادہ کرے۔ فکر و ارادہ کا کیا کہنا
نہن تو ممکن ہے محال کی بھی فکر کی جاسکتی ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ہم فکر
سے زیادہ بھی کچھ کر سکتے ہیں۔ کیا عمل پر بھی ہمارا کچھ دسترس ہے؟
واہ کیا اختیار ہے۔ دیکھو اس طنز نے شعر میں کس قیامت کا درد
بھردیا ہے۔

ساحل کہاں دو آبہ امید و بیم کا
تہ پر بٹھا دو یا س دلِ بقیار کو
بہار زندگی نادان بہار جاوداں کیوں ہو
یہ دنیا ہے تو ہر کردہ ہی آرام جاں کیوں ہو

شعر سننے اور سمجھنے کے لئے اک mood اک کیفیت پذیرائی
ضروری ہے۔ اگر کسی وقت دل میں یہ کیفیت موجود ہو تو یقین ہے یہ
شعر سننے ہی انسٹوٹیک پڑیں گے۔ وہی ذات جو کسی کے لئے آرام جان
تسکین روح ہے گردشِ روزگار نے اُسے دُور پھینک دیا ہے۔ ایک زمانہ
وہ تھا کہ خوش نصیبی سے یہی پہلو آباد تھا۔ اس اضطراب کی حالت میں
دل کو یہ سمجھاتا ہے کہ یہ تو دنیا ہے جو کبھی ایک جال پر نہیں رہتی۔ زندگی کی بہار
بہارِ جاوداں ہو نہیں سکتی۔ اور کیوں ہو؟ ایسا تو پھر بھی بہارِ بارِ خاطر

ہو جائے۔ یہ ہے شعر و حکمت کا امتزاج۔

خدا را میرے انکے اور کوئی درمیاں کیوں ہو
پیمبر کیوں بنے۔ آخر کسی کا راز داں کیوں ہو

دو دلوں کا معاملہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ کسی کا واسطہ گوارا نہیں کیا جاسکتا
یہ عین فطرت ہے۔ جن دلوں میں کشش ہوتی ہے وہ آپس ہی میں سمجھ
لیتے ہیں۔ کسی کو درمیان میں نہیں لاتے۔

کبھی جلوہ دکھاتے ہو تو آئینہ در آئینہ
کھلا پردہ ہی بکھر بھی یہ پردہ درمیاں کیوں ہو

دُور بیٹھے آئینہ در آئینہ جلوہ دکھا رہے ہو، یہ تو کوئی جلوہ نہ ہوا۔ ایسا جلوہ
تو ہزاروں میل سے نظر آسکتا ہے۔ یہ حضوری کیا ہوئی۔ پردہ ہی پردہ رہا
اگرچہ کھلا پردہ ہے۔ اس ٹھٹھہ روزمرہ کا اتنا حکیمانہ مصروف کسی نے نہیں
ایسا *beauty + beauty* کی ہم آہنگی اور تناسب کو جانچ کر دیکھو تو
شعر الہامی کرشمہ نظر آتا ہے۔ یہ وہ غزل ہے جسے میرزا یگانہ اپنا حاصل
زندگی جانتے ہیں، بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ اردو اور فارسی دونوں بانوں
میں فن غزل کا کوئی ایسا شاہکار موجود نہیں۔ اول سے آخر تک حقایق و

معارف کا دریا اُمنڈتا آرہا ہے۔ ہر دیکھ اپنے حسن کا عالم
مرے دل میں سما کر دیکھ اپنے حسن کا عالم
کسی آئینہ خانہ پر نگاہ امتحاں کیوں ہو

سبحان اللہ شعر کتنی بڑی فلسفیانہ حقیقت کا آئینہ ہے۔ کیا معنی کہ حسن کے جانچنے کا سچی معیار آئینہ نہیں ہے بلکہ انسان کا دل ہے۔ آئینہ خا میں تو حسن ظاہری کا رنگ، روپ نظر آتا ہے اور بس۔ مگر حسن کا قیامت انگیز اثر دل پر ہوتا ہے۔ حسن کے مشاہدے سے دیکھنے والوں کے دل پر جو کچھ گزر جاتی ہے اس کا مشاہدہ کر لینے کے بعد حسن کو اپنی سچی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ حسن کی سچی تسوٹی عاشق کا دل ہے۔

کوئی ناگفتنی مطلب ہے ان نہجی نگاہوں کا
زبان تک انہیں سکتا تو آنکھوں سے میاں کیوں ہو

وہ آرزوئیں جو جائز اور حلال ہیں مگر زبان تک انہیں سکتیں، شرم و حیا انہیں آنکھوں سے بھی ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ وجہ ہے کہ نگاہ نہجی رہتی ہے اٹھ نہیں سکتی۔ مشاہدہ تو سمجھ کر کرتے ہیں مگر اتنے نازک معانی و مطالب کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر دل میں اتار دینا یگانہ ہی کا حق ہے۔ بڑے بڑے اساتذہ کی غزلیں پڑھ جانے کے بعد دو ایک شعر ذہن میں رہ جاتا ہے مگر یہ خصوصیت یگانہ ہی کے کلام میں دیکھی گئی کہ غزل میں ایک کے بعد ایک شعر بڑھتا ہی جاتا ہے اور آخر تک پہنچتے پہنچتے سب بھول جاتا ہے۔ کس کس شعر کو یاد رکھیں۔ یہ بھی اک ثبوت ہے یگانہ کے منتہائے کمال کا۔ کتنی انوکھی بات ہے جو یگانہ کے سوا اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ حق تو یہ ہے

نوٹ: مصرعے پر پہلا مصرعوں ہے ۷ مرے ہوئے غریبوں کو ستانا اور پکڑنا۔

اس بیسویں صدی میں یگانہ کے سوا اور کسی کو حقیقی شاعر سمجھنا خود فریبی ہے جھلا اتنا سچا شاعر نہ شعور اتنی سادگی و پیرکاری فطرت نے اور کسی کو عطا کی ہے۔ جل جلالہ۔

گنہگار محبت کو اسی عالم میں رہنے دے

مزا واجب سہی لیکن بہشت جا وداں کیوں ہو

کتنی سچی تمنا ہے کہ ایسے گنہگار کو اسی عالم میں رہنے دے تو بہتر ہے اس کے لئے بہشت جا وداں تو بڑا کیا جائے تو یہ سزا کتنی سخت کتنی عجیب ہوگی کیفیت جا وداںی خود اک عذاب ہو جائے گی۔ سبحان اللہ کیا شوخی

منطق ہے ؟ The fertility of his mind & happiness of language evident everywhere.

”جھلا یا ایسے وکیوں کو بچھو تو نا کمین دم ہے“

ہم ایسے خاکساروں کو تپاؤ تو دھواں کیوں ہو

ظاہر ہے کہ ایسے ویسے خامکاروں کو جھلا کر ادن کی ہاے ویلا سنتے سنتے ناک میں دم ہو ہی جائے گا۔ اور خاکساروں کو تپاؤ تو دھواں تک نہ ہوگا۔ یہاں جلانے اور تپانے کا فرق اور اس کا اثر دیکھنے کی چیز ہے۔ دو مصرعوں میں اتنے حقایق زندگی، معنوی حیثیت سے ایک ایک لفظ کی کڑی سے کڑی ملی ہوئی اس پر ظرافت و طنز انتہا ہے کمال کی۔ فن شعر میں ایسا منجھا ہوا ہاتھ کون دکھا سکتا ہے۔ Not the general whole, every

every line is worked out with intense earnestness."

مرے ہوئے غریبوں کو ستانا اور چٹانا

تھیں درویشیانی نصیب دشمنان کیوں ہو

تناموں سے یہ کہنا کہ تھیں درویشیانی کیوں ہو۔ کتنا ہمدردانہ طنز ہے اور اس پر نصیب دشمنان کا فقرہ۔ طنز پر طنز۔ چرکے پر چرکا۔

جفا کو ہم وفا سمجھے نہیں تو چل بسے ہوتے

مگر وہ پوچھتے کیا ہیں کہ تم اب تک جوں کیوں ہو

یہیوں صدی میں یہ لب لہجہ اور کسے نصیب ہوا۔ دو مصرعوں میں اتنی معنوی وسعت کون پیدا کر سکتا ہے۔ وہاں تو یہ خیال تھا کہ جفا میں ہستے ہستے کام تمام ہو جائے گا یہ رہا شعر کا پس منظر مگر یہاں اب تک ویسے ہی جو ان بنے ہوئے ہیں رتی بھر نہ گھٹے۔ جفاؤں کا کچھ اثر ہی نہ ہوا۔ جفا کو جفا سمجھے ہی نہیں۔ اپنی سادہ لوحی نے ظالم کے تمام ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ بعض اوقات سب وقوفی اور بے حسی نعمت ثابت ہوتی ہے۔ ظالم ظالم کرتے کرتے کھینا ہوا جاتا

"Sometimes the malignity of one is defeated by the simplicity of another"

مگر جب کہ رقتہ رقتہ اُس پر کھلیں کھولیں

مگر نازل کوئی فضل الہی ناگہاں کیوں ہو

ادبی دنیا کو بہت کچھ دیکھا اور سنا۔ مگر اب تک ایسی آواز کانوں میں نہیں آئی تھی۔ ایک لذت تو وہ ہے کہ خود درخت لگایا۔ اپنے ہاتھوں سے سینجا۔ پھولتے پھلتے دیکھا۔ ایک وہ کہ اچانک کوئی بارغ درخت میں مفت ہاتھ آ گیا۔ ان دونوں لذتوں میں کتنا فرق ہے حقیقت و صداقت پر اتنا اچھوتا تصرف جو سننے والوں کو حیرت میں ڈال دے یہ مرتبہ اس دور میں یگانہ ہی کو حاصل ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں:۔ بلائے ناگہانی کو نازل ہوتے سب نے سنا اور دیکھا ہے مگر یہاں فضل الہی کو بھی نازل ہوتے دیکھ لیجئے۔ فضل الہی کے ساتھ اس لفظ کا استعمال بالکل بے محل ہوتا ہے مگر قادر الکلامی دیکھئے یہی لفظ یہاں کتنا چسپاں ہے یہی وہ باتیں ہیں جو سکھائی نہیں جاسکتیں فطری شعور پر موقوف ہیں۔

رباغت سے جو حاصل ہو وہی سچی مسرت ہے

میسر آسکے عجب تو ان داموں گراں کیوں ہو

مرا دشمن خود اپنی موت تو نے تو نہیں مارا

کوئی مرد عمل جھوٹی خوشی پر شاہ مال کیوں ہو

یہ شعر بھی جذبہ انتقام کو بھڑکانے کا اک زبردست آلہ کار ہے۔ دشمن اپنی موت مرا تو اس پر کوئی مرد عمل خوشی کا اظہار کیا کرے گا۔ ہاں خود اپنے ہاتھوں

دشمن کا کام تمام کر دیا ہو تا تو خوشی کا موقع تھا۔ جھوٹی خوشی کس کام کی۔

بشر کو نہیں نہر شہ کیوں نبول جیسا ہو اچھا ہو

بغاوت اپنی فطرت ہے نصیب دشمنوں کیوں ہو

بشر کو بشر ہی رہنا چاہیے اس کے خلاف جانا فطرت سے بغاوت کرنا ہے۔ اردو میں میرزا یگانہ کے ہوا اور کسی نے اس حکمت عالیہ کو ایسی شعری زندگی نہیں بخشی۔ مگر یہ بھی تو دیکھئے اک نوجوان ترقی پسند پر و قیس میرزا صاحب پر کیا کیا طعن مارتا ہے۔

(۱) "میرزا یگانہ کے طرز زندگی سے میں واقف نہیں۔ انھیں میں نے پڑھا ضرور ہے۔ اُن کے اندر نزاجیت پسند باغی کی روح ہے جو سماج کے ساتھ تعاون کر کے نہیں رہنا چاہتی۔"

دیکھا آپ نے یہ شخص لکھنؤ پہنچ کر بھی یگانہ کے طرز زندگی سے واقف نہ ہو سکا۔ معلوم نہیں یہ شخص میر تقی میر۔ میر انیس۔ نوابہ آتش وغیرہ یا جوش و جگر وغیرہ کے طرز زندگی سے بھی واقف ہے یا نہیں؟ ملک کے ارباب ادب خواہ یو۔ پی کے ہوں یا پنجاب کے یا دکن کے۔ یگانہ کے طرز زندگی سے کافی واقفیت رکھتے ہیں۔ اتنا تو سب جانتے ہیں کہ میرزا صاحب کو نزاجیت سے نہ کبھی کوئی تعلق تھا نہ اب ہے۔ سماج کے ساتھ یگانہ نے کبھی عدم تعاون نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ کبھی کسی پارٹی میں شریک نہ ہوئے نہ اپنی کوئی پارٹی بنائی۔ اُن کی ہمت اور حوصلہ کا تقاضا ہی رہا ہے کہ فتح

کروں گا تو تنہا شکست کھاؤں گا تو تنہا۔ اور یہ کر کے دکھا دیا۔ سارا ملک ایک طرف اور وہ تنہا ایک طرف۔ کسی معرکہ میں شکست نہیں کھائی۔ ہاں تو سماج کا ہر رکن جس طرح سماج کا ساتھ دیتا ہے یگانہ نے بھی اسی طرح ساتھ دیا۔ کبھی ہمسایہ کو یا محلہ والوں کو میرزا صاحب سے شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اپنے ادب کے ذریعہ سے کبھی نزاجیت کی تبلیغ نہیں کی۔ جو کچھ کیا انسانیت اور سماج ہی کے لئے کیا۔ بد نظمی اور ادب باشی نہیں پھیلائی۔ اس شعر میں بھی بشریت کی حمایت کی گئی ہے۔ آج تک یگانہ کسی نے انسانیت کے خلاف بغاوت کرنے کا الزام نہیں رکھا۔ معلوم نہیں اس "ترقی پسند" نوجوان میں کوئی انسانی روح ہے یا..... جو انسانیت کی تبلیغ، انسانیت کی خدمت کرنے والے پر نزاجیت کا الزام رکھتا ہے۔ جھوٹا اور بے بنیاد۔

میرزا یگانہ نے کبھی دھادو۔ گراو۔ مٹادو کا شور نہیں مچایا۔

(۲) پھر کہتا ہے۔ اُن کی انفرادیت اُن کے اپنے لئے مفید ہو تو ہو اُن کے دعوؤں کے باوجود انسانیت کے لئے مفید نہیں۔ اُن میں غرور اور اُکڑ سے پیدا ہونے والی انفرادیت ہے۔ جو دُور مقابلہ کا نتیجہ ہے۔ بھلا اس خط بیانی کا کیا علاج۔ کیا شخصی انفرادیت بھی کوئی ایسی چیز ہے جو کسی کا مقابلہ ہو جانے سے پیدا ہو جائے گی۔ ارے میاں انفرادیت انسان کی ذات میں

۵ اُن کی انفرادیت اُن کے اپنے لئے عجیب اُردو ہے۔ نصی کی زبان تو یہ ہے ان کی انفرادیت خود اپنے لئے۔

فطرۃ و دلالت ہوتی ہے لڑنے بھڑنے کو شمش کرنے سے انفرادیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ کس قدر اہل ہے یہ بگو اس کہ یگانہ کی انفرادیت دور مقابلہ کا نتیجہ ہے۔ دیکھ لیں آپ نے اس شخص کی ہلکی ہلکی باتیں۔ معلوم ہوتا ہے اسے کوئی بیماری ہے۔ ہوش و حواس بجا نہیں رہے کیا ایسا کوئی انسان پیدا ہوا ہے۔ جو ٹیک نیتی کے ساتھ یگانہ آرٹ کو انسانیت کے لئے غیر مفید ٹھہرا سکے۔ یہ کیسا سٹرا ہوا ضمیر ہے جو ایسے آرٹ کی افادیت سے انکار کرتا ہے جس میں انسان کو اپنی زندگی کی بولتی ہوئی تصویر نظر آتی ہے۔

کیا یگانہ آرٹ اور یگانہ فطری عزم و اعتماد نے دیکھنے والوں کی آنکھیں کھولی نہیں دیں کہ اک فرد واحد ابتداء زمانہ کی عام اور مسلسل مخالفت، سراج کی بے پردائی اور بے توجہی کے باوجود زندہ رہ سکتا اور اپنا کام کر سکتا ہے کیا اس میں انسانیت کے لئے کوئی درس نہیں؟ کتابی نہیں، عملی درس جو برت کر دکھا دیا گیا انسانیت کے لئے مفید نہیں۔ اور یہ تو سوچنا کہ انفرادیت، ان کی حریت فکر و عمل ایسے بگڑے ہوئے نظام زندگی میں

۱۔ ترقی پسندی ایک خوش نما کاغذی ابلہ فرسی کا نام ہے جس کے پھندیت "فیلسوفیانہ" نظریات کا پروپیگنڈا تو بہت کرتے ہیں مگر ترقی پسند شاعری کی عملی کارگزاری پیش کرنے سے پہلو بچاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس بے ہنری اور اوباشی کے سوا اور کیا رکھا ہے۔

خود ان کے لئے مفید کیونکر ہو سکتی تھی اس سے تو میرزا صاحب کو ہمیشہ نقصان ہی پہنچتا رہا ہے جسے برداشت کرنے کے لئے وہ قبل از قبل تیار رہتے ہیں ترقی اور جلب منفعت کی جو راہیں نکل سکتی تھیں انھیں بھی میرزا صاحب کی حریت پسندی نے قبول نہ کیا۔ آج تک وہی جذبہ حریت کام کر رہا ہے۔ کس قدر غلط ہے یہ کہنا کہ "یگانہ میں غرور اور اکرے پیدا ہو جانے والی انفرادیت ہے جو دور مقابلہ کا نتیجہ ہے" ترقی پسندوں کا یہ دور مقابلہ تو ابھی تو برسوں سے شروع ہوا ہے اور میرزا یگانہ کا دور مقابلہ تو لکھنؤ میں ۱۹۱۲ء سے شروع ہو چکا تھا۔ میدان ادب میں جسے مقابلہ کہتے ہیں وہ تو اس صدی میں یگانہ کے سوا کسی نے کیا ہی نہیں مگر ان کا مقابلہ جو ترقی پسندوں سے جو ابھی پیدا ہوئے ہیں یہ کیا بات ہوئی؟ ایسا سوال تو پیدا ہو نہیں سکتا۔ وہ ایسوں کا مقابلہ کرنا کیونکر کر سکتے تھے۔ ان کا مقابلہ تو بڑے بڑے غلیچوں سے تھا۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ غالب کا وہ صنم اکبر ٹوٹ پھوٹ کر الگ ہو گیا۔ وہ مثل داخل دستر ہو چکی۔ میرزا یگانہ کو جو لوگ مغرور سمجھتے ہیں اچھے جارہے ہیں۔ ہمیں روکنے کی کیا ضرورت؟ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ میرزا یگانہ اک صحیح انھو اس صحیح المذاق انسان ہیں اور

۲۔ دور مقابلہ ہو گا جن کے لئے ہو گا۔ یگانہ آرٹ کا مقابلہ ترقی پسندوں کے نکلے اور گندے ادب سے ہو ہی نہیں سکتا۔ ہنرمندی اور کچھوٹ پن کا مقابلہ کیا۔

ایسا انسان مغرور ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ مغروروں سے جب ٹکرا ہوئی تو یگانہ کی جذبہ خود شناسی و خود داری بیدار ہو گیا اور مجاہدانہ کش مکش کے ساتھ ساتھ جذبہ خودی زور پکڑتا گیا اور یہ بالکل فطری عمل تھا۔ یہ کہنا مہمل ہے کہ یگانہ کی انفرادیت گویا غرور اور اگر کی پیداوار ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ حقیقت یوں ہے کہ تجلہ اور فطری خصوصیات کے اک جذبہ خود داری بھی یگانہ کی ذات میں ودیعت تھا۔ جو اہل لکھنؤ کے غرور بے جا سے ٹکرا کر بیدار ہوا اور آئینہ پیش آئے والے حالات کے تقاضے سے بڑھتا گیا اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا کہ یگانہ یہ تو ناممکن تھا کہ یگانہ جیسا انسان مغروروں کے ساتھ تعاون کرتا یا اون کی

لے مغروروں کے مقابل میرزا یگانہ کا غرور مسلم سہی مگر کسی سچے اور حقیقی شعر کے مقابل میرزا صاحب نے کبھی اپنے تئیں مغرور نہیں پایا خواہ وہ کسی کا شعر ہو۔ کچھ دالوں نے دیکھا ہے کہ بھوپال میں تیزاد لکھنؤ کی زبان سے یہ عرض کرے امری کائنات دل میری بہار زندگی آگیاں یہ کہہ سکوں مجھ کو خدا نہ مل سکا دیر تک روتے رہے طبعی جنگجوی کے ساتھ ساتھ دل میں اتنا سوز و گداز بھی ودیعت ہوا ہے۔ اسی طرح وہ جس گراما دادی کو جیسا کچھ سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں مگر سچے شعر کے ساتھ کبھی بے انصافی نہیں کی۔ جگر کا یہ شعر اکثر میرزا صاحب کو ترپاتا رہتا ہے۔

یوں زندگی گزار رہا ہوں تم سے بغیر جیسے کوئی لٹاہ کے جا رہا ہوں میں

ہاں میں ہاں ملاتا۔ مگر سماج کے ساتھ یگانہ نے کبھی بغاوت یا غداری نہیں کی بلکہ فطرت نے جو کچھ ان کی ذات میں ودیعت کیا تھا اسے سماج ہی کی بہود میں صرف کیا۔ مگر وہ سماج نہ تو مسلم سماج ہے نہ ہندو سماج۔ نہ آریہ سماج بلکہ آدم سماج ہے۔ یہ اک روشن حقیقت ہے کہ یگانہ آرٹ اپنی تمام انفرادی خصوصیات کے ساتھ Universal ہے۔ کتنا سٹرا ہوا ضمیر ہے اس شخص کا جو ایسے Universal آرٹ کو انسانیت کے لئے غیر مفید ٹھہراتا ہے۔

(۳) پھر کہتا ہے۔ یگانہ کا عزم و اعتماد غصہ اور غرور نفسیاتی حیثیت سے اس شخص کا پیدا دیتا ہے جو دنیا کو اپنا دشمن سمجھے۔

دیکھا آپ نے کیا ایسا ان داسے یہ شخص جو یگانہ کے حسن پر بھی عیب کارنگ چڑھاتا ہے۔ کہتا ہے ”جو دنیا کو اپنا دشمن سمجھے“ یہاں لفظ دنیا کا استعمال مغالطہ میں ڈالتا ہے۔ یگانہ نے دنیا کو نہیں اپنا سے زمانہ کو دشمن ضرور پایا۔ کیا اپنا نے زمانہ نے یگانہ کے ساتھ عداوت نہیں برقی اور کیا انھوں نے اس عداوت کے مقابلہ میں اپنے ذاتی جوہر اپنے مردانہ عزم و اعتماد کا ثبوت نہیں دیا؟ یہ تو ایسی حقیقت ہے جسے سب جانتے ہیں۔ یعنی خاص اسباب کی بنا پر وہ معقول ہوں یا نامعقول اپنا نے زمانہ نے یگانہ کے ساتھ بغض و عداوت کا ایسا ثبوت دیا تاریخ میں جس کی مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان و ایران کی ادبی تاریخ میں کوئی ایسا شخص گذرا ہی نہیں جس کے ساتھ اتنی عام اتنی شدید مخالفت برقی گئی ہو۔ یہ واقعہ ہے کوئی

افسانہ تو ہے نہیں۔ ۳۵ سال سے ملک یہ تماشا دیکھ رہا ہے نیا صمت کی وجہ وہی غالب والا معاملہ۔ ایک طرف غالب پرستی۔ دوسری طرف غالب سکتی ایسی شد نیا صمت کی حالت میں کہ دنیا ایک طرف اور شخص واحد ایک طرف یہ امر بالکل فطری تھا۔ یگانہ کے ذاتی عزم و اعتماد کے جو ہر روز بروز گھلتے گئے۔ جذبہ خود داری بڑھتا گیا۔ غلیچوں کی کمزوری اور غلط مبنی ثابت ہوتی گئی۔ بات کا جواب بات سے نہیں دے سکے تو مخالفانہ سازشیں کرتے ہیں۔ بائیکاٹ کے حربے پراثر آتے ہیں۔ پھر ایسی صورت میں یگانہ کو کیا کرنا چاہیے تھا۔ کیا غلیچوں کے آگے جھک جاتے یا بچی نامہ لکھ دیتے۔ جی نہیں ہے بشرہوں میں فرشتہ کیوں بنوں جیسا ہوا چھاپا

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں

کوئی صبا نظر اپنی طرف بدگماں کیوں ہو

ایسی ہستیاں زمانے کے مزاج کو بدل دیتی ہیں۔ یگانہ اب بھی وہی ہیں جو آگے تھے مگر غلیچوں کی جو ہوا بندھی کھی نکل گئی۔ یہ تھا میرزا یگانہ کا کس بل۔ اب ترقی پسندوں کی چھو تہری شاعری اور بلینک درس جیسی غیر طبعی یا وہ گوئی کا تماشا دیکھنا ہے۔

۱۰ فقط غالب سکتی ہی یگانہ کا جرم نہیں ہے اور وہ بات اور وہ اور وہ ۹

یہ ناہمواری ہی ہموار ہو جائے تو کیا کم ہے

زین کج نہیں فرصت تو فکر آسماں کیوں ہو

کام کرنے والوں کے لئے دنیا کے محدود دائرے میں بھی بہت کام ہیں کر سکیے قابل

چلا آتا ہے کب علم سبب عشق سے کینہ

مگر بغض ویرینہ سر منبر بیاں کیوں ہو

اے یہ کیا کہ چاہوں بھی تو حق سے پھر نہیں سکتا

خود اپنے ہاتھوں گمراہی کی کوشش رانگاں کیوں ہو

فطرت سلیم بھی جاوہ حق سے بھگنے نہیں دیتی
He is incapable of
subterfuge & intolerant of untruth.

سمجھ میں کچھ نہیں آتا پڑے جاؤں تو کیا حاصل؟

نمازوں کا ہے کچھ مطلب پر دینی باں کیوں ہو

نماز فقط منہ سے کچھ بول نکال لینے کا نام نہیں ہے۔ نماز کے اس فلسفہ کو مصطفیٰ اکمال پاشا نے خوب سمجھ لیا تھا یعنی نماز زبان غیر کوئی معنی نہیں دیتی جو مال کے رلے زادہ گووند پر شاد آفتاب (یادش بخیر) کا یہ قول بھول نہیں سکتا کہ نماز ادا کرنے کے لئے دل کی زبان چاہیے۔ اللہم صل علی محمد و آل محمد۔

finish peculiar to him. He possessed that particular gift called talent which sees in things some new aspects which others have overlooked.

کہاں خوابِ خیال اتنے؟ حقایق ہر طرف جتنے

نگاہِ نارسا یہ نقدِ فطرت را نکال کیوں ہو

"Facts are stranger than fictions. His talent never perished as a result of the false environment in which he lived. He did not subject himself to the influences working in his age."

یگانہ فکر حاصل کیا؟ تم اپنا حق ادا کر دو

بلا سے تلخ گزرتے زندگانی را نکال کیوں ہو

یگانہ سے بھر گنا کیوں ہے ظالم ماجرا کیا ہو؟

تجلی میں چور ہے ورنہ یہ کھشکاد درمیاں کیوں ہو

غزل ختم ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی فنِ غزل کی ترقی بھی ختم ہو گئی۔ یا شاید یہی کوئی *gem* لکھنے یا دہلی سے اٹھ کھڑا ہو جو میرزا یگانہ کا سچا جانشین ہو سکے۔ یا آرٹ اتنا نازک اور پرستنی ہے *significant & condensed* کہ بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ پر فلسفہ وں بھی کانوں پر ہاتھ رکھ لے لے کہ اسے انگریزی میں نقل کرنا ممکن

کہیں سہمی عبادتِ روح کو بیدار کرتی ہے؟

نماز بے عمل سے حتیٰ نہ سہیہ انگال کیوں ہو

"The sole purpose of religion is to live an honest life."

اک آنکھیں ہیں کہ تکستی ہیں کسی کو ٹکٹا باندھے

یہاں سر ہے نہ سودا ہوتا تو سجا کا نشان کیوں ہو

سر ہے نہ سودا ہے یعنی کیفیتِ خودی باقی ہی نہیں بس اک لوگ ہے۔ یہ ہے سچی بندگی یہ ہے سچی عبادت۔ یاروں کا ضمیر زندہ ہوتا تو شاعر کی ذات پر فخر کرتے اور دیکھتے کہ انسانیت کی تعمیر میں یگانہ کی غزل کا کیا مقام ہے۔
No man was yet a great poet, without being at the same time a profound philosopher, for poetry is the blossom & fragrance of a human knowledge, human thought & language."

تجلی سے اڑ چلے ہیں پر لگا کر خاک کے پتے

خداوند از میں سے پست اتنا آسمان کیوں ہو

"He disploys the appearances of Nature and occurrences of life with the highest touch of

کہاں بلبیل کا یہ نغمہ کہ حال آجائے عارف کو
بھلا اس وجد کے عالم میں مرغ کی ڈال کیوں ہو

کہاں اک صحنہ کا یہ جاودانی آرٹ اور کہاں چھٹ بھٹیوں کا وہ
شور و غوغا؟ بگوں ترقی پسند آئے دن غزل جیسی مکمل ترین صنف کے خلاف
بفاوت کرنا اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، یگانہ آرٹ جیسے تعمیری آرٹ کو بھی
انسانیت کے لئے غیر مفید اور دور حاضر سے الگ ٹھہرانا چاہتے ہیں تو ایسی صورت
میں یہ کیا بے جا ہے اگر ہم ان لوگوں کے چھوٹے ادب پر اور ان کے سب سے بڑے
گرو (جوئنس بلچ آبادی) کی کھوکھلی شاعری اور دیوانی محبت پر خود بدولت
حضرت میرزا یگانہ کے قلم سے روشنی ڈال دین۔

ہرزہ شباب و پے جاوہ شناساں بردار

(غالب) ایکہ در راہ سخن جوں تو ہزار آمد و رفت

"The practice of poetry has become the
exercise of lawless versification. The fact
is that poetry is capable of becoming too much
a thing of fashion to its own undoing. The reader
feels his mind full but learns nothing
when their high sounding words sink
into sense."

ادبِ خلیفہ

(راز میرزا یگانہ چنگیزی)

گزشتہ پچیس سال سے ادبِ جمیل - ادبِ لطیف - ادبِ جدید وغیرہ کے
بھیس میں اک ادبِ خلیفہ رنگ بدل بدل کر گیا ہر بھونگ چار ہا ہے۔ کدھر
گیا ناول نویسی اور ناول فروشی کا وہ دور - کدھر گئی سیکور جیون کی وہ تقلیدی
روحانیت - کدھر گئی غلجیوں کی وہ شرح نویسی وہ ادبی تجارت اور کدھر چلے
کوہے یہ نیا ادب؟ کہاں تو وہ غالب پرستی - وہ سیکور پرستی اور کہاں ادبِ خلیفہ
کی یہ نفس پرستی یہ ہر بھونگ؟ سچ تو یہ ہے کہ اس نئے اور گندے ادب کی
مجرمانہ اشاعت میں چھوٹے مصنفوں سے زیادہ ملک کے اخباروں اور رسالوں
نے حصہ لیا اور پیسہ پیدا کیا۔ پریس والوں نے ہی اپنے سرمایہ کے زور سے اس
خباثت کو اتنی ترقی دی اور آج بھی پریس کو اپنے اس مجرمانہ فعل سے
سے شرم نہیں آتی۔ ابتدا میں ٹوٹے پھوٹے بولوں مثلاً:-

گائے جابجاے جا	ملچے جانچائے جا
برے جا برسائے جا	دھڑی سیر لگائے جا
ہیں سنترے کوہی بھرے	لقا کبوتر کس بھرے
کیا رس بھرے کیا کس بھرے	

اس قسم کی خلفات کو شاعری کی حیثیت دے کر نہایت نمایاں طور پر حلی قلم سے اخباروں اور رسالوں نے پھاپنا شروع کیا۔ اور اس امر کی کوئی پروا نہ کی کہ آیا یہ خرافات چھاپنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ ہر اور غزل کو جو صدیوں کے زنگار نگ انقلاب کے بعد بھی آج تک زندہ ہے، زندہ ہی نہیں بلکہ بلند سے بلند تر ہوتی گئی، پریس والے محض نئے فیشن کی سڑی گلی نظموں کی خاطر کوئے کھدرے میں ڈالتے گئے۔ حالانکہ اس ۲۵ سالہ مدت سے بہت پہلے غزل کا اصلاحی دور خان بہادر مولانا شاہ عظیم آبادی کے ہاتھوں شروع ہو چکا تھا۔ اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ گزشتہ چھتیس سال کی مدت میں اردو کی جدید غزل گوئی فلسفیانہ مذاق کی رہبری میں ارتقا کی منزل طے کرتی ہوئی ایک صدی کے ہاتھوں آرٹ کے اس مرتبہ کمال پر پہنچ گئی کہ دنیا کے کسی لٹریچر کے سامنے کوئی شرم کمتری محسوس نہیں کر سکتی۔ وہ مقام جو آیات و جلال کی بدولت غزل کو حاصل ہوا (دوسرا کون ہو سکتا تھا؟ کس میں اتنا دم تھا؟) کے ایسا شاعرانہ شعور ملا تھا جو غزل کو نئی زندگی بخشا اور ترقی دے کر آرٹ کے مرتبہ پر پہنچا دیتا؟ اتنا بلند اتنا مشکل ہے کہ ایسے دے چھٹ بھٹیوں کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ غزل کے معیار جدید کے اس قدر بلند اور مشکل ہو جانے کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ نظم بازی آسان ہو گئی۔ اور ایک آسان سستا اور گندہ ادب چل نکلا۔ پہلے تو اس نئے ادب میں نیکامین بیڈھنگاں ہی تھیں۔ رفتہ رفتہ شہدین بھی داخل ہوتا اور بڑھتا گیا۔ پریس والوں نے اپنے

صفحات کی شکم پری اور چند ٹکوں کی خاطر اس نئے ادب کو اتنا اچھا لا کتا کہ اس نے ایک ادبِ شانہ تخریبی تحریک کی صورت پکڑ لی۔ اس طرح ادبی اور سماجی تخریب میں نئے نئے ناشاروں سے زیادہ پریس نے بد خدمتی اور *Poisoner of Pleasure* کا حق ادا کر کے اپنا نام اعمال سیاہ کر لیا اور کسی نے پریس سے مواخذہ نہ کیا۔ نئے نئے حشرات الارض نے ذہنی عیاشی کے شوق میں اپنی چھوٹی شاعری کو بیکاری کا مشغلہ بنا لیا۔ پریس والوں نے اپنی گرہ سے دام خپ کر کے اس گندے ادب کو اچھلنا شروع کیا جس کا دہریلا اثر ہندوستان کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر دہی ہوا جیسا بقول ڈاکٹر جانسن انگلستان کے لڑکوں اور لڑکیوں پر پنڈاری شاعری کا ہوا تھا۔ مگر گورنمنٹ کو کیا پڑی تھی کہ ہندوستانی ادب۔ ہندوستانی تہذیب۔ ہندوستانی اخلاق ہندوستانی نسوانیت کی تخریب پر پریس کو سزا دیتی؟

اس کے ساتھ ساتھ دوسری بد خدمتی پریس نے یہ کی کہ اخباروں اور رسالوں میں جو ادبی و تنقیدی مضامین، زبان اور فن شعر کے متعلق جو مباحثے اور اعتراضات وغیرہ شائع ہوا کرتے جن سے ادیبوں اور شاعروں کو زبان دانی اور اکتساب فن میں مدد ملتی تھی، مدد کیا درس ملتا تھا، اور عام اردو بولنے والوں کو معلومات حاصل ہوتی تھی ان سب کی اشاعت بند کر دی۔ نئے فیشن کی جالیاتی یادہ گوئیوں

اور نفسیاتی تحلیل کے بہانے سے گندے افسانوں نے ادبی رسالوں اور اخباروں پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ادبی مباحثوں، زبان اور فن کی معلومات کے لئے کوئی نجاش یا تنبیہ نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سچے اور معتبر اہل سخن، زبان اور فن کے جاننے والوں کی تعداد میں اضافہ تو کیا ہوتا مگر اہل فن بقدر امکان کام کر رہے تھے وہ بھی دائرہ ادب سے خارج کر دیئے گئے یا کنارہ کش ہو گئے۔ گزشتہ پچیس تیس سال میں پریس کو اور ملک کے حشرات الارض کو اس تخریبی عمل میں یقیناً گامیابی ہوئی۔ اس غدا رسی۔ اس بد خدمتی۔ اس احسان فراموشی پر وہ جتنا چاہیں ناز کر لیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ ادب خلیت کوئی سنجیدہ تعمیری تحریک نہیں ہے محض تخریبی ہنگامہ آرائی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ارکان بعض سیاسی جماعتوں کے ایجنٹ ہیں جو رشوتیں لے لے کر اردو کی تخریب پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ یادہ لوگ ہیں جو دہلی اور لکھنؤ کے ناعاقبت اندیش اہل زبان کی دل شکن خود غرضانہ حرکتوں سے بیزار ہو کر انتقام پر تل گئے ہیں۔ بیشک ان خجائگر اہلوں نے یہ کر کے دکھا دیا کہ دیکھو ہم اسلاف کے علمی و فنی اکتسابات کو یوں کٹو کر بر مارتے ہیں۔ دیکھیں یہ دلی اور لکھنؤ والے ہمارا کیا بنا لیتے ہیں۔ یہ ان نام نہاد ترقی پسندوں کا ذہنی پس منظر۔

ان ادبی غدا روں کی بد منتی کا روشن ثبوت یہ ہے کہ الگ غیر فطری غیر طبعی یادہ گوئی (بلینک ورس) کو خواہ مخواہ "شاعری" کے نام سے موسوم کر کے رواج دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور پریس بھی ان کا

تشریک کار بلکہ طرہ حصہ دار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تخریبی کارروائیاں ہیں اور تخریب کی رفتار جتنی بھی تیز ہو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مگر ڈاکٹر جانسن کا یہ قول یاد رکھو۔

"کسی ناپسندیدہ موضوع پر بلینک ورس نفرت فرید کا اضافہ کر دیتی ہے ناظرین پڑھنے پر آمادہ بھی ہوں تو بلینک ورس کی وجہ سے گھٹن آنے لگتی ہے۔"
The disgust which blank verse superadds to an unpleasant subject, repels the reader however willing to be pleased."
(Dr Johnson)

پھر ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں۔

بے ڈھنگی بے قاعدہ تنگ ہندی نے ہتی مغزوں کے نقص کو اس طرح ہمارا کھاتھا، محنت سے جی چرانے والے کاہل اور سست دماغوں کو کچھ ایسا ادا کیا تھا کہ ملک میں جدمرد دیکھو شعر و سخن کی کتابیں ایسے ہی تکیوں کی مانند یوں سے بھری پڑی تھیں۔ تمام لڑکوں اور لڑکیوں میں ہی دل بہلاؤ کا پس پس گیا تھا۔ جنھیں کچھ آتا جاتا تھا وہ بھی پنڈار کی طرح کچھ نہ کچھ کہہ دیتے تھے۔ متقدمین کے حقوق پر ان لوگوں نے دھاوا بول دیا تھا اور قائم شدہ نظام و رسوم برہم کر دینے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ کوئی نصف سدی پہلی پنڈارین غالب رہا مگر آخر کار رفتہ رفتہ مٹ گیا۔

ان لوگوں کے خیالات میں جدت و تازگی تو پائی جاتا تھی مگر زبان سے بالکل بے پردائی برتنے کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات بھی بس ایسے معلوم ہوتے جیسے کوئی گھٹیا قسم کا کپڑا مگر دیکھنے میں شاندار۔
 "The lawless varification (مکمل بند) so much concealed the deficiencies of the barren & flattered the laziness of the writer, that it overspread our books of poetry, and caught the pleasing fashions; & they that could do nothing else, could write like Pindar. The rights of antiquity were invaded & disorder tried to break into established order. Pindarism prevailed about half a century but at last died down gradually. The thoughts are often new & striking, but the total negligence of language gave the noblest conception the appearance of a fabric, august in form but mean in material."

اسی سچی موسیقی اور سچی شاعری سے روح جتنی بالیدہ ہوتی ہے اچھوٹی سے اتنی ہی لغت کرتی ہے کسی بے سببی عورت کا اپنا نام کسی بے گڑے شاعر کا اپنا نام بھی دلا۔

۱۵ اپنی زبان اپنے ادب کا درد تو انھیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جنہوں نے اس کام کے لئے اپنی زندگی جو غیر ذرا آقا فیول کو اسکا درد بکریوں پر وہ تو اس خوشی کے لئے معرہ جاتے ہیں کہ تقدیر اس کی لکھو تباہ ہو گیا، ولی اگر کسی۔

"خدا جانے فیض کون صاحب میں گھر رزقی پسند ہیں۔ دیکھئے یوں شاعری فرماتے ہیں۔"

(۱) بول کہ لب آزاد ہیں تیرے (۲) بول زبان اب تک تیری ہے۔
 (۳) بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے۔ (۴) بول کہ سچ زندہ ہے اب تک۔
 (۵) بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے۔

بول بول ارے بول بول۔ جی ہاں یہ ہے گویا شاعری اور ترقی پسند شاعری مثال کی نہ سم کی نہ سکر کی۔ دیکھئے خبردار اسے نثر نہ سمجھئے۔ یہی تو انقلابی شاعری ہو۔ اسی میں تو ملک کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔ تھوڑا

کیا واقعی یہ کوئی سنجیدہ فعل ہے یا تسخیر؟ کیا واقعی کوئی باحواس آدمی نیک نیتی کے ساتھ ان ٹوٹے پھوٹے بولیوں کو سچی شعر کی حیثیت سے پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ یہ تو ایسے اکھڑے اکھڑے بول ہیں کہ شکر کی حیثیت سے بھی کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ کیا کوئی نیچے درج کا طالب علم اس قسم کے بولوں پر سو میں پانچ نمبر بھی پاسکتا ہے؟ کیا ان میں پچھو پھرین کے سوا کوئی ادبی سلیقہ پایا جاتا ہے؟ ان بے تکے بے قافیہ بولیوں کو شعر کی حیثیت سے پیش کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ فن شعر کے ساتھ دہلی دیکھنے کے ساتھ جان پوچھ کر تسخیر کیا جا رہا ہے۔ دل لگی تو یہ ہے کہ راشد صاحب انھیں بولیوں کو بڑی زبردست قسم کی شاعری باہر کرانا چاہتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ "احساس کی تلخی ان اشعار میں پوری شدت پر ہے (جی ہاں یہ سب گویا اشعار ہیں اور بڑے شدید اشعار ہیں) یہاں تک کہ فیض کے ذہن میں بسی ہوئی موسیقی بھی (بھلا ایسے

شخص کو موسیقی سے کیا بہرہ ہو سکتا ہے؟ اس تلخی کو مٹا کر ان الفاظ کو خالی
تغزل میں تبدیل کرنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ جی ہاں مدعی مست گواہ چیت۔
غزل پر چلے دل کے پھچھو لے پھوڑ لینا۔ جھوٹ موٹ کی چوٹ کر جانا تو ترقی پسند
کی بندھی ہوئی پالسی ہے۔ چاہے غزل پر چوٹ پڑے یا نہ پڑے۔ بھلا اس قحز
کا کیا جواب ہے۔ قلم اٹھایا اور لکھ ماری جان بوجھ کر اک بے معنی سی عبارت
تاکہ لوگ اس اوٹ چٹانگ عبارت کو پڑھ کر کھسیا لے ہوں اور آپ راشد صاحب
اور ان کے مجھے باندے دل ہی دل میں خوش ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قسم
کی رشوت لے کر دکھیتی دنیا کو الٹو بنانے کے لئے نقس کے پھیکے سیٹھے بولوں
کی باد ہوائی تعریف کر دی گئی ہے۔ یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے دہقانی بچے
افلاطون کو کھسیانا اور دیوانہ بنائیں۔ منہ چڑھائیں اور چونچ بتائیں۔

اچھا آئیے اب اس بات پر بھی غور کریں کہ آیا اردو۔ فارسی۔ عربی بولنے
والی قومیں وزن عروضی اور قافیہ کے بغیر شعر کا تصور بھی کر سکتی ہیں؟ ہرگز
نہیں۔ ان تینوں زبانوں میں قافیوں کی اتنی کثرت ہے کہ شعر کا تصور قافیہ کے
بغیر ہوتا ہی نہیں۔ ہاں انگریزی زبان کو اذان عروض کی خامی اور قافیوں کی
تہی دستی کے سبب بلینک درس کی ضرورت پڑے تو اسے معذور سمجھنا چاہیے
ڈاکٹر جائن کو ادیب کو انگریزی زبان میں عروض اور قافیہ کی خامی اور
تہی دستی (*lack of rhyme and imperfect metres*)
کا احساس و اعتراف ہے۔ مگر اردو زبان کو اس خامی اور تہی دستی کی شکایت
تو ہو نہیں سکتی۔ یہاں تو عروضی بحر اور اذان کا وہ تنوع اور قافیہ کے اقسام کی

دہ کثرت ہے کہ ہر صنف میں اک حقیقی شاعر اپنا کمال دکھا سکتا ہے۔ دراک
ناشاعر بھی وزن اور قافیہ کی پابندی کے ساتھ اظہار خیال کر سکتا ہے اور کرتا
ہے۔ یہاں تک کہ جاہل اور گنوار دہقانی بھی قدرتی طور پر قافیہ جوڑ لیتا اور
گیت بنا لیتا ہے۔ ایسی صورت میں بلینک درس کے چرچے پڑھ لکھے تعلیم یافتہ
لوگوں کی زبان سے کس قدر شرمناک ہیں۔ کتنی نااہلی کس قدر شرارت کی دلیل
ہے۔ ہر زبان کا طبعی اقتضا جدا گانہ ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ غیر زبان کا فیشن
اختیار کرنا (بلا ضرورت) پر اسے تشکون کے لئے آپ اپنی ناک کاٹ لینا
ذہنی غلامی یا شامت اعمال نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

ڈاکٹر جائن ہی قول ہے کہ قلم کو صحیح اور موزوں ٹرنے والے بھی معدودہ خیل
ہیں جو اس کی بلینک درس کو اس صفائی سے موزوں پڑھ سکیں کہ سننے والے کو
اس بات کی تمیز ہو جائے کہ اس کا ایک مصرع کہاں پر ختم ہوا اور دوسرا کہاں
سے شروع ہوا۔ واہ واہ واہ۔ یہ کیا شاعری ہے؟ اور سنئے۔ کیا مزے کی بات
ہے۔ ڈاکٹر صاحب رسوف فرماتے ہیں کہ ایک ذہین نقاد نے کیا خوب کہا
ہے کہ بلینک درس کے مصرعے فقط آنکھوں ہی کو مصرعے معلوم ہوئے ہیں

یہ حال ہے بلینک درس کا کہ اک اہل زبان انگریز ملٹن کی نظم پڑھ کر سنا تا ہے
انگریزوں کو ملٹن اس پر بھی سننے والوں کو تمیز نہیں ہوتی کہ ایک مصرع کہاں پر ختم ہوا
اور دوسرا کہاں سے شروع ہوا۔ پھر ایسی صورت میں ہندوستان کے گنوار اور جاہل
ترقی پسندوں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ ملٹن کی شاعری کو شاعری سمجھیں؟

بلیک ورس میں نہ تو نثر کی روانی ہوتی ہے نہ موزوں مصرع کا سائز نم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلیک ورس پڑھنے سے جی اکتا جاتا ہے۔ Blank verse, said an ingenious critic, seems a verse only to the eye. Blank verse has neither the easiness of prose nor the melody of numbers, & therefore it is tiresome."

دیکھئے یہ ہے بلیک ورس سے نفرت کا ثبوت خود انگریزوں کے قلم سے۔ تو پھر اردو زبان کو ایسی لغویوں ایسی غیر طبعی یا وہ گوئیوں کی کیا ضرورت ہے؟ خصوصاً اردو زبان میں تو فارسی اور عربی سے بھی زیادہ قافیوں کی کثرت ہے۔ پ۔ ٹ۔ پچ۔ ڈ۔ ٹر۔ گ۔ اتنے حروف کی زیادتی سے قافیوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی ہے۔ جب یہ حروف، حرف روی پھرتے ہیں یعنی ان پر جب قافیہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو ایسے عجیب غریب معنی خیز اور بولتے ہوئے قافے نکلتے ہیں جو فارسی اور عربی میں ممکن نہیں۔ قرآن اگرچہ نثر ہے، پھر بھی عربی زبان کے طبعی اقتضا سے اس نثر میں بھی قافے کتنے چست نظر آتے ہیں۔ اس کثرت کی وجہ سے عربی اور فارسی زبان اور سب سے زیادہ اردو زبان میں قافیہ شعر کے لئے اک طبعی ضرورت کا حکم رکھتا ہے۔ بغیر اس کے شعر کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ شعر کی اس طبعی ضرورت کے

جو انکار کرے سمجھ لو وہ جھوٹا ہے۔ یا اس کے دماغ میں کوئی پیدائشی قوت ہے کہ وہ قافیہ کی اہمیت کا احساس نہیں کر سکتا۔ اسی شعر تو شعر ہے کہاوتیں اور مثلیں بھی قافیوں سے بھری پڑی ہیں مثلاً
خزانی بچہ کبھی بیٹھا۔ اونچی دکان پھیکا پکوان۔ اندھی نگری چوٹ راج۔
ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاج۔

دیکھ لو ان کہاوتوں میں قافیہ کی پابندی کے ساتھ کتنی چچی تلی باتیں ہیں۔ کتنی معنویت کتنی شعریت ہے۔ حالانکہ یہ سب نثر کے فقرے ہیں۔ گنوار سے گنوار دھقان بھی اپنے طبعی ذوق کی بدولت قافے جوڑ کر گیت بنا لیتے ہیں اور یہ عین فطرت ہے۔ جھوٹے ترقی پسند جو عروض و قافیہ کی پابندی کو ”نظمی قید“ کہہ کر شعر کو اس قید سے آزاد کرانا اور بلیک ورس کو رواج دینا چاہتے ہیں۔ وہ فی الحقیقت انسانی فطرت اور اردو زبان کے طبعی اقتضا سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وہ نکتے۔ بے بہرہ۔ محروم ان قسمت لوگ ہیں جو سچے اور حقیقی سخنوروں کے وہی کمالات کے سامنے اپنی بے بضاعتی اپنی نارسائی اپنی محرومی کا احساس کر کے شرم اور حسد کے مائے اس نظام شعر و سخن ہی کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں جو صدیوں کے تدبیر کی نشوونما کے بعد مرتبہ کمال کو پہنچا ہے۔ ایسے ترقی یافتہ نظام کو چیلانا یا اس کے ساتھ چلنا یا خود کوئی ایسا نظام قائم کرنا ان کی بس کی بات نہیں تو کم از کم اسے ڈھاکر شیطانی قوت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ کس کام کی یہ بدنیتی؟ کھو

عروض ہو یا قافیہ۔ علم زبان ہو یا علم معنی و بیان۔ یہ سب امتداد از ملکی پیداواری ہیں

کوئی بھید ہے۔ یا تو وہ کسی ایسی جماعت کے ایجنٹ ہیں جو اردو کی تخریب کے لیے ہیں۔ یا وہ درجی لکھنؤ کے اہل زبان کی فنی بازیوں سے چڑھ کر اردو شاعری کی تخریب پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اس بلینک دس میں کچھ پڑن کے سوا ہرگز اتنی صلاحیت نہیں کہ کسی ذہن پر شعریات کا نقش بٹھاسکے۔

جھوٹے ترقی پسند خواہ مخواہ یہ جتایا کرتے ہیں ہر تحریر و تقریر میں نہی فرسودہ راگ الاپا کرتے ہیں کہ زمانہ بدل رہا ہے سانج کی روش بدل رہی ہے اس کا اثر ادب پر بھی پڑنا لازم ہے اس وجہ سے شاعری کے اسلوب بھی بدل رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ کون نہیں جانتا کہ زندگی کے ہر شعبہ میں تغیرات ہو رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے اعلیٰ و ادنیٰ سب دیکھ رہے ہیں کہ زمانہ کس تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ اور سب کے سب زمانہ کے ساتھ کم و بیش بدلتے جا رہے ہیں۔ مگر شاعری کے معاملہ میں (میں فخر کی نہیں کہتا) جھوٹے ترقی پسندوں کے منہ پر تو یہ بات زیب نہیں دیتی کیونکہ انھوں نے کوئی صحیح راہ ترقی نکالی ہی نہیں۔ ترقی یافتہ شاعری کا کوئی اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہی نہیں۔ یہ کام تو آیات و جدائی کے مصنف نے کر دکھایا۔ اسلوب بیان انداز فکر۔ نوعیت موضوع۔ حقائق زندگی پر فلسفیانہ و شاعرانہ تصرف الغرض مختلف حیثیتوں سے ترقی دے کر غزل کو آرٹ کے مرتبہ پر پہنچا دیا اور دو ٹوکوں کے لٹریچر میں آرٹ کی یہ پہلی مثال ہے۔ یہ ہے صحیح اور تعمیری جدوجہد اور اسے اغماض و انکار کرنا یا اردوں کی بندھی ہوئی پالیسی ہے۔

مگر ان لوگوں نے کیا کیا؟ بد نظمی اور گند پھیلا کر فتوریت کا ثبوت دیا۔

ترقی پسندوں کے اسٹیغوی میں کہ شاعری کا اسلوب بدل رہا ہے ان کی تہی مغزی ان کے ذہنی افلاس کا ثبوت موجود ہے۔ خود انھیں کے دعویٰ کے بموجب ان کی تنگ بندی معنوی حیثیت سے ترقی نہیں کر رہی ہے فقط اسلوب یا ڈھانچہ یا کینڈا بدل رہا ہے۔ گول سے لمبا یا چٹا بن رہا ہے بس یہی ہے انکی کارگزاری ایسے بگڑے لوگوں کے بارے میں ڈاکٹر جانسن کہہ گئے ہیں۔

"They only aspire to take a new road, even when that road leads nowhere"

نئے اسلوب کا اک نمونہ اور لحاظ ہو:-

۱۔ باد صبا کے ہلکوروں میں تپن ہوا تبدیل ہوئی۔

۲۔ پھول کھلے (یہ گویا دوسرا مصرع ہے۔ تھو)

۳۔ متنی چھائی (یہ گویا تیسرا مصرع ہے۔ تھو)

۴۔ مریحبات کنول شاداب ہوئے۔

۵۔ میں ہوں بے دل

۶۔ مایوس

۷۔ ایک

۸۔ بچارا

یہ سب گویا اٹھ مصرعے ہیں۔ انھیں تلے اور لکھ کر اک بند قرار دیا گیا ہے اور گویا اک کا دھم سی شکل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ گویا شاعری کا اسلوب بدل رہا ہے۔ تھو۔

کیا اس فضول سی مکتوبی جدت، طفلانہ یا مجنونانہ حرکت سے شعر و ادب کی معنوی ترقی ثابت ہوتی ہے؟ کیا اس میں ذرا بھی ادبی سلیقہ پایا جاتا ہے؟ یس۔ بیدل۔ بچارا۔ پھول کھلے۔ سستی چھائی وہی پرانی کھوسٹ باتیں نہ کوئی تنازگی نہ ترقی۔ یہ سب کیا ہے؟ ادب کے ساتھ تسخر ہے۔ دیکھتی دنیا کو الوبنا ہے۔ کیا ان خرافات سے جھوٹے ترقی پسندوں میں کوئی اعلیٰ ذہنی استعداد کا پتا چلتا ہے؟۔ بنواری لال شعلہ کا یہ شعر یاد رکھو۔

عجاز سخن جیسے پتے جان سخن میں قالب کا بدل دینا کہ امانت نہیں ہر اسلوب۔ ڈھانچہ۔ یا کیتھا بدل دینا۔ گول کو لمبیا یا چٹا۔ ٹیکو نایا چوکور بنا دینا کوئی بڑی کارگیری نہیں ہے۔ شعر و سخن کا شوق ہے۔ نام و نمود کی تمنا ہے تو ذوق صحیح۔ اکتساب فن۔ اردو زبان کو جانتے کی طرح جاننے اور بے تکلف اردو بولنے کی شرطیں نہایت ضروری ہیں۔ ان کے بغیر نہ کوئی دستگاہ حاصل ہو سکتی ہے نہ کوئی تعمیری انقلاب ہو سکتا ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ہر بھونگ ہے اور ہر بھونگ کی زندگی کتنی؟

سیاب صاحب کہتے ہیں ڈاکٹر اقبال کے بعد پنجاب کا ادب وارہ ہو گیا۔ مگر ڈاکٹر اقبال کے بعد کیا معنی؟ ان کے انتقال کو چھ سو سال ہوئے ہیں۔ آوارگی گمراہی تو ان کی زندگی ہی میں بھل چکی تھی۔ اور انھیں کی تو جی سے بڑھتی گئی انھوں نے کوئی نرگاہ ہدایت کوئی روک تھام نہیں کی اقبال کو ادب اردو کی کچھ ایسی پروا تو ہی نہیں۔ دیکھا دیکھی ان کی امت بھی بے پروا و مطلق الغان ہو گئی۔

لے زمانہ سازی کے خلاف بازمانہ ستیز کا فقط زبانی سبق ڈاکٹر نے دیا مگر عمل سے کبھی ثابت نہ کیا کیونکہ خیازہ اٹھانا پڑنا اور بھی نہ ملتا۔ یہ تو میرزا بیگانہ ہی کا وصی تھا کہ اپنی مجاہدانہ زندگی سے قدم قدم پر بازمانہ ستیز کا عملی ثبوت دیا۔

ان کا مرکز توجہ تو حجاز تھا۔ ہندوستان سے محبت کیوں ہوتی؟
ادب اردو کی نگہداشت ڈاکٹر اقبال کا مقصد زندگی تھا ہی نہیں۔ وہ تو اک اندر ہی اور سیاسی آدمی تھے۔ اسی میں وہ پڑے رہے۔ اردو شاعری کے لئے جس باقاعدہ اکتساب فن کی ضرورت ہے اُس کی طرف سے چشم پوشی کر کے گمراہی کا بیج تو ڈاکٹر اقبال ہی بو گئے۔ ان کی بے پروائی سے نااہلوں کو جراتیں بڑھتی گئیں۔ ادب کے اصول و ضوابط توڑ پھوڑ کر بد نظمی پھیلا دی گئی۔ یہ نتیجہ ہوا جدید نظم مابری کا۔ اس طرح گویا اہل زبان کی شیخی باز یوں کا انتقام لیا گیا۔ نظم کی صفت میں بڑی ترقی کی گنجائش ہے۔ مگر رہنے کا سلیقہ بھی تو ہو۔ فن کو فن کے طور پر کرنا بھی تو آئے۔ ترقی پسندوں کے دستور العمل میں فن شعر کو فن کی حیثیت سے ترقی دینے کے لئے کوئی دفعہ رکھی ہی نہیں گئی۔ بلکہ اس کے برعکس زبان لے جوش خاں نے کیا خوب کہا ہے شہ سب جہاں تیرا مگر ہندوستان تیرا نہیں۔ رسالہ آجکل دہلی ۱۵ جولائی ۱۹۵۷ء کے صفحہ ۲۵ پر نامہ نگار کا یہ قول قابل غور ہو۔ ”لیکن میرزا صاحب کا یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ اقبال کو ادب اردو کی کچھ ایسی پروا بھی نہ تھی۔“ اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ اقبال نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ اردو زبان ان کے پیغام کی تحمل نہیں ہو سکتی۔ جس اردو نے اقبال کو اقبال بنایا۔ شہرت قبولیت کی منزل پر پہنچا یا ان کے متعلق اقبال کا یہ ارشاد دلیل ہے اس بات کی کہ اُسے اردو کی پروا نہ تھی۔ ورنہ وہ اردو کو اس قابل بناتا اپنے صوبہ کی زبان کو سنبھالتا اور اپنے بعد آنوالے شعر کی رہنمائی کرتا تو ایک سیاب ہی کیا کسی کو یہی یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ اقبال کے بعد پنجاب کا ادب وارہ ہو گیا۔

۱۵ میں نہ بھی نظم کا مخالف تھا نہ اب ہوں۔ ہاں بے ہنری۔ پھوٹن۔ بد نظمی اور ادب اشکی دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔

اور فن کی تخریب میں بڑی سرگرمی سے کام لیا جاتا ہے۔ خصوصاً ادب کی اعلیٰ اور مکمل ترین صنف غزل سے مخاصمت اور بغاوت کرنا اس کی تخریب کے درپے رہنا ترقی پسندوں کے دستور العمل کی سب سے اہم دفعہ ہے اور بریس والوں نے اس تخریب میں ان لوگوں کی زیادہ سے زیادہ امداد کی ہے۔ ترقی پسندوں کے سب سے بڑے گرو جوش خاں فن غزل اور غزل گو یوں کے جیسے مخالف ہیں وہ ملک سے پوشیدہ نہیں۔ آج سے اٹھائیس برس پہلے خطہ پاک وہلی کے ایک شخص گمراہ عظمت اللہ خاں دہلوی نے غزل کے خلاف رسالہ ہمایوں لاہور میں جیسا زہر اگلا تھا، ہنر پر عیب کا رنگ چڑھا کر، غلط فہمی پھیلا کر، یہاں تک لکھ مارا تھا کہ غزل کی بے مکان گردن مار دینی چاہیے۔ وہ بکواس ہیں یاد ہے۔ بعد ازاں اسی آواز پر جوش خاں اور ان کے دھڑے کے لوگوں نے آواز بلند کی۔ رفتہ رفتہ ترقی پسندوں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور مسلسل پروپیگنڈا کرنے لگے۔ گویا غزل کو فنا کر دینے ہی میں ان لوگوں کی زندگی کا راز منہاں ہے۔ جی ہاں ہنرمندانِ بزمِ ندو بے ہنراں جائے اینٹاں گیرند۔ یہ نا عاقبت اندیش لوگ کس دھڑائی سے اپنی تحریر و تقریر میں شیخیاں بگھارتے رہتے ہیں کہ غزل گوئی کا دور ختم ہو گیا۔ غزل مر گئی۔ دفن ہو گئی وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ یہ امر ناممکن ہے کبھی ایسا نہ ہوگا۔ ارے میاں فرض کرو غزل مر بھی گئی۔ یا ہندوستان میں فارسی زبان مر گئی اور سلطنتِ مغلیہ بھی مر گئی تو اس پر بغلیں بجانے کا کیا موقع ہے؟ قدرت کا کھیل دیکھو کہ عظمت اللہ خاں نے جن دنوں غزل کی گردن مار دینے کی آواز بلند کی تھی اسی زمانے میں میرزا یاس عظیم آبادی کے ہاتھوں لکھنؤ میں

غزل پر دان چڑھ رہی تھی اور آج نگاہ آرٹ کی صورت میں جو مرتبہ کمال حاصل کیا ہے وہ ظاہر ہے۔ مزہ تو یہ ہے کہ یہ جھوٹے ترقی پسند خود فراموشی سے رکھتے ہیں کہ کسب کمال سے جی چراتے ہیں۔ چارہی دن میں مجلس میں برس گئے ہیں میں شاعر۔ ادیب۔ علمبردار انقلاب وغیرہ سب پیچھے بن جانا چاہتے ہیں۔ مگر کچھ نہیں بنتے۔ بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ ہاں گزشتہ پچیس سال سکی تخریب کو ششوں کا یہ نتیجہ تو نکلا کہ اردو شاعری کا سچا شاعر نہ ہو گیا۔ افسوس کیا توقع کی جائے ایسے غداروں سے جن کے قول و فعل میں مطابقت نہیں جن کا کیر بکیر مضبوط نہیں۔ جن میں خلوص کا پتا نہیں ہے تو بنا یا ہے ترقی پسندوں کا اور کر تو ت ایسے کچھ۔ ان حشرات الارض کا نعرہ انقلاب۔ یہ انقلابی ڈھول۔ یہ ہڑ بھونگ نتیجہ تو ہے اسی زمانے کی اچھل کا۔ مگر ہڑ بھونگ پھر ہڑ بھونگ ہے۔ کب تک نہ رہ سکے گی۔ اس جھوٹے اور قتلی انقلاب پر بھی اک دن انقلاب آجائے گا۔ اس ہڑ بھونگ سے ادب کو جو نقصان پہونچا سو پہونچا، مگر افسوس ہے اس ادبِ حبیث کے ہاتھوں ہندوستان کی پاکیزہ سوانحیت کی مٹی پلید ہو گئی۔ نئے نئے جھوٹے ترقی پسندوں نے شہدین کے ساتھ عریانی۔ فحاشی۔ اوباشی کی وہ گند پھیلائی کہ خود انسانِ دنیا بھی آلودہ ہو گئی۔ عورت کی ظاہری شکل و صورت اور اندر دنی حالت کا گہرا مطالعہ، رنگ رنگ کا تجزیہ کر کے ہندوستان کی پاکیزہ سوانحیت کو بازار میں ننگا کر چھوڑا ہے۔

مکلف بظرف صبا اگر ایسے ہی نازک ہو (مرزا قاسم) ہیں لونور کے کٹرے نہ جلی ہو بلبل ہو۔
 اک ریڈیو اسٹیشن سے زنانه مشاعرہ نشر ہو رہا تھا۔ داد دینے والیاں
 خوب خوب فقرے چست کر رہی تھیں۔ ہٹل والے سن سن کر منہں رہے تھے
 اک لڑکی شرمیلی آواز سے "عاشقانہ غزل سنا لے لگی تو اک دوسری لڑکی نے
 پکار کر کہا۔ ہاے ہاے کیا پیارا نکلا ہے۔ جی چاہتا ہے مجھ چوم لوں۔ ہٹل
 والے یہ سن کر کھل کھلا پڑے۔ وہ مارا۔

وہیں اک وکیل صاحب بھی بیٹھے سن رہے تھے۔ مونچھوں پر تاؤ دے کر
 لوٹے دیکھ لینا اک دن یہی چھو کر یاں فلم اسٹار بن کر نکلیں گی۔ اس وقت
 دیکھ لوں گا ان سب کو۔ یہ ہے ترقی پسندی کی لعنت۔ حقو۔

(۲)

خیر اتنا تو ہوا کہ زلفی صاحب نے نفس معاملہ یعنی جھوٹے ترقی پسندوں
 کے نیچے پن بچھو پڑپن اور ان کے نئے ادب کی خیانت کو تسلیم کر لیا۔
 صاحب موصوف کو اس امر کا بھی علم و احساس ہے کہ ہندوستان کے شاہیر
 علماء و فضلا و ادباء اور ثقافت اس گدے ادب کو نفرت سے دیکھتے ہیں۔
 اس ضمن میں زلفی صاحب نے میرے "علم و فضل و فہم و فراست" کو
 بھی سراہا ہے۔ یہ ان کی مہربانی ہے۔ مگر میں اپنی علم و فضل کی حقیقت سے
 بے خبر نہیں ہوں۔ ہاں اپنے آرٹ اپنی ذات۔ اپنے خلوص پر بھروسہ ضرور
 رکھتا ہوں۔

زلفی صاحب کا یہ کہنا بھی اک حد تک صحیح ہے۔ کہ خود ان لوگوں کو جو

ترقی پسند ادب کے حامی ہیں "ترقی پسندوں" کی خیانت کا اعتراف ہے۔
 مگر جب تک جوش خاں اور ان کے ساتھی اس خیانت کا اقرار نہ کریں ڈاکٹر
 عبد العظیم صاحب کا اعتراف کرنا کافی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نظم گوئی کو
 نمایاں ترقی دینے کے علاوہ جوش خاں نے ملک کے نوجوان لڑکوں اور
 لڑکیوں کو ڈنکے کی چوٹ عریانی و ادب باشی کا جو سبق دیا اور ان کے ساتھ جگر
 کی سستی جنسی شاعری نے نوجوانوں کی ذہنیت میں جیسا زہر چھپکا دیا
 اسے تازہ بخلا نہیں سکتی۔ یہی نہیں بلکہ شعرو سخن کی علمی و فنی حیثیت سے
 بے پردائی برت کر ان اصحاب نے نوجوانوں میں اور زیادہ گمراہی و بے الہوسی
 پیدا کر دی۔ یہ کوئی ذاتیات کی بحث نہیں ہے بلکہ اک ذکر خیر ہے جوش خاں
 کی ادبی عریانی و فحاشی کا جو اون کے کلام میں کثرت سے پائی جاتی ہے
 بعض حضرات بے سوچے سمجھے صحیح اور سچی نکتہ چینی پر بھی متھ اٹھا کر ذاتیات
 کا الزام رکھ دیا کرتے ہیں۔ لفظ ذاتیات کا استعمال ہی غلط کرتے ہیں۔
 ذاتیات کا سوال تو جب پیدا ہو سکتا ہے کہ کسی کی پرائیویٹ زندگی کے
 حالات بلا ضرورت زیر بحث لائے جائیں۔ مگر جب مثل کے مواد سے
 بحث کی جائے یعنی مصنف کی تصنیف سے تو پھر ذاتیات کا سوال کیا نہ اٹھایا
 جاسکتا ہے۔ زلفی صاحب نے مجھے بہت محبت سے یاد فرمایا ہے مگر ادب و نصیحت
 اور اس کا جواب دیکھ لینے کے بعد ان کا یہ کہنا کہ معاملہ ذاتیات تک پہنچ
 چکا ہے کم از کم مجھ پر تو صادق نہیں آتا۔ میں نے تو اپنی تحریر میں کسی کے ذاتی
 معاملہ سے بحث کی نہیں۔ ہاں صاحب موصوف کا یہ خیال درست ہے کہ

”دونوں صاحب جذبات کے تیز دھارے میں بہ گئے ہیں۔ مگر یہ کلمہ نہایت مغالطہ انگیز ہے۔ ”ادب خبیث“ کے عنوان سے میرا مضمون جن لوگوں کی نظر سے نہیں گزرا ہے وہ اس کلمہ سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جذبات کے دھارے میں بہ کر شاید میں حق سے تجاوز کر کے ناق کو فشی پر اتر آیا ہوں گا۔ مگر کیا زلفی صاحب یا اور کوئی صاحب یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ میں نے اول سے آخر تک کہیں ناق کو فشی کی ہے؟ ہرگز نہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میرا لب و لہجہ بیشک تلخ ہے اور ہونا چاہیے۔ گزشتہ بیس چیس سال کی مدت میں جوش و جگر اور ان کے بعد آنے والے نئے ترقی پسندوں کے ہاتھوں ادب، اخلاق، ہندوستانی نسوانیت کو جیسا صدمہ پہونچا ہے اسے میں نہایت شدت سے محسوس کرتا رہا ہوں۔ چونکہ میں ان لوگوں کو اپنا معاصر اپنا ہم چشم نہیں گردانتا اس وجہ سے بیس سال تک ان کی ہنگامہ آرائیوں کو نظر انداز کرتا رہا۔ مگر جب بعض ہمدردان ادب نے مجھے اردو زبان کا حق جتا کر توجہ دلائی کہ پانی سر سے اونچا ہوا چاہتا ہے۔ کیا اب بھی آپ خاموش بیٹھے رہیں گے تو مجبوراً مجھے قلم اٹھانا پڑا۔ اگرچہ قریباً پندرہ سولہ سال سے میں ادبی دنیا سے بے تعلق سا ہو گیا ہوں پھر بھی اتنا بیگانہ نہیں ہوا ہوں۔ یہ وجہ بھی کہ اس ہنگامہ خیز کو میں جس شدت سے محسوس کرتا رہا ہوں اسی شدت کے ساتھ ظاہر بھی کر دیا۔ اس امر میں اپنے تئیں حق بجانب سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ جن بدنیت لوگوں نے کھلم کھلا اس ڈھٹائی کے ساتھ ہندوستانی ادب، ہندوستانی تہذیب

ہندوستانی نسوانیت کی تخریب کا بیڑا اٹھالیا ہو انھیں مٹھانا، چمکانا ان کے ساتھ نرم لب و لہجہ میں دوستانہ انداز گفتگو بالکل بیکار یا بالکل غلط اصول ہے۔ تہذیب و مروت کا غلط مصروف ہے۔ ایسوں کو ان کے حقیقی رنگ میں پیش کر دینا عین دیانت بلکہ ادبی فرض ہے۔ بغیر اس کے ان کی تخریبی اسپرٹ کا پردہ فاش نہیں ہو سکتا۔ یہاں کوئی ذاتیات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایسوں کے رویہ پر فقط اظہار نفرت کر دینا کافی نہیں بلکہ انھیں سزا دینا چاہیے اور ان لوگوں سے زیادہ سزا کا مستحق ہے پرس۔ جھوٹے ترقی پسند اک غیر طبعی یا دہ گوئی (بلینک ورس) کی حمایت میں قافیہ کو ایک ”نکمی قید“ ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی بھول تو نہیں ہے۔ البتہ فتنوریت ہے۔ محض تخریب مقصود ہے۔ قافیہ کی طبعی ضرورت کو یہ لوگ بھی اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح اک چاہل گنوا قافیہ کی قدر محسوس کرتا ہے۔ پھر قافیہ سے انکار کا سبب؟ وہی ان کا فتنوریت یا فطری جھوٹی شعرو سخن کی اہلیت رکھتے نہیں۔ لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ضرور ہونگے۔ قافیہ کی طبعی ضرورت و اہمیت پر میں نے اپنے مضمون میں جو بحث کی تھی ان لوگوں نے اب تک نہ میرے دلائل کو غلط ثابت کیا نہ ان کی محنت کا اعتراف کیا۔ چپ سا دھلی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ خیر اب قافیہ کے متعلق میں اپنے ہمدرد زلفی صاحب سے بھی دودو باتیں کر لینا مناسب سمجھتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں۔

”میرزا بیگانہ چونکہ پڑائے آدمی ہیں اس لئے انھوں نے قافیہ کے

سلسلہ میں بحث کی اور یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔ عام تعلیم یافتہ طبقہ قافیہ کی قربانی کر سکتا ہے صرف اس لئے کہ اس کے اڑانے سے کوئی جھول واقع نہیں ہوتا۔

(۱) مجھے انجی جبریل نے اطلاع دی ہے کہ یہ آواز ہرگز زلفی صاحب کی نہیں ہے ترقی پسندوں کی صدا ہے بازگشت ہے۔ زلفی صاحب ہرگز عالم بیداری میں ایک ہی سانس میں اتنی بے معنی باتیں نہیں کہہ سکتے۔ (۲) میں نے قافیہ کی اہمیت پر اپنے مضمون میں جو بحث کی ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں زلفی صاحب نے بھی کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔ اس کی کیا وجہ؟

(۳) معلوم نہیں تعلیم یافتہ طبقہ سے زلفی صاحب کی مراد کیا ہے تعلیم یافتہ ہونے کا معیار کیا ہے۔ مانا کہ میرزا یگانہ پرانے کوئی ہیں تو کیا واقعی ان کا یہ کہنا کہ قافیہ شعر کے لئے طبعی ضرورت کا حکم رکھتا ہے پرانے پن کے سبب سے ہے اور کیا واقعی اس میں کوئی صداقت کہیں ہے؟ یہ تو آگ کھلی ہوئی حقیقت ہے ہر صحیح الدماغ انسان اپنے طبعی اقتضا سے قافیہ کو شعر کے لئے ضروری سمجھنے پر مجبور ہے۔ اک گنوار آدمی بھی جب موزوں طبعی پر آتا ہے تو قافئے جوڑ کر مطلب نکال لیتا ہے۔ آغا کجا بودی چھپر بچھنس کو دی۔ یہ ہے انسانی فطرت کا تقاضا۔ بلینک درس کی حمایت میں شکسپیر کی مثال نہایت فرسودہ اور ساقط الاعتبار ہے۔ خود انگریزوں سے پوچھئے کہ شکسپیر کی قدر و عظمت ہے تو کس وجہ سے ہے؟ کیا ٹھنڈی بلینک درس

علم سے ثابت ہو کہ یہ نا اہل تعلیم یافتہ طبقہ کتنا جاہل ہے؟ خود شکسپیر کے ہاں مضمون اشعار دیکھ لینے کے بعد بھی قافیہ کو غیر طبعی مہرانا ہے۔

کی وجہ سے ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلینک درس تو خود انگریزوں کو نفرت ہے اور ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر جاسن جیسے زبردست ادیب کا قول ہے کہ کسی ناپسندیدہ موضوع پر بلینک درس نفرت مزید کا اضافہ کر دیتی ہے۔ ناظرین پڑھنے پر آمادہ بھی ہوں تو بلینک درس کی وجہ سے گھن آنے لگتی ہے۔ اور ایک جگہ ڈاکٹر موصوف نے ایک نقاد کا قول نقل کیا ہے۔

”اک ذہین نقاد نے کیا خوب کہا ہے کہ بلینک درس کے مصرعے فقط آنکھوں ہی کو مصرعے معلوم ہوتے ہیں۔ بلینک درس میں نہ تو نثر کی

روانی ہوتی ہے نہ موزوں مصرعوں کا ساتھ ترخم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلینک درس پڑھنے سے جی اکتا جاتا ہے۔ اب بڑا دشا کی رائے

بھی سن لیجئے فرماتے ہیں ”بلینک درس طفلانہ سہل پسندی اور جلد بازی کا کام ہے اور یہی وجہ ہے کہ شکسپیر نے لکھ لکھ کر انبار لگا دیا۔ اور

کیوں نہ ایسا ہوتا۔ شاعری جب تجارتی اغراض کی تالچ ہوگی تو یقیناً جلد بازی سہل پسندی اور دفع الوقتی کا شکار ہو جائے گی۔ شکسپیر سچا رہ خود اپنی اور تھیٹروں کی ضروریات سے مجبور تھا فنی ضروریات کا لچا نہ کہاں تک کرتا

(۴) قافیہ کی طبعی ضرورت پر میرزا یگانہ کی بحث دیکھ لینے کے بعد بھی زلفی صاحب کا یہ کہنا کہ ”میرزا صاحب کی ذاتی رائے ہے“ کس قدر تعجب و خیریات ہے، حقیقت سے کس قدر بعید ہے۔ کیا واقعی میرزا یگانہ سوا

اور کوئی انسان قافیہ کو ضروری نہیں جانتا اور کیا خود شیکسپیر نے جا بجا اپنی نظموں میں مقفی اشعار نہیں کہے ؟ ہر انسان جو کوئی نہ کوئی زبان بولتا ہے خواہ وہ اردو یا فارسی بولنے والا ہو۔ خواہ عربی یا انگریزی بولنے والا ہو۔ پڑھا لکھا ہو یا جاہل گنوار ہو، دہقانی ہو شہری ہو کوئی ہو فطرۃ قافیہ کی ضرورت اور اہمیت تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے پر مجبور ہے مشرق سے مغرب تک ایسا کوئی انسان پیدا ہی نہیں ہوا جو سچ سچ قافیہ کو بے ضرورت سمجھے۔ ہاں فدیہ ہٹ دھرمی کی اور بات ہے۔

(۵) غلط ہے یہ کہنا کہ عام تعلیم یافتہ طبقہ قافیہ کی قربانی کر سکتا ہے کیونکہ یہ امر فطرت کے خلاف ہے۔ ممکن ہے کسی غیر طبعی درجہ سے تعلیم یافتہ طبقہ ایسا روئے اختیار کر لے مگر جاہل سے جاہل کسان کا فطری شعور قافیہ کی قربانی گوارا نہیں کر سکتا۔ اگر تعلیم یافتہ طبقہ ایسا کرے تو یقیناً کوئی فتور نیست کوئی غیر شاعرانہ مقصد ہوگا۔ صدق دل سے نہ کوئی تعلیم یافتہ شخص ایسا کر سکتا ہے نہ کوئی گنوار۔ کیونکہ قافیہ کے بغیر شعر نکٹا معلوم ہوتا ہے۔

ہیں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ آواز ہرگز زلفی صاحب کی آواز نہیں ہے۔ یہ تو وہی بواہوس ترقی پسندوں کی آواز ہے جو شعر کے فطری ذوق سے محروم ہونے پر بھی شاعر بننے کی ہوس میں مبتلا ہیں۔

(۶) قافیہ کے طبعی فطری ہونے کا ثبوت یہ کیا کہ ہے کہ ذرا سا سہارا پا کر اک تیلی کا بھی شاعرانہ شعور بیدار ہو جاتا ہے اور وہ یوں پکار اٹھتا ہے جاٹ لے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ۔ جو فطرۃ موزوں طبع ہوتا ہے وہ یوں شاعرانہ ذوق کا ثبوت دے دیتا ہے۔ بیچارہ جاٹ اس نعمت سے محروم تھا۔ اس سے جواب نہ بن پڑا تو کھسکتا ہو کر بول اٹھتا تیلی رہے تیلی تیرے سر پر کوٹھو۔ ارے میاں یہ کیا قافیہ تو خبر ہی نہیں۔ اچی قافیہ نہیں تو نہیں سہی پوچھ توڑے گا۔ واہ واہ واہ۔

دیکھی آپ نے جاٹ کی کھسیان پٹ۔ فقط لفظ کوٹھو کہہ دینے سے تیلی کے سر پر گویا کوٹھو کا بوجھ پڑ جائے گا۔ واہ ری بکھلا ہٹ! جاٹ بیچارہ موزوں طبع ہوتا تو کسی نہ کسی پہلو سے کوئی قافیہ جوڑ کر تیلی کو جواب دیتا۔ یہی حال بیچارے ترقی پسندوں کا ہے کہ قافیہ سے قافیہ جوڑ کر نگ بندی تک نہیں کر سکتے تو اس جاٹ کی طرح قافیہ کو غیر ضروری کہہ کر ٹالنا اور اپنی دانست میں اپنی نکٹی شاعری (بلینک درس) کا بوجھ ڈالنا اور دیکھتی دنیا کو اٹو بنانا چاہتے ہیں۔

قافیوں سے جی چراتے کا سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ غالباً مشکل قافیوں کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ یہ ان کی بے ہنری اور علم قافیہ سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ قافیہ کے بہت سے اقسام ہیں۔ مشکل قسم کے بھی ہیں اور آسان قسم کے بھی۔ قافیہ کی بنیاد فقط ایک حرف (الف) یا ایک حرف (ی) پر رکھی جائے۔ یعنی فقط (الف) یا (ی) کی تکرار کافی سمجھ لی جائے تو پھر ایک ہی

قسم کے سنیکڑوں قافے دستیاب ہو جائیں گے (خصوصاً اردو زبان میں) اس طرح ایک ہی قسم کے قافیوں میں چھوٹی موٹی نظمیں ہی نہیں مثنوی کی مثنوی بھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ رامائن کا منظوم ترجمہ (بقید یک قافیہ) موجود ہے ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں اور ترجمہ بھی منظوم مشکل کام ہے مگر کرنے والے کرتے ہیں کس قدر نا اہل ہیں یہ ترقی پسند جو (زبان غیر کا ترجمہ تو کیا) خود اپنی فکر کو آسان سے آسان قافیوں کے ساتھ مقفی نظم کی صورت میں پیش نہیں کر سکتے۔

قافیہ کی بنیاد ایک حرف پر ہوتی ہے جسے حرف ردی کہتے ہیں اس کی تکرار ہر قافیہ میں لازم ہے جیسے دکھا۔ سنا۔ رہا۔ گیا۔ خدا وغیرہ میں الف حرف ردی ہے اس کی تکرار ہر قافیہ میں لازم ہے مگر حروف قافیہ میں ردی کے علاوہ اور بھی حروف ہوتے ہیں جیسے آن۔ بان۔ شان۔ جاٹ۔ گھاٹ۔ گھاٹ۔ وغیرہ ان قافیوں میں دو دوحروف ان اور اٹ کی تکرار ضروری ہے۔ اس طرح حروف قافیہ کی تعداد جتنی بڑھتی جاتی ہے قافیے مشکل ہوتے جاتے ہیں۔ اور قافیے جتنے مشکل ہوتے جاتے ہیں آٹ کی قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے اور شاعر کی ذہنی استعداد کے جوہر کھلتے جاتے ہیں۔ الغرض قافیہ کی بہتیری قسمیں ہیں جو علم قافیہ پڑھ لینے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ آسان سے آسان بھی ہیں اور مشکل سے مشکل بھی۔ مگر یہ کون کہتا ہے کہ تم مشکل ہی قافیوں میں شعر کہو۔ آسان سے آسان قافیوں میں داستان کی داستان کہہ سکتے ہو۔ مگر نہیں وہاں تو یہ دھڑائی ہے کہ قافیوں کے اقسام سے واقف تک نہیں منہ اٹھا کر

یہ کہہ دیتا آتا ہے کہ قافیہ کی قید غیر ضروری ہے۔ یہ چال نہیں تو اور کیا ہے زلفی صاحب نے قافیہ کی طبعی ضرورت اور اس کے برتنے کے لازمی اور اختیاری پہلوؤں کو نظر انداز کر کے بے سوچے سمجھے یہ کہہ دیا کہ تعلیم یافتہ طبقہ قافیہ کی قربانی کر سکتا ہے۔ یہ محض جلد بازی ہے تحقیق سے بعید۔

ہر موزوں طبع انسان وہ کوئی سی ندیاں بولتا ہو جب موزوں طبعی پر آئے گا تو پہلے خود بخود گنگنائے گا اس کا ذوق موسیقی کسی وزن عروضی کی طرف مائل ہو جائے گا پھر اس کا ذہن قافیہ کی تلاش کرے گا اور یہ دونوں طبعی عمل ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات اک موزوں طبع شخص فی البدیہہ کہنے لگتا ہے اور قافیے اس کا ساتھ دیتے چلے جاتے ہیں مثلاً

استرصر احمی گردنا دامنم چہ خواہی گردنا
گردن درازی می کنی پنبہ بخواہی خوردنا

عربی فارسی اور سب سے زیادہ اردو زبان میں قافیوں کی وہ کثرت ہے کہ اک جاہل ان پڑھ بھی قافیے جوڑ کر اپنے خیال کو موزوں کر لیتا ہے۔ البتہ انگریزی بولنے والوں کے لئے مشکل ہے کیونکہ

وہاں اوزان اور قافیے دونوں کی تعداد قلیل۔ مگر ایسی زبان میں بھی لکڑ بنڈر پوپ نے ہومر کی *Odyssey* دنیا کی سب سے بڑی رزمیہ تصنیف کا ترجمہ پانچ سو صفحات میں کر ڈالا نظم کا ترجمہ مقفی نظم میں۔ ظاہر ہے کہ ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں کرنا اور وہ بھی نظم کا ترجمہ نظم میں کس قدر مشکل کام ہے۔ اور پوپ نے یہ ترجمہ کس سن میں کیا پچیس برس کے سن میں شروع اور

تیس برس کے سن میں ختم کر دیا۔ پانچ برس کے اندر کتاب مع حواشی مکمل کر لی۔ مگر نا اہل ترقی پسندوں کو دیکھے کہ وہ اردو جیسی زبان میں جہاں قافیوں کی اتنی کثرت ہے اور اوزان کا اتنا تنوع ہے اپنے خیالات کو مکمل شعر کے سانچے میں تو کیا ڈھالیں گے (رسمی نظم یا قافیہ پیمائی کی صورت میں بھی قلمبند نہیں کر سکتے بلینک درس کا شور مچا رہے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں پرانے شگون کے لئے آپ اپنی ناک کا ٹلینا۔ ٹھکو۔ اس نکتے کا کیا علاج؟ شیکسپیر کی بلینک درس کی مثال پیش کرنا غلط ہے بالکل غلط۔ یہ اس کا عجیب ہے پتہ نہیں ہے۔

..... شیکسپیر کی عظمت مسلم مگر اس کی عظمت کا ثبوت بلینک درس میں نہیں ہے۔ اس کی عظمت اس کے گہرے مشاہدات زندگی اس کی فکر کی رسائی اس کے اچھوتے انداز بیان سے ثابت ہے۔

Fury expels fear

"Now ha'll out-stare the lightning To be furious
So to be frightened out of fear; & in that mood,
The dove will pack the estridge; & see still,
A diminution in our captain's brain
Restores his heart. When valour prays on reason
It cuts the sword it fights with." (Shakespeare)

کہتا ہے :- (غیظ کی حالت میں خوف دفع ہو جاتا ہے)

(۱) ایسی حالت میں وہ بجلی کو بھی گھورتے گھورتے مات کر دے گا غصہ

ہونا کیا ہے؟

(۲) خوف کا دل سے نکل جانا۔ اور ایسی حالت میں
(۳) اک فاختہ شتر مرغ کے ٹھونگ مار دیتی ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ
(۴) جب کپتان کا دماغ کوتاہی کرنے لگتا ہے
(۵) تو اس کا دل طاقت پکڑ لیتا ہے۔ جرأت جب عقل پر غالب آ جاتی ہے
(۶) تو اس تلوار ہی کو چاڑھتی ہے جس سے وہ لڑتی ہے۔

واہ جی واہ نفسیاتی حقائق کا کیا گہرا مطالعہ ہے۔ مگر ایسے کلام کو وہ کتنا ہی فصیح و بلیغ، اچھوتا اور دلکش ہو شعر کے نام سے موسوم کرنا مذاق سخن کی توہین ہے کیونکہ ہر مصرع قافیہ کے بغیر نکلنا۔ شعر کا احساس قافیہ کے بغیر ہوتا ہی نہیں۔ اس کلام سے شاعر کی عظمت کا احساس تو ضرور ہوتا ہے مگر یہ احساس بلینک درس کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ احساس عظمت کا سبب تو شاعر کی اچھوتی تجلّیل گہرا مطالعہ اور انداز بیانی ہے۔ جو لیس سیرز کے قتل پر اس کا خون آلودہ ملبوس دکھا کر اور اپنی عیارانہ آتش بیانی کے ساتھ دردناک واقعات کی یاد دلا کر مارک اینٹونی نے باشندگان کو کچھ کے سامنے بروٹس کے خلاف نفرت کی جو آگ بھڑکائی اس کا اثر تو مارک اینٹونی کی آتش بیانی کی وجہ سے ہے نہ کہ شیکسپیر کی بلینک درس سے۔

(۷) یہ کہنا کہ قافیہ کو اڑا دینے سے شعر میں کوئی جھول نہیں پڑتا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ عورت کی ناک اور کان کاٹ لینے سے موند دینے سے کیا قباحہ لازم آتی ہے۔ قوت شامہ۔ قوت سامعہ۔ قوت فکر

معطل تو نہیں ہو جاتی۔ مگر جبے احساسِ حُسن عطا ہوا ہے وہ ایسے خلافتِ عمل کو کیا سمجھے گا۔ تخریب یا تعمیر۔ ہر صحیح الحواس صحیح المذاق انسان کے نزدیک قافیہ طبعی ضرورت کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے بغیر شعر نگاہی معلوم ہوگا۔ میں پھر دہی کہوں گا۔ کہ یہ آواز زلفی صاحب کی نہیں ہے۔
(۸) ہر زبان میں قافیے طبعی طور پر بننے گئے۔ دریافت ہوتے گئے اور بعد ازاں رد و اج پاتے گئے۔ یہ جو کچھ ہوا فطرت کے عمل ارتقا سے ہوا۔ جو چیز فطرت کے عمل ارتقا سے وجود میں آکر رد و اج پا جائے اس سے انحراف کرنا فطرت سے بغاوت کرنا ہے۔

(۹) ہر لفظ جو فطرت کے عمل سے وجود میں آیا ہے وہ اپنا خاص مصرف رکھتا ہے۔ قافیے بھی فطرت کے عمل سے وجود میں آئے ہیں تو ان کا بھی کوئی مصرف ہونا چاہیے۔ اب ترقی پسندوں سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ آخر قافیہ کا مصرف کیا ہے نظم سے مخصوص ہے یا نثر سے ؟

میری نسبت زلفی صاحب کا یہ کہنا کہ (غزل کا سچا شیدائی ہونے کے باوجود اُن کے دل کے گوشوں میں اُن نظموں کے لئے اب بھی یقیناً جگہ ہوگی جو نظیر اکبر آبادی، اسماعیل میرٹھی، حاکی، چکبست۔ اقبال، ظفر علی خاں جوش وغیرہم لکھی ہیں) کیا معنی رکھتا ہے ؟ یہ سوال کیونکر پیدا ہوا۔ کیا میں نے کبھی نظم کی مخالفت کی ہے ؟ ہرگز نہیں۔ شعر کی کسی صنف کی

یہاں تک کہ چرکین کی شاعری کی بھی میں نے کبھی مخالفت نہیں کی۔ البتہ کچھ ترقی پسندوں کے پچھو پچھو شہدین اُن کی شری گئی نظموں سے یقیناً نفرت کرتا رہا ہوں۔ میری کوئی تقریر یا تحریر ایسی نہ ملے گی جس میں فی نفسہ نظم کی مخالفت کی گئی ہو۔ مجھے نظم کا مخالف سمجھنا بالکل غلط۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جوا احصاف سخن میں سے غزل کو (بعد ازاں باغی کو) سب سے زیادہ کل سب سے زیادہ وسیع الاثر سب سے زیادہ بکرا آدیا ہوں۔ غزل کا شعر ذرہ کی زندگی پر محیط رہتا ہے۔ کیونکہ غزل کا فن مختصر نگاری کا فن ہے۔ غزل کا شعر کم سے کم جگہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنویت اور حریت کا حامل زیادہ سے زیادہ مؤثر زیادہ سے زیادہ محیط ہوتا ہے۔ *It cannot be condensed to the utmost*۔

اس کے سامنے نظم بازی کیا ہے ؟ آسان اور بہت آسان۔ ردی پرزورہ رکھتے تفصیلاً کا انبار لگاتے چلے جاؤ یہ کیا مشکل ہے جب تک دوات میں۔ دشنامی ہے کچھ چلے جاؤ۔ مگر نازک پیچیدہ وسیع المعنی حقائق کو دو مصرعوں کے اندر سمیٹ لینا شعر کو زیادہ سے زیادہ محسوس اور پر معنی بنادینا اعلیٰ درجہ کی ذہنی استعداد کا کام ہے جن لوگوں کا ذہن اجمال و اختصار (پر معنی اجمال) پر دسترس نہیں رکھتا وہ مختصر نگاری یعنی فن غزل میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ غزل کے مقابلہ میں نظم کو آسان سمجھنا اور بات ہے اور نظم کا مخالف ہونا اور بات ہے۔ میں تا آنکہ کورہ بالا نظم گو شعراء کی اور موجودہ دور میں جوش کی نظموں کی قدر کرتا ہوں مگر نظم کو بھی ہنرمندانہ دمداری کے ساتھ نباہنا کوئی آسان کام نہیں۔ جوش موجودہ دور کے اک *صمد* ضرور ہیں مگر کچھ بھی وہ سمجھتے ہیں اور بعض اعتبار سے گمراہ۔

زیٹ زیٹ

(از میرزا یحیٰٰہ چنگیزی)

جوش خان کی ایک تصنیف آیات و نعمات میری نظر سے گزری جس کا ابتدائی کلمہ (آیات) خود مصنف کا نتیجہ فکر نہیں ہے بلکہ اس جانب کی تصنیف آیات و جہدانی سے اُدھار لے لیا گیا ہے۔ مگر یہ اُدھار بھی جوش کی شاعری کی طرح اُدھورارہ گیا۔ پورا نام اُدھار لے لیتے تو کیا بُرائی تھی؟

جوش کی شاعری کی بسم اللہ اور ان کی نو جوانی میری دیکھی بھالی ہے جب سے اب تک میں ان کی تیز رفتاری یا کج رفتاری، جوش و خروش یا دھینگا مشی کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب کے خلاف جوش کی بغاوت اک وقت کی راگنی ہے۔ اک سچی خدمت ہے جو بنی آدم کو مذہبی گمراہی سے بچا کر راہ پر لائے گی۔ مگر آرٹ کے لحاظ سے ان کی نظمیات یا ”جوشیات“ کے کامیاب و ناکامیاب دونوں طرح کے نمونے صفر سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے کیونکہ وہ نہ آرٹ کا حقیقی تصور رکھتے ہیں نہ جمالی طور پر برت سکتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ جوشیلے رنگیلے چمکیلے بھڑکیلے الفاظ نظم کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ شعر بن گیا مگر کم سے کم الفاظ، سادہ سہل و جربۃ الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ ایسے نظم گو یوں اور ایسے بیارگو یوں کو آرٹ سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟ یاد رکھئے جوش کی شاعری پر کھنے اور یاد رکھنے کے قابل نہیں ہے شاعری تو کیا ان کی نظمیات کا نایاں پہلو زیٹ زیٹ ہے جو پر کھنے کے بعد مصنوعی اور جعلی ثابت ہوتی ہے۔ دیکھئے کیا فرماتے ہیں۔

۱۔ جوش خان فن غزل کے پرانے مخالف ہیں لہذا ان کی کچھ کھلی نظم بازی کا جائزہ لیتا ہوں

مرے تازہ آئین فکر و نظر سے نظام قضا و قدر کا نیتا ہے! آخر یہ کیا ہے؟ کیا اس دعوے میں کوئی صداقت ہے یہ کوئی حقیقی شاعری ہے یا نری زیٹ زیٹ ہے۔ نظام قضا و قدر تو یہ ہے کہ آج آپ جوان ہیں۔ کل پورے ہو جائیں گے۔ آج آپ بقول خود ”حسینوں کو آغوش میں لیکر ہانتا ہوں“ کا بالہ بن جاتے ہیں ”ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ جوان عورتوں سے آپ جی چرائے لنگیں گے۔ یہ ہے نظام قدرت۔ اس نظام کے آگے آپ کو کھکنا پڑیگا ذرا پھر تو ارشاد فرمائیے کیا سچ مجھے یہ نظام آپ کے تازہ آئین کے آگے کا نیتا ہے؟ تازہ آئین۔ فکر و نظر۔ نظام قضا و قدر۔ کا نیتا ہے کتنے شاندار کتنے بھرپور کیا الفاظ ہیں۔ ان کی ترتیب تہذیب کتنی نظر زیب ہے مگر ٹھول کر دیکھو تو حقیقت کچھ بھی نہیں۔ بقول پروفیسر مخنوں گورکھپوری ”جوش کی شاعری اندر سے کھو کھلی“ آپ کا تازہ آئین فکر و نظر کیا ہے یہ تو آپ ہی جانیں۔ وہ کچھ بھی ہو نظام قضا و قدر کا ایک رُویاں بھی ٹیڑھا نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی ڈینگیں مارنے سے نہ تو کوئی شاعرانہ لطف حاصل ہوتا ہے نہ کوئی طاقت پہنچتی ہے نہ قومی کیر کٹر بتا ہے۔ نظام قدرت کا جلال و جہدوت دیکھئے خود سے دیکھئے ۵

زمین کر دٹ بدلتی ہو بلائے نگاہاں ہو کر عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسمان ہو کر یہ ہے نظام قضا و قدر کا جلال و عتاب۔ یہ ہے آئینۂ انقلاب۔

۱۔ سو میرا لہو سر پہ دھوپ آئی آتش کی کہیں دین نہ ڈھلجائے نصیب دشمنان ہو کر یہ ہے آرٹ کا وہ انقلاب انگریز نمونہ جس سے قوم خواب غفلت سے بیدار ہو کر تازہ زندگی پاتی ہے۔ ناممکن ہے کہ جوش کے ہاں آرٹ کا اتنا مکمل اور انقلاب انگیز

تو نہ ایک بھی مل سکے۔ اس قول میں کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔
 ”حسین اور انقلاب“ کے عنوان سے جوش نے ایک مثنوی یا سمدس کہا ہے
 جو آرٹ کے اعتبار سے تو نہیں نظم گوئی کے ناقص معیار کے لحاظ سے اک خاصہ کی
 چیز ہے۔ چونکہ نظم گوئی کی صنف ایسی آغوش ماور میں ہے اس وجہ سے اس کا معیار
 ابھی تک ناقص ہے اور جب تک نظم گوئی نا شاعروں کے ہاتھ میں رہے گی اس
 کا معیار ناقص ہی رہے گا۔ البتہ جب کوئی بڑا اور حقیقی شاعر اس کی طرف توجہ کرے گا
 تو اس کا معیار بھی درست ہو جائے گا۔ اس نظم میں جوش کے بعض بعض خیالات
 سے مجھے اتفاق ہے۔ اس کا ایک بند یہ ہے۔
 یہ صبح انقلاب کی جو آج کل ہے ضو یہ جو چل رہی ہے صبا پھٹ رہی ہے پو
 یہ جو چراغ ظلم کی تھرا رہی ہے لو در پردہ یہ حسین کے انفاس کی ہے آو
 حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دو تو یہ بھی اسی جبری کی ہے آواز۔ دو ستو
 یہاں اک حد تک مجھے جوش کے خیال سے اتفاق ہے اور وہ یہ ہے کہ حسین
 کے انفاس کی رو اب تک کام کر رہی ہے۔ حسین کی قربانی رائیگاں نہیں ہوئی۔
 مگر یہ رو کس طبقہ میں دوڑ رہی ہے؟ ”شیعوں“ کے محدود طبقہ میں۔ یہ خیال کرنا
 صحیح نہیں ہے کہ آج کل دنیا بھر میں انقلاب کی جہلہ دوڑ رہی ہے یہ بھی انفاس
 حسین کی رو ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ ساری دنیا حسین سے واقف نہیں
 ہے نہ ہو سکتی ہے۔ حسین کی قربانیوں سے وہی لوگ (مسلمتکسندم مسلم)
 حاصل کرتے ہیں جو ان سے واقف ہیں۔ دنیا میں اس وقت جو انقلاب ہو رہا ہے
 اس کے اسباب کچھ اور ہی ہیں۔ فہادت امام حسینؑ سے اس انقلاب کو کیا تعلق؟

اسی سمدس کا ایک بند یہ بھی ہے۔
 جس بھر ظلم و جور کے گرداب میں تھا تو نازل پہاڑ پر ہو تو بن جائے آب جو
 سینے میں ابر کے نہ رہے روح رنگ و بو آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے ابو
 یہ رنگ بزرگ آتش و فوج دہکے ماتھے سے آگ کے بھی پسینہ ٹپک پڑے
 جوش کی عادت ہے کہ وہ شاندار بھاری بھر کم فنیسی الفاظ معنی و مفہوم
 میں اضافہ کرنے کے لئے نہیں محض دکھاوے کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں جنہیں
 مہارت سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا۔ اس بند میں امام حسینؑ کو فنی طلب کیا
 ہے کہ جس بھر ظلم و جور کے گرداب میں تو تھا وہ پہاڑ پر نازل ہو تو آب جو بن جائے
 ظاہر ہے کہ یہاں بحر کے معنی سمندر کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر کوئی اتنا پوچھے کہ سمندر
 میں گرداب کہاں ہوتا ہے؟ بھنور تو بہتے ہوئے دریا میں پڑتا ہے سمندر میں بھنور
 کیونکر پڑ سکتا ہے۔ جھوٹ موٹ کی نمایش کے لئے (بحر و گرداب) شاندار الفاظ
 ٹھونس دئے گئے حالانکہ بحر و گرداب سے کوئی معنوی ربط نہیں۔
 پھر فرماتے ہیں یہ ظلم پہاڑ پر نازل ہو تو آب جو بن جائے۔ مگر آب جو کا یہاں کوئی
 موقع نہیں۔ اس مقام پر اردو بولنے والے یوں بولتے ہیں کہ ایسی مصیبت پہاڑ
 پر نازل ہو تو پانی ہو جائے۔ پہاڑ آب جو ہو جائے نہ کوئی بول سکتا ہے نہ لکھ
 سکتا ہے۔ لکھو کے خواص بھی ایسی گھڑ کر نہیں کھا سکتے۔
 پھر فرماتے ہیں یہ ظلم ابر پر نازل ہو تو ابر کے سینے میں روح رنگ و بو باقی
 نہ رہے۔ رنگ کی روح تک باقی نہ رہے۔ یہاں روح جھوٹ موٹ کی
 نمایش ہے بے ضرورت۔ (Useless Pedantry)

ابریں رنگ باقی نہ رہے خیر یوں بھی سہی۔ مگر ابری میں بُو کہاں ہے جو اڑ جائیگی
 بُو کو ابر سے کیا تعلق ہو رنگ و بُو اک خوبصورت سالفظ نظم کر دیا۔ چاہے اسکا
 کوئی معنوی ربط و تعلق ہو یا نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ جوش کا کلام پر کھنے کے قابل
 نہیں ہے۔ اُن کے کلام میں جھوٹ موٹ کی دھوم دھام دیکھ کر عام لوگوں پر
 جو عیب پڑتا ہے وہ اسی وجہ سے کہ اب تک پرکھا نہیں گیا۔ اور سنئے۔ یہ ظلم و
 جور مخ پر نازل ہو تو بزرگ آتش دوزخ دھک پڑے۔ یہاں بھی آپ نے
 اک مضحکہ انگیز ٹھوک رکھائی۔ اہل زبان دھک اٹھنا دیتے ہیں۔ دھک پڑنا
 ہل بیچارہ طلبہ اور پروفیسروں کو کھوٹے کھرے کی کیا پہچان
 اور سنئے یہ ظلم و جور آگ پر نازل ہو تو آگ کے ماتھے سے پسینہ ٹپک پڑے
 بالکل جھوٹ بالکل بے اثر۔ ناممکن بات ہے جو ریٹ ریٹ سے زیادہ وقت
 نہیں رکھتی۔ یہ سب کچھ امام حسینؑ کی تعریف میں ارشاد ہوا ہے مگر کیا اس قسم کی
 باد ہوائی باتوں سے امام حسینؑ کے مرتبہ پر کوئی روشنی پڑتی ہے۔ ہرگز نہیں۔
 یہ مانا کہ بعض مقام پر مبالغہ سے حُسن کلام بڑھ جاتا ہے بشرطیکہ مبالغہ کرنے
 کا سلیقہ ہو۔ یاد رہے کہ حقیقی شاعری کے سامنے اس قسم کی ناسخانہ خیال بندی
 یا ہوا بندی چل نہیں سکتی۔ اس ایک بند میں اتنی غلطیاں۔ افسوس! ۵
 وہ کہ بلا کی رات وہ ظلمت ڈراونی خاموشیوں میں دُور سے وہ چاپ موت کی
 تھی پشت وقت بارالم سے جھکی ہوئی ارض و سما کی سانس تھی گویا رُک چکی ہوئی
 ارض و سما کی گویا سانس رُک چکی ہوئی تھی اس تو خیر اک سنائے کا ساں
 پیدا ہے مگر ”پشت وقت جھکی ہوئی تھی“ اک ہل سا تخیل ہے۔ وقت کی

پٹھ کا جھکنا“ نہ شاہدہ میں آسکتا ہے نہ تصور میں محض فضول سی ناسخانہ خیال بندی
 ہے۔ مگر ہے اسی ہل تخیل کو بعض اصحاب جدت سمجھتے ہوں۔ شاعر اور
 نا شاعر میں فرق یہی تو ہے کہ شاعر حقائق پر شاعرانہ قدرت کے ساتھ تصرف کرے
 سامعین کو آگاہ و محفوظ کرے تاہم، برخلاف اس کے نا شاعر ان ہونی باتوں میں الجھا کر
 لوگوں کو اپنے میں ڈال دیتا ہے۔ وقت کی پٹھ بارالم سے جھکی ہوئی تھی محض اک
 اچنبھا نگاری ہے۔ فریب ہے اور کچھ نہیں۔ وقت کوئی اونٹ نہیں ہے جس کی
 پٹھ جھک جائے گی ۵

ہر کام پر حیات کے چہرے کو فنی کرے مرنا چاہتا ہوا وہ اعلان حق کرے
 دوسرا مصرع کتنا صحیح و برجستہ ہے مگر اس پر حیات کے چہرے کو فنی کرے۔
 یہ ٹکڑا ایسا بدنام ہے جیسے مٹی جو تے میں ٹاٹ کا میوند۔ جوش اس ٹکڑے کو اپنے
 مذاق کے لحاظ سے اک شاندار ٹکڑا سمجھتے ہوں گے مگر ہے نہایت حقیر نہایت بڑا
 ٹکڑا۔ کوئی شاعر مصرع لگاتا تو یوں لگاتا ۵

ابتر کنا بیت کا ایک ک ور ق گئے مرنا چاہتا ہوا وہ اعلان حق کرے
 اسی مصدر کی اک بیت یہ ہے ۵

سجمر خود کو جرم میں جو راند لے وہ آئے اس راہ میں جو سر سوسن باندھا دے آئے
 باندھ کے ساتھ ”راندھ“ اک انوکھا قافیہ ہے۔ اردو میں ”راندھنا“ ڈباے مخلوط
 کے ساتھ (کوئی لفظ نہیں ہے۔ البتہ راندنا، اک مصدر ہے جو فارسی کے مصدر ”راندن“
 سے بنایا گیا ہے۔ اردو میں راندنا کے معنی ہیں نکال باہر کرنا۔ مگر یہ یاد رہے کہ اہل زبان
 کے روزمرہ میں ”راند لیتا“ نہیں ”راند دینا“ مستعمل ہے جیسے شیطان راند دیا گیا۔

جوش نے خود کو ”راندہ“ کہا ہے یہ بے محل ہے۔ خود کو راندہ نکال باہر کر لینے کے کوئی معنی نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ جوش نے ”راندہ“ نہیں کہا ہے ”سائدہ“ کہا ہے۔ کاتب نے سائدہ کی بجائے راندہ لکھ دیا تو بھی قافیہ غلط ہوگا۔ کیونکہ ”سائدہ“ ہائے مخلوط کے ساتھ کوئی لفظ نہیں بلکہ ”ساننا“ بولتے ہیں۔ میں بھی ایک جگہ ساننا، نظم کیا ہے۔

حسن کافر، گناہ کا پیاسا
چیت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے
اک اور عجیب و غریب طولِ فضلِ بندِ قابلِ دید ہے

اس یلی حیات کی اندری دار و گیر
اسکے کرم میں بھی وہ حرارت ہے مصفیر
اچھے جو اسکے گیسو پیچاں کے جال میں
دیکھے تو سہی، یلی حیات۔ دار و گیر۔ لورج۔ ناز۔ تیر۔ کمان۔ کرم۔ حرارت۔
ہم مصفیر۔ چہنم۔ زمہریہ۔ اچھے۔ گیسو پیچاں۔ جال۔ لگ جائے آگ۔ در قطب شمال
بظاہر اتنے زور دار و نشان دار الفاظ کی فوج کھڑی ہے مگر اس اہتمام پر بھی

کلام میں اثر اور خلوص کا پتہ نہیں محض کاغذی فوج ہے جس میں ذمہ دہر و دیہ ہے
جوش کی مصنوعی اور نقلی شاعری کی ایک قابلِ نفرت مثال جس میں شان تو اس قدر جان
کچھ بھی نہیں۔ حیات کو شاعر نے یلی بنا کر معشوق ٹھہرایا ہے معشوق ٹھہرا کر لورج میں لورج
ور ناز بھی بھر دیا۔ پھر اس لورج اور ناز کو تیر و کمان سے استعارہ کر کے دار و گیر پر آمادہ
کر دیا۔ مگر اتنی فضول استعارہ بازی کس کام کی؟ جوش دورِ حاضر کے شاعر اعظم و

لے بینڈ کا بند بے معنی دیوانی شاعری کا وہ نادر نمونہ ہے جس کا جواب غالب کے عجائب خانے
میں بھی نہیں۔

شاعر انقلاب بنتے ہیں مگر یہاں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امانت لکھنوی کی رعایا لفظی
ضلع بازی اُن کے سر پر سوار ہے۔ استعارہ پر استعارہ کرتے جاتے ضلع پر ضلع بولتے جاتے
ہیں اور اثر خاک نہیں۔ فرماتے ہیں اس یلی حیات کے کرم میں بھی وہ حرارت ہے مصفیر
دیکھے تو سہی، مصفیر کہاں پر آیا ہے اور اس قافیہ کو عبارتِ کلام سے کیا معنوی ربط ہے؟
کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا ہے تنے کے اندر گودر ٹھونس دیا گیا ہے۔ قافیہ اتنا بے جان بے ربط۔ انسو
اور نیچے کیا مزے کی بات ہے کہ اس یلی حیات کے گیسو پیچاں کے جال میں
قطب شمالی کا دامن اچھ جائے! واللہ گیسو میں دامن کا اچھنا یہ تو ایک ہی کہی دامن
کانٹوں میں اچھتا ہے کہ گیسو میں؟ اور تنے یلی حیات کے گیسو میں قطب شمال کا دامن
اچھ جائے تو کیا ہو؟ دامن میں آگ لگ جائے۔ کیا خوب گیسو سے آگ لگ جائے دامن
میں؟ آخر یہ ہے کیا بکواس۔ تھو۔

شاعر انقلاب کہیں سے سن بھاگے ہیں کہ قطب شمالی میں آفتاب کی حرارت برائے نام
تھوڑی دیر تک رہتی ہے۔ وہاں سردی کے سوا گرمی کا نام نہیں۔ اس لئے آپ نے
یلی حیات کے گیسو سے قطب شمالی کے دامن میں آگ لگا دی۔ شاباش! اور نیچے
لی جس نے سانس رشتہ شہابی کو توڑ کر جس نے کلائی موت کی رکھ دی مرڈ کر
دونوں مصرعوں میں ”جس نے جس“ شاعر کے بے سلیقہ ہونے کا ثبوت ہے۔ بھلا

جوش خان کو مصنوعی جوش و خروش کی دھن میں حشو و زواید کا احساس کیوں ہو؟
کہنا تو یہ چاہتے تھے کہ امام حسینؑ نے راہِ حق میں جان دے کر حیات جاوید حاصل کر لی
اس طرح گویا موت پر فتح پائی۔ مگر اس مفہوم کو یوں ادا کرنا کہ موت کی کلائی مرڈ کر
رکھ دی اک اجلہ چھان کا لب و لہجہ معلوم ہوتا ہے۔ جوش کی شاعری میں اثر و

امانت کا کلام رعایتِ لفظی کے ساتھ معنی تو ہوتا ہے مگر یہاں الفاظ ہی الفاظ معنی ہو رہے
کے سوا کچھ نہیں۔

خلوص تو کم سے کم ہے مگر دھینگا مشقی زیادہ سے زیادہ ہے۔ پہلے مصرع سے شاعر کا مفہوم ذہنی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ نے یزید کے غرور شاہی کو توڑ کر دم نیا۔ مگر شعر یہ کہتا ہے کہ رشتہ شاہی کو توڑ کر سانس لی۔ اس مقام پر رشتہ شاہی و ربط سی بات ہے کیونکہ یزید کو شاہی سے جو رشتہ یا تعلق تھا وہ مرتے دم تک رہا ٹوٹا نہیں۔ البتہ اس کا غرور شاہی ٹوٹا ہوا تو ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ رشتہ یا غرور شاہی کو توڑ کر سانس لی، نکال سال باہر ہے۔ کوئی اہل زبان کہتا تو یوں کہتا کہ غرور شاہی کو توڑ کر دم لیا۔ اس محل پر سانس لی ہرگز نہ کہتا۔ میر صاحب فرماتے ہیں ۵

زیست اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر یہاں دم لے کر کی جگہ سانس لے کر کہا جائے تو دوہقانیت ہوگی۔ جن لوگوں کو ٹھیکہ اہل زبان کی صحبت میسر نہ ہوئی ہو وہ ایسی ہی ٹھوکریں کھا جاتے ہیں۔ اک اور بیت ہے ۵

اس طرح جس سے ظلم یہ فاما ہو گیا لفظ یزید داخل دشنام ہو گیا یہ بھی اک مضحکہ انگیز ٹھوکریں ہے۔ کہنا تو یہ چاہتے تھے کہ ظلم رو سیاہ یا بدنام ہو گیا۔ رو سیاہ کی جگہ یہ فاما کہنا اک ایسی ادبی لغزش ہے جو اہل زبان سے نہیں سکتی۔ یہ فام کا لے کھوٹے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے رو سیاہ میں اسوائی و بدنامی کا مفہوم ہے۔ یوں کہا ہوتا ہے ۵

اس طرح ظلم دہریں بدنام ہو گیا لفظ یزید داخل دشنام ہو گیا
 "The irregular combinations of fanciful novelty cannot satisfy the mind."

دختران خوا کا کورس

(میرزا یگانہ چنگیزی کے قلم سے تنقید و تنقید)

(نوٹ۔ اتر اہٹ۔ زبٹ۔ نوٹ۔ *Frantic Novelty*)
 شوق کے پنج گستاخ سے دامن بچائیں زلف کی طرح اگر ہم نہ تغافل کو بڑھائیں
 لذت گریہ طول شب بھراں نہ رہے ہم اگر نرم سے اٹھ جائیں ہر اہل نہ رہے
 یہ ہے ایک ترجیح بند، عورتوں کی شناخت اپنی زبانی۔ بند کا چھٹا مصرع
 ہم اگر نرم سے (نحو) یقیناً اتنا سچا ہے کہ ہر بند میں بصورت ترجیح دہراے جانے پر بھی
 گراں نہیں گزرتا۔ مگر مجموعی حیثیت سے نظم کی حقیقت کیا ہے؟ وہی جوش خان کی
 زبٹ۔ نوٹ۔

تغافل برتنا اک شان تو ہے۔ مگر حسینوں کی زبان سے یہ کلمہ (زلف کی طرح اگر ہم نہ تغافل کو بڑھائیں) شعر و سخن کے ساتھ اک مسخر ہے۔ اک طرح کی پھبتی معلوم ہوتی ہے۔ جو خود حسینوں کی زبان سے تو نہیں کسی مسخرے کی زبان سے کہلوائی جاسکتی تھی۔ پھر بھی بھد ہی رہتی۔ کوئی عورت ذات تغافل کو بڑھانے کا تصور اس بھونڈی طرح نہیں کر سکتی۔ یہ انداز تصور ہی غیر طبعی ہے ہاں (بے باز اگر ہم نہ تغافل کو بڑھائیں) اس طور پر تغافل کا تصور کیا جائے تو مطابق فطرت ہوگا۔ بے نیاز نہ تغافل کا تصور اگر طبعی ہوگا۔ پھر بھی کورس میں شامل کر دیا جائے تو اچھا ہی معلوم ہوگا۔ اتر اہٹ پائی جائے گی۔

۱۔ جوش خان غزل کے سچے مخالف ہیں لہذا انکی کھلی نظم بازی کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

تغافل کو بڑھانے کے لئے ”درازی زلف“ کا سہارا لینا؟ یہ تو وہی نسخہ اور امانت لکھنوی کی رعایت لفظی ہے جس پر لوگ منہ آیا کرتے ہیں۔ اور جس کا چلن اب لکھنوی میں بھی نہیں رہا۔ یہ تو وہی زلف و کا کل ہے جس کی وجہ سے لکھنوی کو نام رکھتے ہیں۔ اور پھر اسی امر کے خود مرکب ہوتے ہیں۔ زلف کی طرح تغافل کو بڑھانا ایک ایسی جھوٹی ایسی بھٹی تخیل ہے۔ ایسی *Fantastic novelty* ہے جو شہر والوں کے دماغ میں نہیں آسکتی۔

”گریہ طول شب بھراں“ پر حضرت نیاز کا اعتراض بالکل صحیح ہے کہ یہاں غلطی نہیں ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں اک ”عربی خواں“ پر و فیصر کا یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ ”یہاں شاعر کا مطلع نظر گریہ نہیں بلکہ وہ لذت جو گریہ مسلسل سے حاصل ہوتی ہے“ مگر شاعر کا مطلع نظر جو پر و فیصر صاحب نے بیان کیا ہے۔ وہ شاعر کے کلام سے تو ثابت نہیں ہوتا۔ پیٹ کی بات کون سمجھے؟

شاعر نے اگر ”گریہ مسلسل“ کہا ہوتا۔ تو حضرت نیاز کبھی اعتراض نہ کرتے۔ کیوں غلط باور کرنا چاہتے ہو۔ کوئی سخن فہم تسلیم نہیں کر سکتا کہ گریہ طول سے گریہ مسلسل کا مفہوم ادا ہو گیا۔ لفظ طول یہاں خشوع ہے خشوع نہیں بلکہ خشوع قبیح۔ اس اُلٹی ترقی پسندی کے دور میں یہ بات کس کی سمجھ میں آئے گی، کہ شعر میں اک مقام خشوع بھی ہوتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں اک پختہ کار سخنور کی قابلیت اور معنی آفرینی کا امتحان ہو جاتا ہے۔ اسی مقام خشوع پر اک صاحب فکر، صاحب فن موزوں سے موزوں تر الفاظ لاکر حسن معنی میں اضافہ کر دیتا ہے۔ مگر اس دور تخریب میں کون سمجھے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

ملک کے درباب نظر خوب سمجھتے ہیں کہ جوش خان الفاظ کا استعمال معنی کی خاطر نہیں کرتے۔ ہر لفظ سے معنوی فائدہ اٹھانا جوش کا مقصد نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد ہے فقط الفاظ بولنے اور بچتے ہوئے الفاظ کا نظم کر دینا اور نوا و اقوال کو بہلا لینا۔ بیسویں صدی کے مشاہیر میں جوش سے بڑھ کر اور کوئی نہیں جو لفظ کو محض لفظ کی خاطر لاتا ہو معنی سے کوئی واسطہ نہ رکھتا ہو جوش کے کلام کی یہ خصوصیت یہ کمزوری یہ فریب اتنا بدیہی ہے اتنا مسلم ہے کہ محتاج ثبوت نہیں۔ پر و فیصر صاحب فرماتے ہیں:-

”یہ امر مسلم ہے کہ جدائی کی ایک ایک گھڑی یوں ہی پہاڑ معلوم ہوتی ہے جہ جاسیکہ یہ کہہ کے وہ حقیقتاً طولانی بنا دی گئی ہو۔“
زلف کی طرح اگر ہم نہ تغافل کو بڑھائیں

یہ بے معنی عبارت کس قدر قابل افسوس ہے۔ دیکھئے کیا فرے کی بات ہے کہ فقط منہ سے کہہ کر جدائی کی رات حقیقتاً طولانی بنائی جاسکتی ہے۔ اس بیسویں صدی میں بھی طلسم ہوش ربا والی ذہنیت موجود ہے۔ اس کے بعد پر و فیصر صاحب نے طول شب بھراں پر جلال اور ناصر کے اشعار سند میں پیش کر دیئے۔ افسوس ہے اس غلط بحث پر۔ حضرت نیاز کا اعتراض طول شب بھراں سے تو کوئی تعلق رکھتا نہیں۔ نفس مطلب سے ہٹ کر طول شب بھراں کو کیوں زیر بحث لاتے ہو جلال اور ناصر کے اشعار طول شب تنہائی کی سند میں کیوں پیش کرتے ہو۔ بلا ضرورت کیوں دھوکا دیتے ہو اس غلط بحث سے۔ بحث تو ہے ”گریہ طول“ سے اور ”گریہ طول“ ”گریہ مسلسل“ کا مفہوم ادا ہوتا ہی نہیں۔ طول شب بھراں کی بے عمل بحث کاٹ کے

پھینک دینے کے قابل تھی مگر افسوس ہے۔ ایڈیٹر صاحب "آجکل" نے اسے قلمزد نہیں کیا۔ یوں ہی چھاپ دیا۔ اچھا اب یہ بھی بتا دوں کہ "گر یہ مسلسل" کا مفہوم ادا کرنا ہے تو پھر شب پر کیا موقوف ہے دن رات گریہ ہو سکتا ہے پھر یوں کیوں نہ کہو؟

بے نیازانہ اگر ہم نہ تغافل کو بڑھائیں
لذت گریہ روز و شب سجا رہے ہم اگر نرم سے اٹھ جائیں چراغاں ہے
اس طرح گریہ مسلسل کا مفہوم بھی ادا ہو گیا۔ اور لفظ طول بھی جو محض فضول تھا خراج ہو گیا۔ "He carelessly sacrifices dense to sound"
اپنے مکھڑوں میں نہ غلطیاں ہو اگرچہ گھر لب گز رنگ پہ کھیلے نہ تبسم کا اثر
نوجوانی کی اگر ناز سے چکے نہ مکھڑے ہم رہیں بھر کے مانند نہ موج اگر
دہتر تانبدہ و رخشندہ در قصاں نہ رہے

حضرت نیاز کا اعتراض ہے۔ اور کتنا صحیح ہے کہ "مکھڑوں میں" کی جگہ "مکھڑوں پہ" ہونا چاہیے۔ کیونکہ غلطانی موج کے لئے سطح چاہیے اور یہ اچھی ہے کہ مکھڑا جسمانی نہ رکھتا ہے۔ سطح رکھتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب تو دیکھئے کتنا خوبصورت کتنا بے تکلف ہے۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں۔ محاورہ تو یہی ہے "کس فکر میں غلطیاں ہو۔" خدا کی مار محاورہ پر۔ اس محاورہ کو شاعر کے شعریا معترض کے اعتراض سے کیا تعلق؟ اور یہ بھی تو سوچو۔ کہ یہ محاورہ (کس فکر میں غلطیاں ہو) ہے تو کیوں ہے؟ اس لئے ہے کہ فکر یا خیال کوئی مادی شے نہیں ہے۔ کوئی سطح کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ اس وجہ سے بولتے ہیں۔ کس فکر میں غلطیاں ہو۔ مگر ان

لہ ناز سے لکھتے مگر تھو۔ ان اشعار کو چارپانچ بار گنگنا کر دیکھ لو نفرت ہو جائے گی۔

باتوں کو جوش کے شعریا نیاز صاحب کے اعتراض سے کیا واسطہ۔ ایسی بے جوڑ بات کہہ ڈالنے سے صاف ظاہر ہے۔ کہ پروفیسر صاحب کا دماغ شعری کے قابل نہیں ہے۔ شعر بچت کرنے کا انھیں کوئی حق نہیں نچینا افسوس ہے ایسی خالچ از بحث بات کو بھی ایڈیٹر صاحب "آجکل" نے چھاپ دیا قلمزد نہیں کیا۔ پھر فرماتے ہیں پروفیسر صاحب "اگر کوئی شے فضا کے زمین پر غلطال نظر آئے تو کہیں گے فضا میں غلطال آرہی ہے۔"

Non-sense
کیوں صاحب آپ ایسا کیوں کہیں گے۔ آخر اس کی وجہ؟ اور یہ تو فرمائیے فضا کے زمین کیا بلا ہے۔ زمین کی سطح ہوتی ہے یا فضا؟ فضا میں تو بیشک کوئی شے تیرتی ہوئی نظر آسکتی ہے۔ مگر جوش نے فضا میں تو کوئی چیز غلطال دکھائی نہیں۔ مکھڑے میں تو کوئی فضا پیدا نہیں کی۔ آخر اس بے سر دیا تقریر کا حاصل؟ "He speaks what he cannot realize"

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے میر انیس کا مصرع سند میں پیش کیا ہے (جس صف پہ چلی خون میں غلطال کیا اس کو) بھلا دیکھئے تو یہی یہ کس قسم کا کا دماغ ہے؟ یہاں میر انیس کا یہ مصرع کس قدر بے محل ہے۔ خون میں غلطال ہونا مسلم۔ مگر کیا اس سے حضرت نیاز کا اعتراض اٹھ گیا۔ پھر فرماتے ہیں پروفیسر صاحب:-

"اگر تھے غلطال اور سطح دونوں میں جو ہریت کا شائبہ موجود ہو تو اس وقت ظرفیت نہیں ہی زیادہ مناسب ہوگا۔ (کسی عورت کا نورانی مکھڑہ اور موج گہر) یعنی آجبتا کسی سطح اور سطح کی محتاج نہیں۔ لاجول و لا قوۃ۔ پروفیسر صاحب۔ تو کوئی علامہ قسم کے

آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بھلا نیاز صاحب کا اعتراض جو محض فہم سلیم پر مبنی ہے
ایسوں کی سمجھ میں کیونکر آئے؟ جوش کا شعر اور حضرت نیاز کا اعتراض سمجھنے کیلئے
استدرا زیادہ استدرا فضول علم کی ضرورت نہیں۔ کجا مکھڑا۔ کجا جوہریت کا شائبہ۔ کجا
ظرفیت ہی وہ علم ہے جس کا جاننے والا (Common sense) بھی کھو بیٹھتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں پروفیسر صاحب۔ ”اصل شے جس پر موج گہر کو غلط دکھایا گیا ہے
وہ صرف مکھڑے کی نازک جلد نہیں۔ بلکہ اس کا شباب آگیں رنگ روغن جس میں
برق گہر کو ندائی گئی ہے۔“

بھلا اس ڈھٹائی اس جھوٹ کا کیا ٹھکانا ہے؟ جوش نے تو ہرگز برق نہیں کو ندائی
نہ شباب آگیں رنگ روغن میں کو ندائی۔ محض مکھڑے میں موج گہر کو غلط دکھایا ہے۔
اگر رنگ روغن میں غلط دکھایا ہوتا۔ تو نیاز صاحب اعتراض کیوں کرتے؟ یہ جھوٹ
کستہ قابل فہم ہے۔ ایڈیٹر صاحب اسے بھی چھاپ دیا۔

ذرا اٹھہرئے پروفیسر صاحب کو مکھڑے پر چوچائے دیتا ہوں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ
مکھڑوں کے رنگ روغن کا ذکر نہ ہونے پر بھی پروفیسر صاحب نے ”میں“ کا جواز بات کرنے
کے لئے اتنی جھوٹی بنا دلیں کیں۔ اتنا وقت ضائع کیا مگر اسی بند کے دوسرے مصرع پر
کچھ بھی غور نہ کیا۔ سچ

لب گز رنگ پہ کھیلے نہ تبسم کا اثر

کیوں صاحب یہاں تو لب کا رنگ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے۔ پھر یہاں تبسم کا اثر لب پر کیوں
کھیلایا۔ لب میں کیوں نہ کھیلایا؟ کچھ کہتے تو سہی سچ تو یہ ہے کہ مدرسہ کا پڑھا ہوا عربی خیال

Common sense بھی کھو بیٹھتا ہے۔

صاف ظاہر ہے۔ کہ حضرت نیاز کی رد میں کچھ نہ کچھ لکھنے کا شوق تھا۔ کلام کو
سمجھنے کی ضرورت نہ تھی۔ آپ کی فضول تاویلات پر جوش خان کا یہ مصرع رلب گل رنگ
پہ کھیلے الخ) آپ کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔

سچ فرمائیے (لب گل رنگ پہ کھیلے نہ تبسم کا اثر) کیا اس گدڑی اردو سے گنوار میں نہیں ہکتا؟
اس جگہ لب گل رنگ پہ کوڈے نہ تبسم کا اثر کہتے تو ترقی پسندی کی لچ اور نمایاں ہو جاتی!
لکھنے کا اک عامی بھی اتنا سمجھتا ہے۔ کہ یہ مصرعوں نہیں یوں ہونا چاہیے تھا۔
لب گل رنگ سے ٹپکے نہ تبسم کا اثر

کیا کوئی اردو پڑھنے والا یا اردو سے ہم راہی رکھنے والا زبان کو اس طرح بگاڑنے
کا بیڑا اٹھا سکتا ہے۔ جس طرح جوش اور ان کے ساتھیوں نے اس امر کا ثبوت دیا ہے۔
یہ بحث اک جداگانہ مضمون چاہتی ہے۔ کہ جوش اور ان کے ساتھیوں نے زبان اور فن شعر
کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ جوش سے یہ توقع تو نہ تھی کہ لکھنے سے استدرا قریب ہو کر بھی
زبان اردو کے ساتھ ایسا بڑا ڈگریٹیکے خلاف وضع فطرت، بغیر زبان (Play)
کا لفظی ترجمہ نہ کرے۔ ترجمہ میں اپنی زبان کے طبعی اقتضا کا بھی لحاظ
کرنا پڑتا ہے۔ کوئی احمق خندہ زدن کا ترجمہ منہ ہی مارنا کر بیٹھے تو کیوں نہ منہ ہی آئے۔

حضرت نیاز کا اعتراض ہے۔ کہ دوسرے مصرع میں (لب گل رنگ پہ کھیلے نہ تبسم کا اثر)
گرایا اگر لانا ضروری تھا۔ اس کے جواب میں پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ ”اگر کئی شرطیں
مسلل بیان کئے جائیں۔ تو حرف شرط کا احادہ محل فصاحت ہو کر رہتا ہے۔ اگرچہ
جوش نے تین مصرعوں میں التزام بھی کیا ہے۔ لیکن غنیمت ہے ایک مصرع میں ترک

کر کے فصاحت بیاں پر نظر رکھی ہے۔
 پروفیسر صاحب کی پچیس پچیس تاویل قابل فہم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی
 رشوت لیکر جھوٹی گواہی دے رہا ہو۔ بندہ نواز نیا زاکم باخبر آدمی ہیں۔ وہ آپ کے دھوکے
 میں نہ آئیں گے۔ انھوں نے کچھ سمجھ کے اعتراض کیا ہے۔ آپ دیکھیں تو سہی۔ دوسرے
 مصرع میں لفظ اگر کے متروک ہو نیسے فصاحت بیاں پیدا ہے۔ یا معنوی نقص ہے؟
 اپنے مکھڑوں میں نہ غلطاں ہو اگر موج گھر لب گل رنگ پر کھیلے نہ تبسم کا اثر
 نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پہلا مصرع تو رہا شرط اور دوسرا بنگیا بڑا۔ یعنی مکھڑوں میں موج گھر
 غلطاں نہ ہو تو لب تبسم کا اثر نہ کھیلے (خدا کی ماریاں اس اثر کھیلے پر نہ جانے کونسی بلن ہو)
 دیکھئے اگر کے متروک ہو نیسے کیا قباحت پیدا ہو گئی۔ اسی قباحت کو پیش نظر رکھ کر حضرت
 نیاز نے اعتراض کیا تھا۔ مگر آپ اس قباحت پر فصاحت کا رنگ چڑھا کر دھوکا دینا
 چاہتے ہیں۔ کس کو۔ نیاز کو؟ جی ہاں
 جناب من۔ جوش کو کیا معلوم رموز فصاحت بلاغت کیا ہیں اور کیا کیا ہیں جوش
 کو راز فصاحت معلوم ہوتا۔ تو اس بند میں بس ایک جگہ حرف شرط لاکر اور تین مصرعوں
 میں حرف شرط محذوف رکھ کر (اصول کے ساتھ) پانچویں مصرع میں جزار کھتے۔ اس طرح
 اگر اگر کی تکرار نہ ہوتی اور کلام فصیح ٹھہرتا۔ مگر اک اناڑی ان باتوں کو کیا جانے کہ تین
 مصرعوں میں حرف شرط کس اصول پر محذوف رکھا جائیگا؟ اصول بتا بھی دیا جائے
 تو اس کا برتاؤ دوسری چیز ہے۔ اسے پختہ کار اہل زبان ہی برت سکتے ہیں۔
 تیسرے مصرع کے بارے میں (نوجوانی کی اگر ناز سے لچکے نہ مگر) حضرت نیاز نے
 بس اتنا ہی کہا ہے کہ اس مصرع کا انداز بیاں باقی مصرعوں سے مختلف ہے۔ جو

جو نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر میں عرض کرتا ہوں۔ کہ اس ناشایستہ مصرعے کے متعلق
 جو ہرگز کسی ادبی رسالے میں چھپنے کے قابل نہ تھا۔ اور کچھ کہنا چاہئے تھا۔ جو کہا
 نہیں گیا۔

حضرت نیاز کے اس اعتراض کے جواب میں پروفیسر صاحب فرماتے ہیں۔
 کہ اس سے زیادہ انداز بیاں کا توازن اور کیا ہو گا۔ کہ تمام مناسب جوانی اور بچے دو
 مصرعوں میں بیان کر دئے گئے ہیں۔ مثلاً مکھڑا اس کی گہر ریز تابندگی۔ لب گل رنگ
 تبسم۔ یہ سب بتاتے ہیں کہ منظورات، عمر رسیدہ نہیں۔ بلکہ نور سیدہ ہیں۔ اس بند
 میں کافی مراعات النظر موجود ہے۔

مراعات النظر کو تو ڈالے بھاڑ میں۔ اب مجھ سے سُنیئے۔ آپ ہی کے قول کے
 مطابق جوانی کے اتنے علامات موجود ہیں۔ اس بند اور سابق کے بند میں علاوہ
 سے صاف واضح ہے کہ منظورات بوڑھیاں نہیں ہیں جوانیں ہیں۔ تو پھر نوجوانی کی
 کمر لچکا کر اتنا گنوار بن دکھانا کیا ضرور تھا؟ ظاہر ہے کہ خود عورتوں کی زبان
 اسے ڈینگ اپنے مکھڑوں پر موج گھر غلطاں نہ ہو۔ لب گل رنگ تبسم کا اثر نہ کھیلے
 نوجوانی کی کمر نہ لچکے کس قدر بے مزہ ڈینگ ہے۔ اس غیر طبعی اور مصنوعی اثرات ہٹوں
 کیا جذبات پر کوئی سچا اثر پڑ سکتا ہے نفرت کے سوا؟ کیا واقعی یہ کمر لچکا ناتری پسند
 کی ادبی ترقی کا ثبوت ہے۔

عورتوں کی زبان سے ایسے کلمے ہی نہیں سکتے۔ یہ محض *unnatural*
novelties ہیں تو اور کیا ہے؟ شریف عورتوں کا کیا ذکر، دھوبن یا بھنگن بھی
 وہ کتنی ہی اترائی ہوئی ہو کر تو پچکا سکتی ہے۔ مگر نوجوانی کی کمر نہیں لچکا سکتی

ناس گنوار بن کے ساتھ کمر لچکاتے پڑ دنگ مار سکتی ہے۔ یہ تو آزادوں کی بولی ٹھوٹی یا مسخروں کا مسخرہ پن ہے جو ایسی چربیا تک عورتوں پر گواڑے کتے رہتے ہیں۔ جھوٹے ترقی پسند، اچھی ہوں یا بُری تمام پرانی قدروں کے الٹ جانے، سر نیچے مانگیں اور کر لینے پر اُجکل بہت بغلیں بجا رہے ہیں۔ اوباشیوں کو آزادی فحش پرستی اور ذہنی غلامی کو ترغیب دینے کی لیتے ہیں۔ مگر انھیں خبر نہیں کہ اس الٹاؤں سے ذہنی پرہیز و ستانیوں کو خوش ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ البتہ یورپ اور امریکہ والے ایسی پست ذہنیت ایسے ذلیل کیر کیمر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں۔ تو بچا ہے۔ کیونکہ وہ تو ہندوستان کو اسی اوباشی اسی ذہنی اور اخلاقی پستی میں مبتلا رکھ کر آسانی سے حکومت کر سکتے ہیں۔

عورت کی عظمت اتنا اعلیٰ اتنا پاکیزہ موضوع ہے جس پر ایک شریف اور بچا شام خلوص اور عہد ردی کے ساتھ عورت کے مراتب پر روشنی ڈال کر ملک کی ذہنیت کو صحت بخش غذا پہنچا سکتا تھا۔ مگر افسوس ہے جوش کو فطرت نے وہاں تک نہیں بخش جن سے وہ عورت کی عظمتوں کا مشاہدہ کر سکتے۔ وہ عورت کو ایک اوباش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتنا اعلیٰ موضوع اس شخص کی بدینتی سے اتنا پست ہو کر رہ گیا۔ ورنہ آگ شریف انسان پرانی عورت سے بھی پاکیزہ (مقدس) حاصل کر سکتا ہے۔ عورت کی ذات کیا ہے۔ حیرتہ حیات۔ سرمایہ سکون و انبساط۔ وہ سکون و انبساط جو نفسانی اور شیطانی جذبوں سے پاک ہو سکتا ہے۔ ذہنی اور اخلاقی تربیت اور بہترین فضائل حسنہ اپنی ماں بہنوں کے علاوہ پرانی عورت کی رفتار و گشت کردار سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے۔ اس شخص کو وہ توفیق ہی عطا نہیں

کہ عورتوں کو احترام کی نظر سے دیکھ سکے۔ نسوانی عظمت کا احساس کر سکے۔ اس بند کے چوتھے مصرع پر (ہم رہیں بھر کی مانند نہ مواج اگر) حضرت نیاز کا اعتراض ہے کہ ”عورتوں کا بھر کی مانند مواج رہنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا“

میں آج سے بہت پہلے کسی موقع پر کہہ چکا ہوں کہ جوش کا کلام پر کھنے کے قابل نہیں نہیں۔ بغض الفاظ کی بے معنی نمائش ہوتی ہے۔ مگر میں نے ان کی سچی باغیانہ شاعری کے خلاف کبھی ایسا حکم نہیں لگایا۔ مذہب، معاشرت اور سیاست کے خلاف جوش کی باغیانہ نظمیں ان کی شاعرانہ قابلیت اور قومی خدمت کا روشن ثبوت ہیں۔ البتہ شعروادب کو آرٹ کی حیثیت سے اور ہندوستان کی نسوانی عظمت کو اخلاقی حیثیت سے ان کی نظم بازیوں نے بڑا نقصان پہنچایا جو قابل افسوس ہے لکھنؤ کی رعایت لفظی کم از کم الفاظ کا اک کھیل تو تھی۔ کچھ نہ کچھ معنوی تعلق کی خاطر رعایت لفظی کا کھیل کھیلا جاتا تھا۔ اور وہ کھیل اک کھلاڑی کا کھیل ہوتا تھا۔ انارڈی کا پچھو ہڑپ نہ تھا۔ مگر جوش کے ہاں وہ کھیل بھی نہیں ہوتا بے ضرورت ٹوائس ٹھانس ہوتی ہے۔ محض نمائش کے لئے وہ بھی بے ہنری کے ساتھ۔

ہم ہر دوش اگر زلف نہ منس کر جھٹکائیں مسکراتے مجھے پھروں سے نقابیں نہ اٹھائیں
اپنی رفتار کو چلتی ہوئی کشتی نہ بنائیں ہم زمین کو اگر انگریزائیاں لیکر نہ جگائیں
بھوکوئیں میں طغیانی و طوفان نہ رہے

پہلے زلف کی طرح تغافل کو ٹپھانے کا تماشہ دکھا چکے تھے۔ اب پھر وہی لکھنؤی لطف کا کل، جھونٹے اور چونڈے والی شاعری کرنے لگے لکھنؤ کی شاعری پر مجھ بھی آتے ہو اور پراسی منہ سے اسی پرانی کھوسٹ زلفیہ شاعری کی تقلید بھی کرتے ہو۔

اور ہنس کر زلف جھٹکانے کی ایک ہی کہی جوانی میں تو بات بات پر ہنسی آتی ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی معقول سبب ہوتا ہے۔ مگر زلف جھٹکانے کے لئے تو کوئی نہیں ہنستی۔ ہنسنے کا سبب تو کچھ اور ہی ہوگا۔ بات کہنے کیلئے سلیقہ چاہیئے۔ بلا ضرورت ایک خوبصورت سا لفظ استعمال کر دیا۔ جب مسکراتے ہوئے چہروں سے نقاب اٹھانا کہہ چکے تو پھر اسی بند میں ہنس کر زلف جھٹکانا یہ کیا بات ہوئی کیسی فضول بیوٹ کشتی چھوٹی لفظی ہے۔ بے مزہ۔ بے اثر۔

تیسرے مصرع سے بقول حضرت نیاز یقیناً بدنام تصنع اور آدھ دظاہر ہے۔ اول تو دو پایہ عورت کی رفتار کو چلتی ہوئی کشتی سے مثال دینا ہی اہل ہے۔ پھر اس دیوانی جدت پر مزید تصنع۔ عورت کی زبان سے یہ کہلوانا کہ ہم اگر اپنی رفتار کو چلتی ہوئی کشتی نہ بنائیں کس قدر بھونڈا پن ہے کتنا جھوٹا تخیل ہے۔ کیا کسی عورت کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے ہرگز نہیں۔ کیا اس قسم کی خرافات سے جذبات پر کوئی سچا اثر پڑ سکتا ہے۔ ہرگز نہیں مگر دل لگی تو یہ ہے۔ پروفیسر علامہ فرماتے ہیں ”سب رفتار معشوق کا (کیا خوب! معشوق کی ایک ہی کہی۔ یہ عورتوں کا کورس ہے کہ معشوقوں کا) استعارہ پانی میں چلتی ہوئی کشتی سے بہت لطافت کے ساتھ کیا گیا ہے“

لا حول۔ کس کام کی یہ جھوٹی لطافت؟ معلوم ہوتا ہے۔ کہ عورت اپنے پیروں سے نہیں چل رہی ہے۔ پیندے کے بل پھسلتی جا رہی ہے یا درکھو یہ یوانی جدت (Frametic Novelty) کوئی ترقی نہیں ہے۔ بلکہ پھر سے بغاوت ہے خیال کی طبعی رفتار سے بغاوت ہے۔ تو اے ذہنی کی تحریب ہے اور کچھ نہیں ناگہن ہے

کوئی صحیح احساس انسان، دو پایہ عورت کی چال کو چلتی ہوئی کشتی سے مثال دے ہاں اسی۔ آئی۔ آر کی ڈاک گاڑی کو چلتی ہوئی کشتی سے مثال دو تو اک بات ہے پیڑوں پر اس سبک رفتار سے جاتی ہے گویا پانی پر کشتی جا رہی ہے۔ یا سبک رفتار موٹر پر یہ مثال صادق آسکتی ہے۔ دو ٹانگوں والی عورت کجا اور پیندے کے بل چلنے والی کشتی کجا؟ آئیے رفتار نماز پر آپ کو آرٹ کا اک ایسا نمونہ دکھا دوں جو قیامت سے کم نہیں۔ ۵

پیدائش ہوزمین سے نیا آسمان کوئی (رنگانہ) دل کا پتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر یہ ہے قنہ خرامی کا سچا اثر جس سے دل قابو میں نہیں رہتا۔ یہ ہے اعلیٰ ترین کلاسیکل شاعری۔ یہیں پر جھوٹی اور سچی شاعری کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔! چوتھے مصرع میں ”زمین کو انگریزائیاں لیکر جگنا“ یہاں زمین نے مصرع کو پست کر دیا۔ زمین کی جگہ ”جہان“ کہتے تو اچھا تھا۔ حضرت نیاز نے اس پر غور نہیں کیا کہ لفظ انگریزائیاں مصرع میں پورا نہیں ملتا۔ کچھ باہر رہ جاتا ہے۔ انگریزائیاں کی جگہ ”انگریز“ پڑھو تو مصرع کو ذول ہوتا ہے۔ مصرع وہ کیا کہ وزن سے باہر کہیں ہے جوش و خالب معلوم ہیں کہ انگریزائیاں۔ انگلنائیاں۔ جوانیاں۔ کہانیاں وغیرہ میں علامت جمع (ن) کا الف بھی گرایا نہیں جاتا۔ ہاں علامت جمع (ن) کی ”سی“ گرائی جاسکتی ہے۔ فصحاء نے لکھنؤ کا دستور یہی ہے۔ مگر انگریزوں کو ان باتوں سے کیا غرض؟ آج سے کوئی تیس سال قبل یہی سہو مجھ سے بھی ہوا تھا جس کا مجھے اعتراف ہے۔ بھر کو غنیمت میں طوفان نہ رہے، حضرت نیاز کا اعتراف ہے کہ یہاں لفظ کو غنیمت بے ربط ہے۔ پروفیسر صاحب کہتے ہیں۔ کہ شاعر کو غنیمت کہہ کر دونوں عالم کو رنڈا خوشی

سے (ہیال مشوق کون ہے۔ یہ تو عورتوں کا کورس ہے) متاثر کرنا چاہتا ہے۔
 میں عرض کرتا ہوں۔ شاعر کے چاہنے یا عورت کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے
 کیا سچ مجھ دونوں عالم متاثر ہو جائیں گے؟ ناممکن۔ بندہ نواز یہ حقیقی شاعری
 کا زمانہ ہے۔ یگانہ آرٹ کے زمانہ میں طلسم ہو شراب کی سی باتیں کون سنتا ہے؟
 عورتیں اسی دنیا میں الجھ چکی ہیں کونین میں ادھم نہیں مچا سکتیں۔ یہ کیا
 بے سرو پا تقریر ہے؟ لفظ کونین میں اک جھنکار ہے۔ اسی جھنکار کے لئے لفظ
 ٹھونس دیا گیا۔ کوئی معنوی ربط نہیں۔ نہ جوش کو معنی کی پروا۔
 ہم دکھائیں نہ اگر کس نوجوانی کی پھینک
 اپنے چہروں سے نہ طالع ہو اگر صبح چمن
 اگر ان تازہ جبینوں سے نہ دیکھ کے کندن
 سرخی سے نہ رہے رنگ بہاراں نہ رہے

عورت کی ذات میں فطرت نے کیا کیا فضایل و دلچت کئے ہیں۔ مگر یہاں یہ
 بیوقوف اترا آتی ہے تو کس چیز پر؟ اک دو کنگنوں پر بھلایا بھی کوئی مال تھا ڈینگ
 مارنے کے قابل پہچھن۔ کندن۔ کنگن۔ دیکھئے میں تو یہ سب
 الفاظ ہیں کھنکھناتے ہوئے مگر کوئی خلوص کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے
 یہ سب الفاظ نحاس سے کراہیہ پر منگوا لئے گئے ہیں۔ سچ کہنا کیا پھینک۔ کندن کنگن
 ان کراہیہ کے الفاظ سے ترقی پسندی کی بو آتی ہے؟

چہرے کی تازگی تو اک بات ہے۔ مگر تازہ جبین کبھی کبھی سی بات معلوم ہوتی ہے۔
 جوش کہتا چاہتے تھے روشن جبین مگر مصرع میں روشن کی گنجائش نہ تھی۔ تازہ کہہ دیا
 ٹھونس ٹھانس کر کام نکال لیا۔ دیکھئے تو یہی جوش کے ہاتھوں کس بیدردی سے

کس بے پردائی سے حسن معنی کا خون ہوتا رہتا ہے۔ اس بند کے چاروں مصرعے
 شرط ہیں اور پانچواں مصرع ہے جزا۔ مگر دیکھئے نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

(۱) ہم جوانی کی پھینک نہ دکھائیں تو سرخی مئے نہ رہے۔ واہ کیا شرط ہے اور کیا
 جزا؟ کیا سبب ہے اور کیا نتیجہ؟ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے۔ کہ جوانی کی
 پھینک دکھانے سے شراب کا رنگ سرخ رہتا ہے اور نہیں تو نہیں؟

(۲) چاندنی رات میں عورت کے کنگن نہ جھلکیں تو شراب میں سرخی نہ رہے
 واہ کیا شرط ہے۔ اور کیا جزا۔ کیا واقعی یہی ترقی پسند ادب ہے؟ تھو
 مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ لفظ سے لفظ کا معنوی ربط نہ ہو تو وہ کلام کیا
 ہوا۔ کیا ایسی اوٹ پٹانگ باتوں پر شاعری کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

(۳) عورتوں کے چہرے سے صبح طلوع نہ ہو تو سرخی مئے نہ رہے لیکن اس میں
 کوئی تنگ ہے؟ جمل سراسر جمل

(۴) تازہ جبینوں سے کندن نہ دیکھ کے تو شراب میں سرخی نہ رہے واہ کیا سبب
 اور کیا نتیجہ۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ جوش کی شاعری پر کھنے کے قابل ہی نہیں *frantic*
 کے سوا کوئی معقولیت نہیں۔ کوئی جدت نہیں اس خط جدت کا اثر پڑھے دالوں پر
 کیا ہو گا۔ ذہنی انتشار۔ لفظوں میں گم ہو کر رہ جانا۔ کیا اسی کا ناا ہے ترقی پسندی؟
 اچھا اب دو ایک مثالوں سے حسن کی حقیقی معجزاتی بھی دیکھ لیجئے۔ کھرے

کوٹے کا فرق معلوم ہو جائے گا۔
 دیکھ کے مجھ کو دل زدہ دہرے مجھ چڑھا دیا (یگانہ حسن نے سب مال ورج چمکیوں میں اڑا دیا
 حسن بیان نے کس برجنگی کس لطافت کے ساتھ حسن کی معجزاتی ثابت کر دی

بغ و غم کا پہلا اک اشارے میں چمکی بجاتے ہوا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت کبریٰ ہے جس پر ادنیٰ و اعلیٰ امام پیغمبر بھی حلف اٹھانے کو تیار ہوں گے۔ اتنی پکار اٹھیں گے یہ ہے حقیقی شاعری جسے کبھی زوال نہیں۔ جب بڑھو گے تازگی محسوس کرو گے۔ اک اشارے میں درد پیدا کر دینا یا درد کو مٹا دینا حسن کے معمولی ہتکنڈے ہیں۔

حسن کے ہتکنڈے ارے تو بہ (لیگانہ) درد کیا چیز ہے دو کیا ہے؟ کیا ممکن ہے۔ کوئی صحیح مذاق ان اشعار کی صداقت اور ولولہ انگیز اثر سے انکار کر سکے؟ اس آرٹ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کھری شاعری کیا ہے اور کھوٹی شاعری کیا ہے۔ جھوٹے ترقی پسند برائی قدروں کے بدل جانے پر لاکھ بغلیں پکاس کھڑے کھوٹے کافروں کا فرق مٹ نہیں سکتا۔ کوئی نفاذ کتنی ہی کر پڑی تنقید کرے ان اشعار کا ایک رویا بھی ٹیرھا نہیں کر سکتا۔ ترقی پسندوں کے جھوٹے نعرہ انقلاب یا *artificial change* کی زندگی کے دن کی؟ چند روز میں خود ان کے انقلاب پر بھی انقلاب آجائے گا۔

ہم اگر نوع بشر کو نہ دکھائیں مشعل سر دینوں کو نہ گرائیں بجا کر چھاگل
افقِ دل پہ نہ گرجائیں جنوں کے بادل خونِ بہت میں اگر ہم نہ چجائیں ہلچل
آدمی صفت شکن و فاتحِ دوراں نہ رہے

وہ کہتے چلے جائیں اور آپ سنتے چلے جائیے۔ سخن سازی کے سوا سخوڑی نام و نشان نہیں۔ لفظوں کی دھوم دھام استقدر اور اثر خاک نہیں۔ سر دینوں کو نہ گرجاؤں دلائے کے لئے بجا کر چھاگل کی جگہ ہٹا کر آچل کہہ دیتے تو کچھ بعید نہ تھا۔ بادل ہلچل چھاگل۔ لفظوں کی جھٹکار کے باوجود کلام میں سچا جوش و خروش نہیں۔

افقِ دل پر بادل گر جانا کیا بھیانک زبان کیسی جھوٹی تھنیل ہے۔

حضرت نیاز فرماتے ہیں۔ "افقِ دل پر بادل گر جانا اور خونِ بہت میں ہلچل مچانا نامافوس اندازِ بیاں ہے۔ کیا یہ اعتراض غلط ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ افقِ دل پر بادل گر جانے میں *an excessive Dignity* کے سوا کوئی سچا جوش نہیں پایا جاتا۔ خدایا! یہ کہ وہیوں کی زبان ہے کہ دیو زادوں کی؟ ہاں یہ تو فرمائیے افقِ دل کیا بلا ہے۔ یہ تو وہی بیڈھنگی استعارہ بازی وہی ناسخا نہ اچھنھا نگاری ہے۔ کہنے والا سیکڑوں برس پہلے *"He has a kind abutting dignity, wants to look taller by walking on his tip-toe."*

جوش کی نمائشی شان پر کتنی سچی تنقید کر گیا ہے کہ وہ انگوٹھوں کے بل چل کر اونچا ہونا چاہتا ہے۔ حضرت نیاز کا یہ اعتراض کتنا صحیح ہے کہ اس بند کے پہلے مصرع کو پانچویں مصرع سے تعلق بہت کم ہے۔ یہ بھی اک ثبوت ہے نیاز کی صحیح المذاقی کا۔ کیونکہ پہلے مصرع سے (ہم اگر نوع بشر کو نہ دکھائیں مشعل) عورت کی شان نہیں بلکہ پیغمبر یا امام کی شان نکلتی ہے۔ یعنی نوع بشر کو مشعل دکھانا ہدایت کرنا پر وفیسر صاحب کا مذاق اتنا بگڑا ہوا ہے کہ وہ اس نکتے کو بھی سمجھنے کے مشعل حرفِ حکایت ہے ہمیں ردِ شن ہاں ہمیں ہر ترلے کا زمانے میں چلن گیت گنگا کا کے بلاتے ہیں ہمیں تو ساون ہم اگر لعل زرافشاں کو نہ دیں اوقِ سخن زندگی زخمرہ پرواز و غرلوں کا نہ رہے

مشعل حرفِ حکایت؟ واہ جی واہ مشعل بھی نئی اور مشاچٹیں بھی نئی نئی کیا کہنا اس روشنی طبع کا۔ ساون خود نہیں آتا تو گیت گنگا کے بلاتی ہیں۔ خدا کی مار اس جھوٹی شاعری پر کتنی بے مزہ بے اثر۔ مگر کیا کیجیے یہی ارتراہٹ یہی زمیٹ زپٹ

جوشیہ شاعری کے ماتھے کے چپکے ہوئے ٹیکے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ وہی ناسخ کی روح کام کر رہی ہے نئے قالب میں۔ اور خدا جانے لعل در افشاں کیا بلا ہے۔ منہ سے پھول جھڑنا تو آدمیوں کی بولی ہے۔ لعل لب سے زرد زیر جھڑتے کسی نے دیکھے نہ سنے۔ اسے کہتے ہیں *Frontic Novelty* یہ وہی لکھنؤ کی استعارہ بازی ہے جس پر منہ آتے ہو۔ اور پھر اسی کی نقل اُٹارتے ہو۔ بیگانہ آرٹ کے زمانے میں حقیقی شاعری کے دہر میں ایسی فضول و بے اثر استعارہ بازی ہر اک کام پر جھٹکائیں اگر زلف رسا چھوڑ دیں آنکھ جھکانے کی بجائے کی ادا پلوں کو نہ سنبھالیں جب اڑانی ہو صبا بے محابا ہم اگر کھول نہ دیں بند قبا دہر میں سلسلہ چاک گریاں نہ رہے

لا حول اول سے آخر تک یہ نظم مصنوعی انزاہٹ کی وجہ سے کس قدر بے کیف و بدمرہ ہو کر رہ گئی ہے۔ چاک گریاں کا سلسلہ نہ ہو کوئی عورت ایسی زبان میں نہیں سوچتی۔ ابھی تغافل کو زلف کی طرح بڑھا چکی تھی۔ ابھی ہنس کر زلف کو جھٹکا چکی تھی صبا پھر ہر کام پر زلف کو جھٹکانے لگی۔ جھوٹ بڑے مزہ کی چیز ہے۔ مگر جھوٹ بولنے کا سلیقہ بھی تو ہو۔ یہ تو صحیح ہے کہ پلوں کو سنبھالتی ہے بڑے انداز سے۔ مگر کورس میں خود اپنی زبان سے پلوں کا گیت گا کر بھونڈا پن نہ دکھائے گی۔ لکھنؤ کی زلفیہ شاعری بھی کیا بلا ہے۔ شاعر انقلاب کا بیچا نہیں چھوڑتی بگھبرائیے نہیں۔ ابھی اس نظم میں یہ زلف اک آدھ بار پھر آئے گی۔

حضرت نیاز کا اعتراض صحیح ہے کہ پہلے مصرع کا بیان نفی ہونا چاہیے تھا یعنی ع ہم نہ ہر کام پر جھٹکائیں اگر زلف رسا۔ دوسرے میں خود عورت کی زبان سے

لعل بجانے کی ادا چھوڑ دیں۔ بے محابا بند قبا کھول نہ دیں۔ خود عورتوں کی زبان سے جیجائی کا کا یہ مظاہرہ ہم کیا اسی اور یا شاید لکھنؤ سے قوم کو طاقت پہنچتی ہے۔

بصیغہ مستکم یہ کہنا ع چھوڑ دیں آنکھ جھکانے کی بجائے کی ادا۔) پھوٹن کی دلیل ہو جوش اصول بلاغت سے واقف ہی نہیں یہ تو کوئی شخص غیر عورت کی تعریف میں کہہ سکتا تھا۔ بعض اوقات اپنی تعریف اپنے منہ سے بھلی لگتی ہے۔ مگر یہاں اپنے لجانے کی تعریف اپنے منہ سے کتنی جھوٹی شاعری ہے۔ شرمیلے پن کا مفہوم ادا کرنے کیلئے آنکھ جھکانے کی ادا کہا ہے۔ خیر جوش کے لئے یہ لغزش قابل معافی ہے۔ کوئی اہل زبان کہتا تو ”آنکھ جھکانا لینے کی ادا“ کہتا۔

آنکھ جھکانے اور آنکھ جھکانے لینے میں اک نازک فرق ہے۔ صبا اور قبا کے ساتھ رسا اور ادا۔ اختلاف حروف توانی کا احساس انارٹیوں کو کیونکر ہو۔ اور یہ بھی تو جوش جیسے ”شاعر انقلاب“ کو پروا کیوں ہو۔

ہم ہوں لب بستہ تو چپکے نہ فضا کے گلزار ہم ہوں خاموش تو چپکے نہ گلستاں میں نہار ہم ہوں ردپوش تو دھڑکے نہ دل لیل نہار ہم اگر جنبش فرگاں کا بجائیں نہ ستار لکھن دیا نہ رہے نفہ باراں نہ رہے

اک شاعر کے لئے ایسے مصرعوں کو شعر کی حیثیت سے پیش کرنا کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ ان سے کوئی شاعرانہ ریاضت کا ثبوت نہیں ملتا معلوم ہوتا ہے محض ادبی تجارت کے لئے اخباروں کے کالم پر کرنے کے لئے کہہ لئے گئے ہیں۔

اب ملاحظہ فرمائیے۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں ”بغیر مناسبات معقول“ صرف بہار کا چمکنا دیا ہی ہے۔ جیسے افق دل پر بادل کا گر جانا۔ اب آئیے پروفیسر صاحب ماہ پر راہ پر کیا آئے بیگانہ کے دائرہ پر چڑھ گئے۔ گویا مناسبات معقول موجود ہوتے تو بہار بھی چمکائی جاسکتی تھی۔ تو بندہ نواز بالکل اسی طرح حسینوں کے منگھڑوں

میں معقول مناسبت ہوتی (قبول آپ کے رنگ روغن) تو رنگ روغن میں
موج گہر کو غلطان کو اپنے پر حضرت نیاز بھی اعتراض نہ کرتے نہ پروفیسر صاحب
کو نہ مکھڑوں میں "کی جھوٹی تاویل میں کرنے۔ رنگ روغن میں برق گہر کو نڈانے اور
میرا میں کا مصرع بے محل پیش کرنے کی ضرورت پڑتی۔ اسی نرک مناسبت کی
وجہ سے حضرت نیاز کا اعتراض کا موقع مل گیا۔ بہار کے چلنے پر پروفیسر صاحب کی
تاویل ہے تو بے ضرورت مگر اس سے اتفاقا یہ ہوا کہ نیاز صاحب کا
اعتراض خود پروفیسر صاحب کے قول کے بموجب بالواسطہ صحیح ثابت ہو گیا۔ اب
یہ بھی سن لیجئے کہ بہار کے چلنے پر پروفیسر کی تاویل بے ضرورت کیوں ہے۔ بے ضرورت
یوں ہے کہ جوش نے بہار کا چھکنا کہا ہی نہیں۔ بلکہ ہزار کا چھکنا یعنی بیل کا چھکنا کہا
ہے۔ پھر خواہ خواہ کی تاویل کیسی؟ مدعی سست گواہ چٹا! ملاحظہ ہو رسالہ "مہ جکل"
مورخہ یکم جون ۱۹۲۲ء جوش کا اصل مصرع یوں ہے:-

ہم ہوں خاموش تو چپکے نہ گلستاں میں ہزار

حضرت نیاز کا اعتراض ہے۔ کہ جنبش مرگاں کا سار بجنا کوئی معنی نہیں رکھتا
ہم مرگاں کو بھی سار نہیں کہہ سکتے۔ چہ جائیکہ جنبش مرگاں "اس کے جواب میں
دیکھئے پروفیسر علامہ کیا فرماتے ہیں:-

۱) تار مرگاں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس بنا پر جنبش کے اضافے سے
مرگاں کو صورتاً تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

میں عرض کرتا ہوں بکثرت استعمال ہوا ہے تو ہو کرے۔ تار مرگاں تک تشبیہ
درست تھی۔ مگر مرگاں یا جنبش مرگاں کو آہ موسیقی (سار) سے تشبیہ دینا محفل ہر

۱) راہ ری ترقی پسند شاعری۔ جنبش مرگاں سار بن گئی۔ چھوڑ پون کی حد ہو گئی۔

بیسویں صدی کی حقیقی شاعری کے دور میں ایسی بھدی تشبیہ قابل نفرت ہے۔
(۲) پھر فرماتے ہیں۔ وجوہ تشبیہ پر غور فرمائیں۔ جنبش یا حرکت مرگاں سے لطیف
آواز پیدا ہونا لازمی ہے۔ اگرچہ وہ غیر سماجی ہی کیوں نہ ہو۔

آخر کیا مقصد ہے اس تحریر کا؟ پروفیسر صاحب خود اپنے تئیں دھوکا دے
رہے ہیں یا نیاز صاحب کو؟ جنبش مرگاں سے کچھ آواز پیدا ہوتی ہے تو ہوگی
سائینسیوں کے لئے۔ انسان کے کان جس آواز کو نہ سن سکیں وہ بھلا تشبیہ کیلئے کیونکر
کام آ سکتی ہے۔ استعارہ بھی محفل اور پروفیسر علامہ کی تاویل اس سے زیادہ محفل
کیا عرض کیا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشوت لیکر خواہ خواہ جوش کی طرف داری میں
قلم فرسائی کی گئی ہے۔ واہ جی واہ کیا ندی ہے اور کیا گواہ؟ بیسویں صدی میں ایسی
باد ہوائی بارت ایسی فرسودہ ذہنیت قابل افسوس ہے تعجب تو یہ ہے کہ ایسی
تحریر جو کاٹ کے پھینک دینے کے قابل تھی۔ اڈیٹر صاحب نے چھاپ دی۔ دل لگی تو یہ ہے
کہ یہاں بھی شرط درجہ سبب اور نتیجہ میں کوئی ربط نہیں۔ عورتیں جنبش مرگاں کا سار
بجائیں تو لجن دریا نہ رہے۔ واہ واہ۔ کیا شرط ہے اور کیا جزا؟ کیا سبب ہے اور
کیا نتیجہ؟ کیا یہ بات Common sense میں آ سکتی ہے۔ کہ شور دریا
(قبول جوش سخن دریا) عورتوں کی جنبش مرگاں سے پیدا ہونے والی غیر محسوس آواز
کا نتیجہ ہے؟ آخر یہ کیا ہے۔ خود فریبی ہے یا البلہ فری۔ کیا حضرت نیاز اس فیر میں
اسکے ہیں جو شخص فہم سلیم سے اتنا بے بہرہ ہو کہ جنبش مرگاں سے سار بجانے
لگے اس کی یہ حرات کہ میر تقی میر جیسے استاد پر منہ آئے جس سے فیض پائے اسی کا
مضحکہ اڑائے؟ تھو

لحن دریا ایک مہل سا استعارہ ہے۔ شور دریا کو لحن دریا نہیں کہہ سکتے۔ یہ جدت نہیں بلکہ (Frantic Novelty) ہے۔
 (۳) پروفیسر صاحب فرماتے ہیں: ”مقصد یہ ہے کہ ہماری تحریک مرگاں سے قدردانان حسن فطرت میں لحن دریا اور لغزہ باراں کا صحیح احساس پیدا ہو سکتا ہو اشارہ مرگاں کے ساتھ اگر یہ مناظر یکجا ہو جائیں۔ تو پھر کیا پوچھنا؟“
 آخر کیا رائے قائم کی جائے۔ پروفیسر کی یہ تحریر نتیجہ ہے کسی ثنوت کا یا کسی ہنسی ہوئی ذہنیت کا؟
 محض تحریک مرگاں سے قدردانان حسن فطرت میں لحن دریا کا احساس پیدا ہو جانا کیونکر ممکن ہے۔ غور تو فرمائیے۔
 اشارہ مرگاں کے ساتھ ان آثار فطرت (لحن دریا۔ لغزہ باراں) کا یکجا ہو جانا کیونکر ممکن ہے۔ کیا اس تحریر میں کوئی معنی کوئی معقولیت ہے۔ طلسم پوش ربا والے کی بکو اس بھی اتنی بے مزہ نہیں معلوم ہوتی۔
 افسوس ہے ترقی پسند دل کی ترقی پسندی ترقی کرتے کرتے بدحواسی کی حد تک پہنچ گئی۔ افسوس ہے اڈیٹر صاحب ”آجکل“ نے یہ تحریر بھی چھاپ دی جس سے بد مذاقی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہے۔
 اپنی ان مست نگاہوں میں لئے سو پیغام اور چیل کا کسان آنکھوں کے چھلکے ہوئے جام
 کھول کر دوش پس کا کل شب نگ کے دم ہم اگر سخن چمن میں نہ کریں مشق خرام
 جرج پر دلولہ ابر خراماں نہ رہے
 پھر وہی کا کل لنگی۔ کم خبت زلف و کا کل کی شاعری شاعر انقلاب کا پیچھا

نہیں چھوڑتی۔ دلولہ ابر خراماں ظاہر ہے کہ مہل سی بات ہے جتنی تاویل کی جائے فضول ہوگی۔ دوش پر کا کل شب رنگ کا کھولنا شرط۔ اس کی جزا ابر میں دلولہ پیدا ہو جانا بالکل جھوٹ ناممکن۔ بیگانہ آرٹ کے زمانہ میں ایسی جھوٹی شاعری قابل شرم۔ قابل افسوس۔

نوٹ:- دافع رہے کہ یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے حضرت نیاز کی تائید تو ہوتی ہے اور یہ محض اس وجہ سے کہ میں نے ان کے اعتراضات کو صحیح سمجھا۔ مگر جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ کبھی مجھ پر نیاز صاحب کی جذبہ داری کا شبہ نہیں کر سکتے۔ مجھ سے نیاز صاحب کے کوئی خاص تعلقات نہیں۔ اور جو کچھ تعلق ہے بھی وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے برعکس میرے اور جوش کے ذاتی تعلقات خوشگوار ہیں اور رہیں گے۔ مگر ان خوشگوار تعلقات کا اثر شعرو ادب پر نہیں پڑ سکتا۔ جوش کی شاعری اجتماع ضدین ہے۔ ان کی سچی باخیاں نہ نظم کوئی کامیں ہمیشہ سے قد شناس ہوں۔ مگر شاعر معتبر شاعر کی حیثیت سے وہ ناقص کے ناقص ہی رہے ان کی جھوٹی اچنبھا نگاری انکی عیاں شانہ شاعری کا میں ہمیشہ سے مخالف ہوں۔ کیونکہ اس سے ادب اور اخلاق کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اتنا کہہ جانے کے بعد یہ بھی کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور کی نظمیات کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں جس میں پنجاب اور دکن بھی شامل ہے جوش کی ٹکڑی کا ناظم کوئی نہیں۔ اب رہا شعر تو حقیقی شعر کے میدان میں یاد رکھئے ع غالب کے چچا کے آگے سب ڈھینڈس ہیں

کھل گئے عیب ہنر سب کا تب تقدیر کے
زنگ ہیں آمادہ پرواز ہر تصویر کے

پہلا مصرع سنکر کان کھڑے ہوتے ہیں کہ کاتب تقدیر میں عیب کیسا؟ مگر دوسرا
مصرع سنتے ہی حیرت ہی کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ شاعر نے کتنی بدیہی حقیقت
کی طرف اشارہ کر کے خامہ تقدیر میں عیب نکالا ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ خامہ قدرت
کی صفت ہے آپ اپنی مثال مگر کوئی تصویر ایسی نہیں کچھ جس کے رنگ و روغن
کو ثبات ہو۔ ہر تصویر کا رنگ آمادہ پرواز ہے! اس سے بڑھ کے عیب کیا ہوگا۔
بقول پروفیسر سنت نام مدہوش اس شعر میں جو *subtle humour*

ہے شاید ہی اسکا کوئی جواب ہو سکے۔ کاتب قدرت پر اتنا بڑا الزام اور اتنا صحیح؟
اک گریجویٹ صاحب فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں کاتب تقدیر کے عیب کا
ثبوت تو ملتا ہے مگر ہنر کا ثبوت نہیں ملتا۔ حیرت و تاملے یا نہ ملے مگر اس گریجویٹ
کو اردو کے شعر خصوصاً یگانہ آرٹ کو سمجھنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ یہاں کاتب قدرت
کے عیب ہی کا ثبوت دینا تھا جو دیدیا گیا، اتنا مکمل جس کی رد ممکن نہیں مگر کاتب قدرت
کی ہنرمندیاں تو اتنی بدیہی اتنی عالم آشکارا ہیں کہ گنوار سے گنوار کو بھی ثبوت مانگنے
کی ضرورت نہیں۔ میرا نہیں فرماتے ہیں۔

ہر سوتری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
کارخانہ تھا ہوا چرس مشیت خاک کا
کوئی بندہ عقل کا ہر کوئی بندہ عشق کا
شوق منزل میں مین پر پاؤں تک پڑ نہیں

خاکیں مل جائیگی سب عزت مردانگی
یا س سر سے پاؤں تک امید ہی امید
فرد جب تک ہاتھ میں تھی کاتب تقدیر کے

ہے جان کیسا تھا اور اکایان کا ڈر بھی
وہ ہم سے نہیں ملتے ہم ان سے نہیں ملتے
اندھی بیتابی دل وصل کی شب کو
انگڑائیاں لے لے کے اٹھے صبا محفل
وہ کشمکش غم ہے کہیں کہیں نہیں سکتا

کھول آنکھیں ذرا سہت گیا سا عجم
دیکھ کوئی جاتی ہوئی دنیا کا تماشا
بجھتی ہوئی اک شمع ہوں کیا دم کا بھروں
کس شان آتی ہو مری تمام مصیبت
صحرا کی ہوا کھینچے لے جاتی ہے جھکو

ہاں کٹ گئی شاید ترے دیوانے کی ٹہری
کیا وعدہ دیدار کو سچ جانتے ہو یا س
اللہ مبارک کرے پیری کی سحر یا س

مرنے کی تمنا تھی تو لے اب کہیں مر بھی

دل عجب بوجہ مہم دکھاتا ہے مجھے

شام سے یاس سویرا نظر آتا ہے مجھے

جلوہ دار و رسن اپنے نصیبوں میں کہا
کون دنیائی نگاہوں پر چھٹا ہے مجھے
دلکو لہراتا ہے ہنگامہ زندانِ بلا
شورائید اطلبی وجد میں لانا ہے مجھے
پائے آزاد ہے زندان کے چلن سے باہر
بڑیاں کیوں کوئی دیوانہ پھاتا ہے مجھے
ہنس کے کہتا ہے کہ گھر اپنا قفس کو سمجھو
سبق الٹا مرا حسیا ڈھاتا ہے مجھے
جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کسترد و اعظم کار ڈھاتا ہے مجھے
پھٹ پڑیں اب بھی دردِ با تو پردہ رہ جا
فلک خانہ خراب آنکھ دکھاتا ہے مجھے
دینی ہر چمن آرائی چشمِ عبرت
سیر تازہ گلِ تر مردہ دکھاتا ہے مجھے
ننگِ محفلِ مرانزدہ مرادہ بھاری
کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے
دوسرا مصرع کتنا ٹیڑھا تھا۔ مگر مصرع لگا کر شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ننگِ محفل
مرانزدہ یہ یاس ہی کہہ سکتے تھے۔ غالب نے بھی کہنے کو کہا ہے ۵

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھاتے تھے دیکھئے مرگئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے
مگر میرزا یاس نے ایسا منجھا ہوا ہاتھ مارا ہے کہ نگاہِ تنقید حیران رہ جاتی ہے۔

لب دریا کا ہوا میں نہ تہ دریا کا
کون سے گھاٹ دیہارا لے جاتا ہے مجھے
یاس منزل ہر مری منزلِ عشاق کمال
لکھنؤ میں کوئی کیوں ٹھونڈھے آتا ہے مجھے

اتزل سے سخت جاں آلودہ صدا متیاں آئے

عذابِ چند روزہ یا عذابِ جاوداں آئے

اینا طلبی سخت جانی کی طرف سے چیلنج ہے کہ عذابِ چند روزہ ہو یا عذابِ جاوداں
آزاد جس طرح جی چاہے بیسیں صدی میں زندگی کا کیس بل کی سختی کو ملا ہی نہیں
کنول روشن تو ہو بل کا پیما ناگہاں آئی بلا سے شامت پروانہ آتش بجال آئی
پیام ناگہاں کا یہ زور شور آج سے پہلے شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ یہ وہ حوصلہ مند
ہستی ہے جس کے دل کا کنول آگ میں کود پڑنے ہی روشن ہوتا ہے۔

بہارستانِ عبرت میں یہ گل کیا خار کیا جس کیا
سراپا سب کے سب آلودہ نگہ خاں آئے
خیال خام ہے یا معنی مہم کیا جا میں
سمجھ میں راز و فدا کیوں نصیب دشمن آئے
زہرِ احسانِ بر حال کہ دن کے دن اسیر کو
اجل کیا تھ حکم باز گشتِ آشاں آئے
کیا دردِ انگیز سین ہے۔ باز گشتِ آشاں کا حکم ملا تو کب؟ بس دن کے دن حکم رہائی اور
موت کی آمد کا ایک ہی وقت مقرر ہوا۔ بھلا اس احسانِ بے حاصل اس مفت کرمِ داستان

کی کیا داد دی جائے؟
دہی آغوش ساحلِ ادوی منجھ ہار ڈوبے پلٹ کر خاکیں ملے کہاں کچھ کہاں آئے؟
مشاہدہ بھی کرتے ہیں مگر جنگ کی زبان سے یہ نہن دہی منجھ ہار کے ڈوبے دہی آغوش سال۔
منجھ ہار میں ڈوبے تو سہی مگر خاک کے خاک کو اپنے ہی آغوش میں کھینچ لیا۔

حق اپنی دھن کا پتکا۔ باطل اپنی دھن میں پورا
الہی گفتگو صلیح کیونکر درمیاں آئے
سکونِ بیدی میں کیا ہو کیوں لہر پیا ہے؟
مبادا غیب سے کوئی نوید ناگہاں آئے!

حرم ناز کیا ہے؟ جلوہ گاہ بے تماشا ہے، نگاہ یاس کہتی ہو کہ ہر آئے کہاں آئے

زمانہ پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے

دکھا وہ زور کہ دنیا میں یادگار رہے

یہ ہے زندگی کا کس بل۔ یگانہ نے کر کے دکھا دیا سالک کی طرف اور وہ ایک طرف۔

کہاں تلک دل غمناک پردہ دار ہے زبان حال پہ جب کچھ اختیار رہے

فراز دہرے کیا کیا نہ کرو میں بدلیں مگر ہم ایک ہی پہلو سے مقید رہے

قبطہ اضطراب کی کشمکش قابل دید ہے۔ زمانے نے کیا کیا کرو میں بدلیں کیا کیا مصیبتیں

ڈالیں۔ ہم شدتِ درد سے مقید ابھی رہے۔ مگر ایک ہی کڑ سے دیکھے یگانہ کی شاعری کا مزاج کتنا مردانہ ہے۔

ابھارتی ہے ہوس تو بے ریائی کی کہ دل کیسا تھڑباں کیوں گناہگار ہے؟

ریاکاری کا تقاضا یہ ہے کہ دل اگر صدق نیت کے ساتھ توبہ کرنا نہیں چاہتا نہ سہی

زبان کیوں گناہگار ہے۔ توبہ کر لے جھوٹ موٹ سہی۔ سبحان اللہ کیا نفسیاتی حقایق

ہیں اور کس آسانی سے دو مصرعوں میں بیان کر دئے گئے ہیں۔

ہنسی میں غرض متانہ اڑ گئی واسطہ تو بیگناہوں سے اچھے گناہگار رہے

جواب دیتے تو رُو کسی غریب کا دل بلا سے کوئی سراپا امید دار رہے

منزل عشق بقدر گناہ ناممکن یہی بہت ہے کہ برہم مزاج یا رہے

دکھا دوں چیر کے دل درد دل کہوں کہنک زبان پہ کیوں یہ تقاضا نہ ناگوار ہے

رُپ رُپ کے اٹھاؤ نکاز زندگی کے فرے خدا نکرہ مجھے دل پہ اختیار رہے

زمانہ اس کے سوا اور کیا دفا کرتا چمن اُجڑ گیا کانٹے گلے کے ہار رہے

خزاں کے جم سے مٹاؤتِ تفت کا بھگڑا چلو یہ خوب ہوا گل سہے نہ خار ہے

یگانہ حال تو دیکھو زمانہ سازوں کا ہوا میں جیسے بکولا خراب خواہ ہے

جب تک خلش درِ دُخلا دورِ سیگی دنیا دل ناخدا کی آباد رہے گی

دنیا کی ہوا اس نے آسنگی کسی کو سرس میں ہوائے عدم آباد رہے گی

چونکے گی رہ رہ کر تو غفلت کا فر کیا ساتھ اپنی آجل صورت بھڑو ہے گی

دل اُودھ کر گستاخِ ادب گاہِ قفس میں شاید یہ زبان تشنہ فریاد ہے گی

ادب گاہِ قفس اور تشنہ فریاد، دل میں بلبل برپا کرنے والی الہامی صدا نہیں ہیں۔

قفس میں نالہ فریاد کا خیال خام تھا ہاں تو پاس ادب سے زبان کھولنے کی مجال نہیں۔

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بکولا مٹنے پہ بھی اک ہستی برباد ہے گی

ایسا شعر یگانہ ہی کے حکیمانہ دماغ سے نکل سکتا تھا جسکی مثال نیا بابتی برباد وہی صحرا کا بکولا

کی اتنی صحیح تصویر قنایں بقا کا ایسا اچھوتا نقشہ یگانہ جیسے Gemini کے سوا اور کس سے ممکن تھا۔ جل جلالہ۔

کس قدر شرم کی بات لکھنو کا اک ترقی پسند پروفیسر یگانہ آرٹ کو اتنا کہنے پر مٹھو ہانا چاہتا ہے

The lofty geniuses have a talent of their own which the vulgar minds will never understand. (Rousseau)

شیطان کا شیطان فرشتہ کا فرشتہ انسان کی یہ بوجھ یاد رہے گی

یہ وہ صد اکبری جی فلسفہ و حکمت کو خلف اٹھانے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔
 ہر نام ہوئی صبح واک خواب فراموش (علیحدہ سنہ ۱۹۲۵ء) دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
 ہندوستان میں ہزاروں اہل دل ایسے بھی ہیں جو اس شعر پر بیگانہ کو محبت و احترام کیا تھا
 یاد کرنے پر مجبور ہیں، آج نہیں میں برس پہلے سے سنتے آئے ہیں یہ دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
 مگر انہیں ہے جوش خان نے اپنے اک فلمی گانے میں داخل کر کے شعر کی مٹی خراب کر دی۔
 شہر ہے بیگانہ تری بیگانہ روی کا واللہ یہ بیگانہ روی یاد ہے گی
 درد میر تھا سجدہ شام و سحر میری لئے درد دل تھمرا دو اے درد میری لئے
 یہ شعر مکمل انسانیت کا وہ مجرب نسخہ ہے جس سے زندگی کی تلخیاں رفع ہو کر دل دماغ کیلئے
 باعث اطمینان ہوتی ہیں۔

درد دل کیو اسطے پیدا کیا انسان کو زندگی بھر کیوں ہوئی درد میری لئے؟
 پہلا مصرع خواجہ میر درد کا ہے۔ مگر دوسرا مصرع لگا کر حیرت میں ڈال دیا ہے۔
 حسنِ نادیدہ کجا اپنا ہی پردہ کھل گیا آسمان ثابت ہوا حدِ نظر میرے لئے
 حسنِ نادیدہ کا پتا تو کیا ملتا کوتاہ نظری نے اپنا ہی پردہ فاش کر دیا کتنا اچھوتا کتنا
 مکمل شعر ہے کیا سمجھا ہوا اتنا مارا ہے؟ زندہ باد۔

فطرت مجبور کو اپنے گناہوں میں سے شک دار کیا کب تک توبہ کا درمیں لے؟
 فطرت مجبور کی خطا ثابت ہی نہیں ہو سکتی تو پھر تو کسی درد تو بہ کھلا ہے تو کیوں بیکہ ظریفانہ طنز
 شکر سے تسکین نہیں ہوتی شکایت ہی ہی کچھ وظیفہ چاہیے شام و سحر میرے لئے
 کس محبت دلِ گم گشتہ دیتا ہے صدا آ۔ ادھر پھر تباہی آوارہ کرد میری لئے؟
 لے چلا ہوں وعدہ فردا کو میں باندھ کر چاہیے ہو اور کیا زادِ سفر میرے لئے

بزمِ دنیا میں بیگانہ ایسی بیگانہ روی؟ میں نے مانا عجیب لیکن ہنسی لے
 دنیا دار ہونے پر بھی میرزا بیگانہ نے اپنی بیگانہ روی جس حد تک برت کر
 دکھائی وہ انھیں کا کام تھا۔

نیش درد و نوش دریاں بزمِ تابعدار دے نیشِ کل مرگ آساں بزمِ تابعدار دے
 از خزاں آباد عالمِ خوش را در دیدہ ایم رنگ بوی اس گلستاں بزمِ تابعدار دے
 در بہارِ خورش آسودہ نتواں زیستن خار ویرا ہن جاں بزمِ تابعدار دے
 خوش سرو کارے مراد در سراقتا دست دہشت پاک گشتہ از اندیشہ تعبیر بد
 اعطش او ساقی خمیازہ عمِ العطش نشہ و عیش لیشیاں بزمِ تابعدار دے
 دوزخ خود را بہشتے سازم از اعجازِ عشق جاکل آتش بدماں بزمِ تابعدار دے
 بہرہ از عقل چو۔ یا فیضے از دیوانگی پندیر و سنگ طفلان بزمِ تابعدار دے
 وقت خوش با شمع بے پروانہ دارم دیدنی صد نیاز و ناز گستاخانہ دارم دیدنی
 تشہ آغوش من حورِ جاں بیرون در طرفہ مہمانے درون خانہ دارم دیدنی
 شمع را عریاں ہی نیم حجابِ ندر حجاب سرمہ ساز خاکستر پروانہ دارم دیدنی
 ایکہ پر سی تشہ درد نہانم از کجاست باوہ بزرگ در پیمانہ دارم دیدنی
 فیضِ تنہائی سلامت یاد آئے من جھٹے در گوشتہ غم خانہ دارم دیدنی
 کس بہ دردم کے رسد خبرنا گئے ناچھے دوست نادائے دل دیوانہ دارم دیدنی
 بوسے گل را در گرہ بندم نہ دیوانگی در قص با زیکہ طفلانہ دارم دیدنی
 منکہ سیلابِ بلارا پیش پا افتادہ ام بے سرو پا ہمت مردانہ دارم دیدنی

میتواں خواند از جہنم با چراغ سوز دل
شع روشن اندریں ویرانہ دارم دیدنی
ہر دو منزل را ز جمع کجرت روشن گنم
خندمتے در کعبہ و تنخانہ دارم دیدنی
ہر کس ناکس بگناہ لاف نیکمائی زند
دست بالا پر سر بگناہ دارم دیدنی
کار گاہ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اجر تری ہی ایک سمت بتی ہے
ایک طرف اجر تا ایک سمت بسا یہ سلسلہ کون و نسا دنا متا ہی ہے۔

حسن بے تماشائی دھوم کیا مٹا ہے؟
کان بھی ہیں نامحرم آنکھ بھی ترستی ہے
حسن بے تماشائی حقیقت کی دھوم ہی دھوم ہے نہ آنکھوں کے دیکھانے کا نوں نے توڑ سٹی۔
چونوں سے ملتا ہی کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر سادگی برستی ہے!
شعر سنتے ہی سننے والے کا ذہن انسانی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرتے پر مائل
ہو جاتا ہے۔ تجسس کی خواہش قوت بیدار ہو جاتی ہے۔

ترک لذت دنیا کیے تو کس دل سے؟
ذوق پارسانی کیا؟ فیض تنگدستی ہے
فلسفہ اور شعر لازم و ملزوم ہیں۔ دو کسر لفظ نہیں یوں سمجھے کہ شعر نتیجہ ہے شاعر اور
فلسفی کے اتحاد عمل کا۔ چاہے اور لوگ حقیقت سے یا حقیقت کی پرچھائیں سے بھی دور
بھاگنا چاہیں مگر شاعر کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے حقایق میں ڈوبا ہے۔ کون
انکار کر سکتا ہے اس حقیقت سے کہ محض تنگدستی کے ہاتھوں لوگ پارسانی کا دم بھرتے ہیں
ورنہ ترک دنیا کوئی آسان کام ہے؟ فیض تنگدستی کتنی تازہ و پرانی ترکیب ہے اور اس طنز سے
کلام میں کتنا درد پیدا ہو گیا۔

بیدلوں کی ہستی کیا؟ جیتے ہیں نہ مرنے ہیں
خواب ہے نہ بیداری۔ ہوش ہے نہ ہستی ہے
زندگی میں اس اجتماع ضدین کا بھی اک وقت آتا ہو یہی عالم بیدی گویا مگر توفی ہے۔

کیسا دل کیا ہے؟ خاک سے مگر کیسی؟
لیجے تو جھنگ ہی ہے۔ لیجے تو سستی ہے
یہ شعر شعری حد سے گزر کر کالم کی حد میں داخل ہو گیا ہے۔ بلکہ ساری غزل اہل متنوع
ہے غزل سے حذر رکھنے والے "ترقی پسند" عجب نہیں مٹھا ٹھاکر یہ کہہ دیں کہ یہ غزل کیا ہے۔
یہ تو شر ہے۔ ہاں اس اعتبار سے انکا کہنا صحیح ہو گا کہ غزل کی غزل اتنی رواں اتنی برجستہ ہے کہ
اسکی نثر کرنا چاہو تو ناممکن۔ مگر زندگی کے حقایق سے اسقدر لبریز اور لفظ و معنی میں اتنی ہم آہنگی
اتنا نرم کہ کوئی نقص اُٹا نہ چاہے تو بن نہ پڑے۔ بڑی ریاضت کے بعد ایک *monstrous* ہی
اس مرتبہ پر فائز ہو سکتا ہے۔ یہی وہ آرٹ ہے جس کی بازار میں کوئی قدر قیمت نہیں۔ جھوٹے
اور سچے آرٹ کی پہچان ہی ہے۔

کیا بتاؤں کیا ہوں میں قدرت خدا نہیں
میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے
خضر منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھے کہ ہستی ہے
کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا؟
فکر کی بلندی یا عوصلہ کی پستی ہے!
Faust's conviction that no pleasure can completely satisfy him, implies Goethe's own deep rooted belief as to the existence in man of that Divine discontent which ever sets itself higher goals & can never be stilled
عوصلہ کی پستی اور فکر کی بلندی دونوں صورتوں میں سفر نامہ تمام رہتا ہے۔ فکر کی بلندی
کوئی حد و نہایت نہیں رکھتی عمل ارتقا کبھی ختم نہیں ہوتا۔

دیدنی ہے پاس اپنے رنج و غم کی طغیانی
جھوم جھوم کر کیا کیا یہ گھٹا برستی ہے

زمانہ خدا کو خدا جانتا ہے یہی جانتا ہے تو کیا جانتا ہے
علمائے مذہب یا فلسفیوں نے خدا کے وجود کے بارے میں جتنی دماغ سوزی کی ہے
اُن سب کو دیکھ جانے کے بعد مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے جو ان دد مصرعوں میں کیا گیا ہے
فلسفہ و مذہب کی تفصیلات، شعر کے اس اجمال میں سمٹ آئی ہیں اس اجمال سے جو
سکون و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے وہ مفصل و مطول تصنیفوں سے میسر نہیں آتا۔

اسی میں دل اپنا بھلا جانتا ہے کہ اک نا خدا کو خدا جانتا ہے
غالباً اشارہ ہے مولا علیؑ کی طرف جل جلالہ
وہی مجھ چھپا نا وہی لن ترانی تو اسکے سوا اور کیا جانتا ہے؟
خدا ایسے بندے سے کیوں پھر نہ جا؟ جو بیٹھا دعا مانگتا جانتا ہے
سبحان اللہ یہ لفظ بیٹھا کہاں پر آیا ہے کتنا ٹھیک بیٹھا ہے اور کتنا معنی خیز ہے۔ یہ
یگانہ کا مذہب اور یہ ہے پیغامِ عمل۔ انسان اسلئے پیدا نہیں ہوا کہ بیٹھا دعا مانگتا
رہے۔ عمل کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ بھلا ہو یا برا ہو کچھ کچھ کرنا چاہیئے۔ کرتے کرتے برائیوں میں
بھی بھلائی کا پہلو نکل آتا ہے۔ اس کا مزہ کام کرنے والا جانتا ہے۔

غزل کی مخالفت کرنے ہوئے اک نوجوان ترقی پسند پر دفیہر نے غزل اور غزلت کی بھی کھتا ہو کہ۔
”نقاد جو اثر کسی شعر یا شاعر سے لیتا ہے اسے جزر و روافظ میں دوسروں تک پہنچا
دیتا ہے، وہ کسی اصول نقد کی فکر نہیں کرتا۔ صرف حسن کی جستجو کرتا ہے اور یہ حسن اسکی
اپنی نگاہ کی تخلیق کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اسکی تلاش میں وہ دُور دُور چلا جاتا ہے اور سمجھتا
ہے کہ تمام لوگ اسکے ساتھ ہیں حالانکہ زیادہ تر ایسا نہیں ہوتا۔“
پرفیسر کی یہ تقریر خود اسکی تفصیل گوئی ہے۔ کوئی نقاد اگر شاعر کے کسی شعر کا اثر

لیتا ہے اور صحیح اثر لیتا ہے تو یقیناً اور لوگوں پر بھی اثر ہوگا اگر وہ اثر لینے کی صلاحیت
رکھتے ہیں۔ اگر انکار سیدھیک ہے کنکشن ملا ہوا ہے تو اثر نہ ہونا کیا معنی؟ وہ بھی
نقاد ہی کی طرح اثر لیں گے اور ہیکا احساس جتنا تیز ہوگا اتنا ہی زیادہ اثر ہوگا۔

نقاد اصول تنقید کا پابند کیوں نہیں ہوتا؟ سب بڑا اصول تنقید تو یہ ہے کہ
شعر مقتضائے حال یعنی زندگی کے مطابق ہے کہ نہیں؟ اسکے علاوہ اور بہترے
اصول تنقید ہیں جن پر نقاد شعر کو پرکھتا ہے۔ اک سچا اور دیندار نقاد یہ بھی جانتا
ہے کہ ہر *Genre* کا آرٹ خود اپنے معیار پر پرکھا جاتا ہے۔ پر اسے معیار پر جانچنا
نہیں جاتا۔ یہ غلط ہے کہ شعر کا حسن محض نقاد کی نگاہ کی تخلیق ہوتا ہے بلکہ احساس
حسن نقاد اور سماج میں مشترک ہوتا ہے (کہیں خوابیدہ کہیں بیدار) احساس حسن
میں یقیناً سماج بھی نقاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ ناممکن ہے کہ شعر کا حسن جو نقاد
ظاہر کرتا ہے وہ سمجھانے پر بھی سماج کی سمجھ میں نہ آئے۔ مگر ہاں سماج کے وہی افراد
اُس حسن کو محسوس کر سکیں گے جنہیں شعر کا اثر قبول کر نیکی صلاحیت موجود ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اس شعر میں (جو بیٹھا دعا مانگتا جانتا ہے) جو پیغامِ عمل دیا
گیلپے سماج کو اس پیغام کی سچائی کا احساس نہیں۔ کوئی سچا شاعر کسی بے بنیاد
بے حقیقت بات کو جو انسان یا سماج کے تجربہ میں نہ آچکی ہو شعر کا موضوع بنائی نہیں
سکتا۔ محاسن شعری کے احساس میں سماج بھی نقاد کے ساتھ ہوتا ہے یا ہو جاتا ہے
بقدر شعور و استعداد۔

بعض نام نہاد ترقی پسند بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یگانہ آرٹ کے زمانے میں غزل کو
ایامِ جہالت کی یادگار ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ غزل سُندا اور اس سے اثر لینا نہیں چاہتے۔

بڑے ملحد سے کہتے ہیں کہ غزل گوئی کا دور ختم ہو چکا۔ مگر یہ دل کو جھوٹی تسلی دینا ہے حقیقت سے آنکھ پھرانے ہے۔ تعجب ہے کہ گزشتہ پچیس سال میں ان لوگوں نے جو سب بڑا تخریبی کام کیا ہے اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے یعنی اردو زبان سکھنے اور اسکے قواعد و ضوابط اور ذوق کی پابندی کا جو بندھا ہوا دستور تھا اس سے آزاد ہو جانا شعر و سخن کی فنی ضروریات کو فضول ٹھہرا کر مد نظمی پھیلا دینا۔ اخباروں اور رسالوں میں ادبی مباحثے بند کر دینا اس کا رگزار ہے تو یہ لوگ جتنا چاہیں ناز کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے یہ کیوں؟ ہاں خوب یاد آئی کہ کوئی اتنا تو پوچھے کہ ترقی پسندوں میں ایسے کتنے آدمی ہیں جو آیات و جدائی کے متن کو صحیح اور موزوں پڑھ کے دکھا دیں۔ یہ لوگ اتنی بھی تو اہلیت نہیں رکھتے۔

اک بات قابل غور یہ بھی ہے کہ جب ترقی پسندوں کیلئے فن شعر و سخن اور زبان کے قواعد و ضوابط کی ضرورت نہیں ہے تو پھر مدراس والوں کو زیادہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اردو میں ادب جدید کا اضافہ کریں کیونکہ جب اردو کو نئے نئے خیالات (غیر طبعی۔ اوٹ پٹانگ) نئے نئے اسلوب ہی کی ضرورت ہے، تو پھر مدراس والے زیادہ تخریبی قابلیت کے ساتھ نئے نئے خیالات پھیلانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور ان کا دعویٰ ترقی پسندوں کی تخریبی کوششوں کے مقابل میں صحیح ہو گا اور وہ یہی کہ زبان اور فن کے قواعد و ضوابط کی کوئی ضرورت نہیں۔ خیالات میں جدت ہو (خواہ وہ جدت کسی کام کی نہ ہو فضول ہی ہو) اشتراکیت اور انقلاب کی ہر بونگ ہو عریانی ہو فحاشی ہو۔

فرشتوں کی پرواز کو ماننا کیا جو دلی ٹرپ کو رسا جانتا ہے
برائی میں تو دیکھتا ہے بھلائی تو کیا بوم کو بھی ہما جانتا ہے
Optimism اچھی چیز ہے بشرطیکہ اسکی عادت بیماری کی صورت نہ اختیار

کر لے۔ کوئی کتنا ہی رجائیت پسند بننا، برائی میں بھلائی کا پہلو نہ نکالتا چاہے مگر اُلٹا
اُلٹا ہی رہے گا۔

کدھر جا رہا ہے ترا خون گرفتہ مگر غریب کا راستا جانتا ہے
نہے سہو کا تب کہ سارا زمانہ بھٹی کو سراپا خطا جانتا ہے
یہ ہے سماج کی ذہنیت کہ اپنی عقل پر زور دیکر سمجھنے کی کوشش تو کرتا نہیں پرچہ نویس
نے جیسا سمجھا دیا اسی کو باور کر لیا۔ کو آکان لئے جاتا ہے پیچھے پیچھے دوڑے جاتے
ہیں۔ دنیا نے کوئی صنف ایسی ایجاد ہی نہیں کی جو غزل کی مختصر نگاری، سادگی و پرکاری
کا مقابلہ کر سکے۔

الو کھا گنکار یہ سادہ انسان! نوشتے کو اپنا کیا جانتا ہے!
حیرت میں ڈال دینے والا لالہ وال شاہکار ہے۔ شاعر حقیقی کی تخلیق تو کر سکتا
نہیں۔ ہاں انداز فکر اور انداز بیاں میں وہ طاقت ہے جو حقیقت کو اندھیرے سے
نکال کر اجالے میں لے آتی ہے۔ زندہ باد بگیا نہ زندہ باد۔

وہ کیوں پھول توئے وہ کیوں پھول سو گئے جو دل کا دکھا نا برا جانتا ہے
انسانی زندگی کی کتنی دردناک حقیقت ہے جو پھول کے پردے میں بیان کی گئی ہو۔
اس *revelation* میں اشارہ ہے اُن ظالم حکمرانوں کے جابرانہ تصرفات کی طرف
جو اپنے جبر و قہر کے ساتھ ساتھ مذہب اور اخلاق کا بھی دعویٰ کرتے تھے۔

یگانہ تو ہی جانے اپنی حقیقت تھے کون تیرے ہوا جانتا ہے؟
ایسے مکمل آرٹ کو ترقی پسند پروفیسر انسانیت کیلئے بے سود ٹھہراتا ہے حقیقت روشن
سے آنکھ چراتا ہے۔ اک اور کچ فہم پروفیسر کی ذہنی حالت اور زیادہ قابل رحم ہے جو

غزل جی مکمل اور ترقی یافتہ صنف کو گویا "نیم وختیانہ" شاعری یاد رکھنا چاہتا ہے۔
یہی وہ فتوریت یہی وہ شامتِ اعمال ہے جو کسی قوم کو پیٹنے نہیں دیتی۔ مگر
ان لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے: — *His art provides an*
effectual antidote to that detestable
sophistry (فیلسوفیت) which has been imported from
foreign countries under the false name (ترقی پسند ادب)

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مائے بیابا کھڑا ہو دریا کنارے
دکھ درد تو ہی سمجھے نہ سمجھے گونگا تو گونگا کس کو پکارے؟
یہ ہے شعر کی وہ سادگی وہ پُرکاری وہ اثر انگیزی کہ سننے والا سانس میں آجاتا ہے

بندوں سے اپنے اتنا غافل؟ چو کھٹ یہ کوئی سرفے نہ مائے؟
قربان تیری آنکھیلیوں کے خود سر خرچہ ہے خود مارا تائے؟
اندری مشیت جسے بلندی پر پہنچاتی ہے اسی کو خاک پر دے مارتی ہے۔
مشیت ایزدی کو آنکھیلیوں سے تعبیر کرنا کس غضب کی شوخی ہے اور اس شوخی سے
کیا لاڈ لاپن ٹپکتا ہے۔

یہ ٹھیکہ لفظ اس پر معنی انداز سے اس طنز آمیز حسن کے ساتھ کون لا سکتا تھا بھروسہ
اس مقام پر کہ مخاطب اس کا خدا ہے۔ میرزا یگانہ بلا ضرورت نئے الفاظ تراشنے کی
کوشش نہیں کرتے گھٹا درجہ کی جدت کوئی بڑی بات نہیں ہے میرزا صاحب
یہاں اسی پرانے لفظ (آنکھیلی) پر تیا تصرف کر کے قوتِ اختراعی کا ثبوت دیا ہے۔

حسنِ تصرف بھی ایجاد و اجتہاد کا نتیجہ ہوتا ہے۔
اُف ریشیت پھولے تو لاکھوں پھلے نہ دیکھے سارے کے سارے
کرشمہ فطرت پر کیا خوب نکتہ چینی ہے۔ کیا حسرت انگیز نظارہ ہے مگر نظامِ فطرت
میں کسی کو کیا دخل؟ دیکھئے تو سہی یہ کتنا عام مشاہدہ ہے مگر کسی نے آج تک اس
دوسو برس کے اندر اتنے درد انگیز شعر کی صورت پیش نہیں کیا۔
کرنی کسی کی بھرنی کسی کی بے موت مرنا غیرت مائے؟
شعر ضربِ التل کی حد کو پہنچ گیا۔ غزل کی غزل سہل متنع ہے جس کی تقلید
کسی کے بس کی بات نہیں۔
فقتہ بھی یا مال۔ اپنا بھی یہ حال کروٹ بد لئے کس کے سہارے؟
شعر اگرچہ *universal* ہے مگر فی الحال تو خستہ حال ایرانیوں کے
حسب حال ہے۔

اتنا بھی سیدھا سادہ چلن کیا ایسے کو کوئی کیونکر بھارے؟
یہ شعر بھی اگرچہ *universal* ہے لیکن ترکوں کے حسب حال ہے۔
جنھیں جنگ پر کوئی اٹھار نہ سکا۔

ٹکڑا کے دیکھیں تم کیا ہو ہم کیا جیتے تو جیتے ہائے تو ہائے!
دوسو برس کا لٹریچر اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا یہ میرزا یگانہ ہی کہہ سکتے تھے۔
یہ ہے منجملہ بہادروں کی عملی زندگی۔ اردو کے ٹھیکے روزمرہ سے میرزا صاحب ایسے ایسے
معانی بلند پیدا کئے جو غالب جیسے مخور کے تصویر میں بھی آ نہیں سکتے تھے۔
یہی ہے لیلیٰ۔ اندھا ہے اندھا مشتاطہ چاہے جتنا سنو لے

الفاظ اتنے متعارف اتنے پیش پا افتادہ مگر شعرا اتنا اچھوتا اتنا حیرت انگیز جس کی نظیر نایاب۔ حالانکہ پہلے کوئی نیا لفظ نہیں لایا گیا پھر بھی شاعر کی قوت تخلیق آشکارا ہے۔ لیلیٰ کا لکھی ہو یا گوری، اندھے کے لئے یکساں ہے۔

حسن بیکانہ اللہ اللہ یہ بھیس بدلے یہ روپ ڈھالے؟
حسن پر فرعون کی بھتیجی کہی ہاتھ لانا یا رکیوں کیسی کہی؟
حسن کے ساتھ عشق و محبت جتنا تاواک سدھارن سی بات ہے۔ مگر یہاں حسن مغرور کو چڑھانے کی سوچھی ہے اور نئی سوچھی۔ فرعون کی بھتیجی۔ پھر اس پر داد بھی چاہتے ہیں کیوں کیسی کہی۔ سبحان اللہ

کون سمجھاے کہ دنیا گول ہے آپ جیسی مہنی و سہی کہی
جو نو گول ہو اس کی سمجھ میں کیونکر آے کہ دنیا گول ہے۔ وہ تو مذہب کے پڑھائے سبق سے آگے قدم بڑھا نہیں سکتا

ضد نہ تھی شاید سمجھ کا پھیر تھا من گئے وہ میں نے جب اُلٹی کہی
سیدھی بات اور مدھی عقل میں کیونکر آئے؟ راستبازی۔ دیانتداری سے ہر جگہ کام نہیں چلتا۔ یہ دنیا ہے۔ اُلٹی کہہ کر کام نکال لینا بڑا چلتا ہوا نسخہ ہے۔ یہاں "من گئے وہ" میرزا یگانہ ہی کہہ سکتے تھے۔ "It is seldom that the great or the wise expect that they may be despised or cheated."

"His works give a true representation of the operations of the intellect others try only to paint the external appearance."

درد سے پہلے کروں فکر دوا؟ واہ یہ اچھی اُلٹو انسی کہی!
ہر کام اپنے وقت پر چسک ہوتا ہے۔ بعد از وقت کا تو ذکر کیا؟ قبل از وقت بھی قباحت سے خالی نہیں۔ اچھی اُلٹو انسی کہی! اک عاقر و زمرہ ہے۔ مگر اس میں بھی اک حکیمانہ پہلو نکال لیا۔
دامن یوسف ہی بھڑکا تا رہا عشق اور ترک ادب اچھی کہی!
مشن ہی تو فساد کی جڑ ہے۔ آگ بھڑکا یا کرتا ہے۔

دوست سے پردہ کیا۔ یہ کیا کیا؟ آپ بیتی چھوڑ جاگ بیتی کہی!
عشق صادق کی ہی تو ہیجان ہے۔ اپنا درد دل کہا بھی تو جگ بیتی کے پردے میں۔
شک ہی کافر کو مرے ایمان میں جیسے میں نے کوئی منہ دیکھی کہی
خدا نہ کرے کسی ناقدرے سے پالا پڑے۔ خلوص اور راستبازی کا یہ صلہ؟ کلمہ ٹھہ لینے ایمان لے آئے کو بھی منہ دیکھی بات سمجھتا ہے۔ یہ ہیں حقیق زندگی۔ کہ سقدر غلط کہتا ہے ترقی پسند پر و فیسہ کہ غزل کی شاعری محض خواب و خیال کی باتیں ہیں۔

کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہی؟ ہائے میں کیوں خدا لگتی کہی
کیا جواب ہے اس تسعیر کا۔ جس نے خدا لگتی کہی مارا پڑا۔

منفعت میں سن لی بیکانہ کی غزل ان سنی کردی جو مطلب کی کہی
قصیدہ کہنے کی تو کبھی تو فیتی نہ ہوئی محض غزل سنا کر مطلب نکالنا چاہتے تھے۔ آپ کی سادگی ملاحظہ ہو۔

کیوں ہوش میں کھڑا کیا کھل ہا ہا؟ حد سے گزرنے والے تیری ہی سزا ہے
حد سے گزرنے کا فرہ تو چکھ لیا۔ اب ہوش میں آئے ہو تو اس کا خمیازہ بھی بھگت لو۔ یہ ہی بیکانہ کا انداز فرزانگی۔ یہ وہ ردائی اور دیوانی شاعری نہیں ہے۔

آئینہ ہو گا ٹیڑھا ایسا تو نہیں ہوں دن دیکھتے یہ دھوکا اک طرفہ ماجرا ہے
ملک میں میرزا صاحب اتنے خلاف خصمانہ پروگنڈے کے سلسلے میں کیا کیا روایتیں
منہ بوجھتی ہیں کیا کیا غلط فہمیاں پھیلانی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ میرزا صاحب لکھنؤ کے دشمن ہیں
حالانکہ معاملہ اسکے برعکس ہے لکھنؤ میں جتنے اساتذہ گزشتہ ہیں میرزا صاحب سب احترام کرتے ہیں بغیر کراہ
یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میرزا لگانہ ترقی پسندوں کے دشمن ہیں جھوٹ بالکل جھوٹ۔ ایسا Genius
جس نے اردو شاعری کو اس مرتبہ علی پر پہنچا یا کیونکر ممکن ہے وہ ادبی ترقی کا دشمن ہو۔ اسی کے
ساتھ یہ بھی غلط فہمی پھیلانی جاتی ہے کہ لگانہ اگر نثری تو جانتے نہیں وہ کیا عجیب کتہ ترقی پسندی کے
کہتے ہیں۔ واہ جی واہ۔ اسے کہتے ہیں پروگنڈا۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میرزا لگانہ کو انگریزی
ادب کے جتنا صحیح ربط ہے موجودہ دور کے شاہ شہر آفریں دو تین ہی افراد کو اس زیادہ لطیف اور ہونکا
تکسیر اور گئیے کو میرزا صاحب نے جس حد تک پڑھا ہے سچے پڑھا ہے۔ ڈاکٹر جاسن ڈراکٹن
کارلائل اور ڈاکٹر جاسن خصوصاً ڈاکٹر جاسن کے مقدمہ شکسپیر اور وہ of peace
اور باسویل کی سو اچھری جاسن کا کافی مطالعہ نہ کیا ہوتا تو میرزا صاحب کے تنقیدی
مقالات میں یہ زور شور نہ ہی نہیں سکتا تھا۔ آئینہ ہو گا ٹیڑھا ایسا تو نہیں ہوں

صورت ہی ایسی پیاری کھیتورال ٹیکے فطرت کا اقتضا ہی ہے کہ کیا خطا ہے؟
سچی طلب ہے کچھ اور جھوٹی ہوس کچھ اور کیا بوسہ لینے والوں بھیک مانگتا ہے؟
یک جان اور دوقالب ہو کر تو دوری ہونگے دو ہیں جو تیسرا ہوا آنکھوں میں ٹھیکر ہے
دو ہیں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکر۔ اک مثل ہے مطلب یہ کہ دو دوشمنوں میں تیسرے کا
دخل بار خاطر ہوتا ہے۔

جان آتے آتے اک دن آجا تو عجیب کیا اُمید کا خیالی تپلا تو بن چکا ہے
راخ انجیل کا خواب بھی حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے سبحان اللہ کتنا سچا آرٹ ہے۔
تو حسن کا ہے دیوتا میں عشق کا ہمیر دیکھیں تو کون اپڑ سا کچے میں صافا ہے؟
دیکھو لگانہ کی خود شناسی خود اعتمادی کس کس رنگ سے نمایاں ہوتی ہے۔ یہ وہ خود اعتمادی
نہیں ہے جو کتابوں سے اُدھار لی گئی ہو۔ لگانہ کا ذاتی جوہر ہے۔ دیکھیں تو کون اپنے
سانچے میں ڈھالتا ہے۔ *His courage is visible in the words he speaks*
آغوش میں اب انکو کیا کھینچتی ہے دنیا بیگانگی نے جن کو اپنا بنا لیا ہے
منزل کی فکر کون ہو جیت ہو اور میں ہو پیچھے نہ پھر کے دیکھوں کعبہ بھی ہو تو کیا ہے
میرزا لگانہ کی توجہ اصل پر رہتی ہے۔ زروعات پر زیادہ دھیان نہیں دیتے۔

He is gifted to see the essential point & leaves all the rest aside as surplusage.

دست دعا سے اٹھا پردہ جو درمیاں تھا اٹھتی ہی آنکھ کیونکر اب یہ بھی دیکھنا ہے
غواص رفر فطرت ساحل کے پاس پہلے غوطے لگا رہا تھا اب غوطے کھار رہا ہے
اسرار قدرت کا اٹھا ہونا اب تک اس انداز سے بیان نہیں کیا گیا۔ ساحل کے
پاس غوطے کھار رہا ہے اس شدت طنز کے کیا کہنے ہیں۔

کیوں آپ سے بیگانہ بیگانہ ہے زمانہ؟
غالب کن جو ٹھہرے پھر پوچھنا ہی کیا ہے؟
نہ جانے کیا ہو یہ دیوانہ جنگجو بیٹھے خودی کے نشہ میں کچھ ان کہی نہ کہہ بیٹھے
یہاں ان کہی سے مراد ہے وہ امر حق جسے ذہنیت عائد تسلیم کرنے پر راضی نہ ہو۔

کہ جس کے رہتے نہ آوارگان بد آخار
قد قدم پڑھا پائی جب تودہ بیٹھے
مثال جس چوڑیوں میں بگٹے تو کیا؟
اسی کے گہرے ہیں یاں دوسرے جو تھیں
بقول پر و فیسر محبتوں کو رکھ پوری یہ ہے زندگی کی شاعری جیت انھیں کی ہوتی
ہے جو سخت جان ہوتے ہیں۔ حوادث روزگار کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دیکھئے ٹھٹھ
لفظوں میں کتنی تازہ رہ چھوٹی ہے۔ شعر پڑھ کر کتنی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔
معاملہ ہے دل دوست کا بڑا نازک
کروں جو آہ تو گر نفس کی تہ بیٹھے
دل کا معاملہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ بیان میں آ نہیں سکتا۔ مگر آہ کروں تو گر نفس
کی تہ بیٹھے کہہ کر قوت تخلیق کا روشن ثبوت دیا ہے۔ کتنی نازک کیفیت نفسی بیان کیا؟
سنبھل کے تولے تلوار دیکھئے ہتھیار
کہیں کلانی پہ دست ہوں نہ کہہ بیٹھے
امید وار ہیں احسان دوست ہم بھی
وفا کی داد نہ دے میوفا ہی کہہ بیٹھے
میوفا ہی کہہ بیٹھے۔ یہ بھی احسان ہوگا۔ اس طنز میں کس غضب کا درد بکھرا ہے۔
یگانہ آپ کی بالاروی کے کیا کہنے
جمال کیا ہے جو دامن پہ کرد رہ بیٹھے
خدا کے سامنے دامن سپارنے والے
وہ ہاتھ تھک گئے کیا مال مارنے والے
کیا عبرت کا مقام ہے۔ وہی دست تم جو جابرانہ تصرف کیا کرتے تھے اب عاجز ہو کر
خدا کے سامنے دامن سپارنے لگے۔
جھکے تو بنے کے آگے دے تو بندے
بہت اڑتے تھے شیخی بگھارنے والے
خدا کی دین ہے جنت ہو یا جہنم ہو
بھٹک بھی جاتے ہیں حج کو سدھار گیا
خدا کی یہ دین تو دیکھئے می بردہر جا کہ خاطر خواہ دوست۔

زمانہ سازوں کی یہ سادگی و پرکاری
بٹے سیانے ہیں دو ہاتھ ہارنے والے
یہ ہے زمانہ ساز عیاروں کی ابلہ فریبی پہلے دو ایک ہاتھ ہار کر حریف کو دائر پر چڑھالیتے
اور پھر دے مارتے ہیں۔

بلانہ ہو کوئی نازل سیاہ کاریوں پر
بہت سنو جیکے رنجیں سنوارنے والے
کہاں کا روز جزا۔ کل کے مرتے آج ہیں؟
اعنید و بچ کو ٹھوکر یہ مارنے والے
تھکاری جیت تو جب بھی لوٹیں گھر کرتے
زباں سے ہار نہ مانیں گے ہارنے والے
لگی ہو جسکے وہی چپ کی داد دیتا ہے
پکارتے ہے ناحق پکارتے والے
کشش کھائیں تو معراج میں بالاتر
خدا کو شیشہ دل میں اتارنے والے
کس میں اتنا دم ہے جو یہ کہہ سکتا خدا کو شیشہ دل میں اتارنے والے۔ تنی بلند فلسفیانہ حقیقت
بیان کی ہو کہ معراج کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہیں فرش پر عرش اتر آئے تو سہی۔ انسان ناخود
امتنا کا حامل ہے بشرطیکہ نظری استعداد کے صحیح نشو و نما کا موعہ لجاوے عرش کے اترنے
کا مطلب یہ ہوا کہ قوت جذب کشش حاصل ہو جائے۔ تو پھر فاصلہ کوئی چیز نہیں۔

میرزا صاحب کا اک اور شعر ہے
پیسے معلوم نہ تھا سلسلہ جذب کشش
اب تو پیغام و سلام آپ آسان ہو گیا
نکالتے ہیں اسی انھ سے جن میں شوخ و عیب
ہوں نصیب وہی منہ سپارنے والے
پہلے جسکے شوخ و عیب سپا بچھرتے تھے۔ مال ٹپکتی رہتی تھی۔ میسر نہ ہو سکی تو کھیا نہ ہو کر
اسی چیز میں اسی جذب سے عیب نکالتے ہیں۔ تھو
تھکائے دم سے سستا ہوں لو لے دے
سزا کے بعد خطا پر اُبھارنے والے
سخنوں کو حیران اور حاسدوں کو پریشان کر دینے والا آرٹ ہے جس کی کیا بکھی بکھی ہے۔

یگانہ کون؟ وہ بزم ادب کے بیگانہ
لڑائی چھپرے کے گھڑی اتارنے والے
اس مقطع میں جلد بازوں کے غلط خیال کی ترجمانی کی گئی ہے جنہیں اصل حقیقت کی
تواطلاع نہیں اور جلدی سے رائے ناپک کر لیتے ہیں۔ میرزا یگانہ جنگ میں خود پہل
نہیں کرتے۔ ہاں جب کسی تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے یاروں نے چھپرے کو پھیر لیا جواب
پایا جو ان کے دہم میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔

حاصل فکر نارسا کیا ہے
تو خدا بن گیا۔ برا کیا ہے

The poet is a voice of Nature. یہ ہے فطرت کی آواز کہ عرف عام
میں جسے خدا کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ انسان ہی کا تو بنایا ہوا ہے۔ مگر فکر انسانی کی سالی کتنی؟

بہت پہنچا تو نادیرہ یہ ریخیا
کھیل کی رسائی ہو چکی بس
کھیل بندے کا ہو خدا کیا ہے
مچو دے تو پھر خدا کیا ہے
دل ہے اپنی جگہ خدا اپنا
ہم غریبوں کا آسرا کیا ہے
انسان کے پاس اور کیا رکھا ہے۔ اس دل کے سوا بنانے یا بگاڑنے والا اور کون ہے؟
حسن کے ہتھکھڑے اے تو بہ
درد کیا چیز ہے دوا کیا ہے
جل جلالہ! کیا حقیقت بکری ہے جسکے مشاہدے سے آنکھیں کھل جائیں حسن وہ حسن
جسکا دکھڑا سے اشارہ میں درد پیدا ہو جاتا ہے اور ذرا سی توجہ سے کا فور ہو جاتا ہے۔
زہر ٹیچا نہ ہو تو زہر ہی کیا
دوست جب دے تو چھپا کیا ہے

"Wonderful expression of ideas, more pleasing to
taste & intellect than the things themselves."

رہنے دے حسن کا ڈھکا پردہ
وقت ہو وقت جھاٹ لکھا ہے
عکس میرا بھی پڑ گیا ناگاہ
ارے آئینے کی خطا کیا ہے
آئینے میں کسی کا سامنا ہو جانا محض اتفاقی امر تھا۔ اس اچانک بات پر ہر ماگر ہنسا کر
آئینے کو اٹھا کر پھینک دینا مزاح حسن کی کتنی پیاری تصویر ہے۔

وقت کی بات اور وقت کے ہاتھ
سہو کیا چیز ہے خطا کیا ہے
اے بھان اللہ! ایسا جگمگاتے مصرعے وقت کی بات اور وقت کے ہاتھ
ہر محل اور کس کے ذہن میں آ سکتا
تھا۔ اک ذرا سی لغزش کا اثر کتنی دور تک پہنچ جاتا ہے اور انجام کتنا ہولناک ہوتا ہے۔ یہ تو
دیکھئے سہو و خطا کے نازک سلسلے کا حل کس تمہ سانی سے نکل آیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعر کسی
قوت فکر کا نتیجہ نہیں خود فطرت کے عمل سے ظہور میں آ گیا ہے جل جلالہ! کتنی عجیب بات ہے کہ
کمال اپنی حد کو پہنچا پس کمال ہی کمال رہ جاتا ہے۔ صاحب کمال کی قابلیت اور شخصیت
نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

یا الہی یہ ماجرا کیا ہے
جانتے ہو مری صدا کیا ہے
موت کیا اور بلبلا کیا ہے
چشم حیراں مجھے ہوا کیا ہے
اکھ گیا پردہ اب رہا کیا ہے
اک تسلی سی ہے دعا کیا ہے
کیوں یگانہ یہ ماجرا کیا ہے
چس چس کیوں نہ ہوں؟ اپنے سوا اور کسی کو موجود ہی نہیں جانتے۔
در دل کی کوئی دوا نہ دعا
نہ سنا ہو گا راک فطرت کا
وہی نیرنگی طلسم ہوا
دیدہ دل سے بچھ اپنی طرف
نور ہی نور سے کہاں کا ظہور
کیا طلسم کی مشیت ازلی؟
اپنے ہی عکس پر ہو چس چس
چس چس کیوں نہ ہوں؟ اپنے سوا اور کسی کو موجود ہی نہیں جانتے۔

خدا کی مار وہ ایام شور و شر گزرے وہ جن سوار تھا سر پر کہ سر در گزرے
غزل کا شعر آفاقی وسعت جا معیت رکھتا ہے۔ قوم کی قوم پر بھی صادق آتا ہے
اور افراد پر بھی۔ اس وقت تو یہ شعر جنگجو قوموں کے انجام کار کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ سر پر وہ
جن سوار تھا کہ کچھ سوچتا ہی نہ تھا۔ یگانہ آرٹ کے زمانے میں ایک گمراہ ترقی پسند
پروفیسر کا یہ کہنا شکر غلط ہے کہ غزل میں جن و عشق اور تصوف ہوتا ہے۔ اور بس۔
مگر یہاں تو حقایق زندگی کی تصویریں ہیں۔

مے فرستے بھی شاید میں آپ کے جاسوس کہ آہ کرتے ہی پرچہ لگے خبر گزرے
سیاست نے وہ پہرہ بٹھا دیا ہے کہ سانس بھی لیجئے تو وہاں پرچہ گزرتا ہی اطلاع ہو جاتی ہے
حلال بھی مرے حق میں حرام واویلا نگاہ شوق سے کیا کیا گل و ٹبر گزرے ؟
یہ ان محکوم محروم قوموں کی زندگی کا نقشہ ہے جو خود اپنے وطن میں اپنی سرسبز
کھیتوں کے باوجود دانے دانے کو محتاج ہیں۔ یہ ہے وہ غزل جو زندگی کی ترجمانی
کرتی ہے عشق و تصوف سے کیا واسطہ۔

جو سبز باغ تمنا پہ پھیرے پانی خدا بچا ہے ہم ایسی نظر سے در گزرے
شعر میں جس رجمانی نقطہ نظر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ہی تو دل خوش کن مگر کینک۔
شیریں خیالی زیادہ دیر تک قائم رہنے والی چیز نہیں کسی کی شیریں خیالی سے محض
اپنی رفتار تو بدل نہیں سکتی۔ پروفیسر غلط کہتا ہے کہ غزل کے اشعار میں انتشار و رگاندگی
ہوتی ہے غزل کا شعر جتنا محکم جتنا جامع ہوتا ہے یہ بات کسی صنف ادب کو نصیب
نہ ہوئی۔ اس جھوٹ اس فریب کا کیا ٹھکانا ہے کہ مضامین غزل کے تنوع اور رگاندگی
کو انتشار و رگاندگی سے موسوم کرتا ہے یہ نہایت فرسودہ اعتراض ہے جو حالی کے

زمانے سے کیا جا رہا ہے جو حاسدانہ بدبینی کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غزل کی
اسی لئے وضع ہوئی ہے کہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک زندگی کے
حالات میں جو تغیرات و انقلابات۔ بے ربطی و ناہمواری رونما ہوتی رہتی ہے
اس تنوع کی صحیح ترجمانی کی جائے۔

خدا کے بعد بھروسہ ہی حضرت دلکا خدا نخواستہ شک ایسی دوست پر گزرے
سارا اصول زندگی اس ایک شعر میں سما گیا ہے۔ زندگی کا دار و مدار دل کی استقامت
پر ہے دل پر بھروسہ نہ رہا تو پھر کیا رہا۔ میدان عمل میں دل ہی اپنا خدا ہے۔

نکاح اعیب میں سوچن جن میں سوچ عیب خیال ہی تو ہے جیسا بندھے جدھر گزرے !
خیال ہی تو ہے جدھر گزرے ” مفہوم اسی جملہ سے ادا ہو چکا تھا۔ مگر مصرع مکمل کرنے کیلئے
بیچ میں جگہ خالی رہ گئی تھی۔ یہ خشو کا مقام تھا۔ ہمیں پرشاعر کی قوت فکر اور شاعرانہ آرٹ
کا امتحان ہو جاتا ہے۔ میوزوں سے موزوں ٹر ٹر گئے رکھ کر معنی میں اضافہ کر دیتا ہے
”خیال ہی تو ہے جدھر گزرے“ اتنا تو اور کوئی بھی کہہ لیتا۔ مگر خیال ہی تو ہے جیسا
بندھے جدھر گزرے۔ کہہ کر معنی میں کتنا اضافہ کر دیا ہے اور کلام کو کتنا زور دیا ہے
کتنی سادہ زبان میں خیال کی بوالعجبی دکھائی ہے کہ حقیقت پر چاہے جیسا رنگ
چڑھا دے۔ خیال کے تصرف سے حقیقت کچھ اور ہی رنگ میں نظر آنے لگتی ہے۔
زمین پاؤں تلے سے نکل گئی تو کیا ہم اپنی دھن میں زمانے سے بھیجے گزرے ؟
دھن کے پکے پر آشوب زندگی کا یوں مقابلہ کرتے ہیں۔ اپنی مستقل رفتار سے
کبھی باز نہیں آتے زمانہ کتنا ہی مخالف ہو۔

آہ ترقی پسند دیکو کیا خبر شعر میں کہ مقام خشو بھی ہوتا ہے وہاں اک منجھے ہوئے فن کار کو اپنا ہنر
دکھانے کا خاص موقع ملتا ہے۔

پروفیسر کو معلوم ہی نہیں کہ میرزا صاحب نے غزل کے امکا کو سادہ اور ٹھیکہ اردو میں کہا تک وسیع کر دکھایا ہے۔ اب یہ کام ہے یگانہ کے نکتہ شناس تابعین کا کہ ان امکا نام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ زندگی بقدر دشوار اور سیدہ ہوتی جائیگی غزل میں اسی قدر سلجھانے کی طاقت بڑھتی جائیگی۔ مگر اسکے برتنے کا سلیقہ بھی تو ہو۔ یاد رکھو صنم کے ہاتھوں ہر دور میں غزل ترقی کرتی جائیگی۔ غالب کو نکلنا غزل کا جو شکوہ تھا وہ اب یگانہ آرٹ کے زمانہ میں اک فرسودہ سی بات ہے۔

ادب کے واسطے کتنوں کے دل دکھا ہیں یگانہ حد سے گزرنانہ تھا مگر گزرے !

کیوں یا زونہی ل سے بھلاؤ تو کیا کرے بندہ ترادعات کرے بد دعا کرے ؟
دوست کی بیوفائی دوست کیساتھ شوہر کی بے توجہی بیوی کیساتھ۔ حسب کی غفلت بندے کیساتھ ایسی حقیقتیں ہیں جنکا تجربہ عام طور پر ہوتا رہتا ہے۔ مگر با وفا بیوی۔ با وفا دوست۔ با وفا خادم۔ بیوفائیوں پر بھی صبر کرتا ہے بد دعا نہیں دیتا۔ یہ ہے انسانی زندگی کا اک دردناک پہلو مگر ”ترقی پسند“ پروفیسر کس دھڑائی سے کہتا ہے۔ ”شاعر کو زندگی سے علیحدہ دیکھنے کی عام غلطی سے تنقید نگاروں کی تنقیدیں کھولی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر مجموعی طور پر شاعر کی انفرادیت اور شخصیت کا ہلکا سا اندازہ ہو جاتا ہے لیکن شاعر کی سماجی شخصیت کا پتا نہیں چلتا۔ نہ یہ پتا چلتا ہے کہ اُسے زندگی کی کونسی قدیم اثر انداز ہوئیں اور نہ یہ پتا چلتا ہے کہ اُس نے عام رفتار زندگی پر کیا اثر ڈالا۔“
جھوٹ شرمناک جھوٹ کا یہ طومار کتنا مجربانہ فعل ہے۔ کون ہے وہ جو شاعر کو زندگی سے علیحدہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے ؟ خصوصاً یگانہ آرٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آرٹ زندگی سے واسطہ نہیں رکھتا۔ وہ مصنوعی قشاعین و محض دوراز کا تخیل میں اُلجھے رہتے ہیں امکا ذکر ہی کیا۔ وہ تو خارج از بحث ہیں۔ اُن کے ہمطات کو ذہن میں رکھ کر غزل پر چھوٹا الزام رکھنا کونسی دیانتداری ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یگانہ آرٹ سے شاعر کی سماجی شخصیت کا پتا نہیں چلتا۔ مذکورہ بالا شعر میں شاعر نے بیوفاؤں کی بیوفاؤں کا نقشہ کھینچ کر کیا اس امر کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ سماج کا درد بقدر محسوس کرتا ہے۔ اور کیا شاعر کی یہ آواز فقط ایک شخص کی انفرادی آواز ہے۔ ہرگز نہیں۔ اُسکا ایک ایک شعر بہت درد رسیدہ دلوں کی آواز ہے۔ پروفیسر جان بوجھ کر اس مسلمہ حقیقت سے آنکھ حرا تا ہے وہ یہ کہ شاعر محض آپ بیتی ہی نہیں کہتا، جب بیتی بھی کہتا ہے اور یہی ثبوت ہے اُسکی سماجی شخصیت کا۔ غزل کا شعر افرد پر بھی صادق آتا ہے اور جماعت پر بھی۔ یہ شخص کس دھڑائی سے یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ غزل کو باحسن و عشق و تصوف کے دائرہ میں محدود ہے۔ بھلا اس غلط بیانی کا کیا علاج ؟ یگانہ کی غزل اتنی ہی وسیع ہے جتنی سماجی زندگی۔ اسے اک اندھا بھی ٹھول کر دیکھ سکتا ہے۔

پھر کہتا ہے کہ ”غزل کے شعر سے اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ کون کونسی قدریں شاعر کی زندگی پر اثر انداز ہوئیں۔ یہ سوال ہی غلط ہے۔ کیوں شاعر کے ہر شعر سے اس امر کا جواب چاہتے ہو کہ اُسکی زندگی پر کون کونسی قدریں اثر انداز ہوئیں۔ اس بات کا جواب اُسکی سوانح عمری اُسکے طرز زندگی سے ملے گا۔ اُسکے کلام سے بھی اک حد تک اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ مگر وہ فقط آپ بیتی نہیں کہتا جب بیتی بھی کہتا ہے۔ اسکا ہر شعر فقط اُسکی شخصی زندگی کا آئینہ نہیں ہوتا بلکہ سماج کی زندگی کا بھی۔ مذکورہ بالا شعر سے شاعر کے نزدیک وفا کی قدر مسلم ہے اور یہ فقط شاعر کی شخصی آواز

نہیں ہے بلکہ سراج کی آواز ہے۔ اس آواز کا اثر عام رفتار زندگی پر ہونا لازمی ہے یعنی جن لوگوں میں وفاداری کی اہمیت و ضرورت تسلیم کر چکی صلاحیت کے جنکار سیورٹھیک کے نگہداشت ہو وہ یقیناً سماجی زندگی کیلئے وفاداری کو ناگزیر اور بیوفائی کو ناروا سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔ نامکن ہے کہ شاعر کا کوئی سچا شعر عام رفتار زندگی پر اثر نہ ڈالے۔ یہ شعر بیوفائوں کے حق میں بھی دعائے خیر کی تلقین کرتا ہے انتقام لینے یا بدو عادیہ پر نہیں آگستا۔ یہ ہے انسانی شرافت کا ثبوت۔ کون ہے جو بیکانہ آرٹ کو انسانی زندگی یا سماجی زندگی سے علیحدہ سمجھ سکتا ہے۔ اس کھرے سکے کو چھوڑ کر اور کھوٹے سکوں کو سامنے رکھ کر غزل پر چھوٹا الزام رکھنا شرم کی بات ہے۔

آتنا تو زندگی کا کوئی حق ادا کرے دیوانہ وار حال پر اپنے ہنسنا کرے
 دیوانہ وار حال پر اپنے ہنسنا کرے۔ کون ہے جو اس شاعری کو زندگی سے علیحدہ ٹھہرا کر یہ اُن اہل بصیرت کی زندگی کا فوٹو ہے جو کبھی زندگی سے بیزار نہیں ہوتے۔ ہر حال میں موافق ہو یا ناموافق، ہنسی خوشی گزار کر زندگی کا حق ادا کرتے ہیں۔ تنگدل نہیں ہوتے۔ یہ ہے وہ شاعری جو انسان کو عالی حوصلگی کے مرتبہ پر پہنچا کر زندگی کی تلخیوں کو مٹاتی ہے۔ یہ ہے اسکا اثر یہ ہے اسکی افادیت۔ پروفیسر مذکور کہتا ہے۔

”معتقد نگاروں میں بعض غیر معمولی طباعی اور ذہانت کی وجہ سے شدت کے ساتھ انفرادیت پسند ہو جاتے ہیں۔ اس طرح نقاد عام طور پر اسی شاعر کو لیتے ہیں جس کا اثر ڈالا آخر کیوں نہ ہوں انفرادیت پسند؟ قدرت کی بخشی ہوئی انفرادیت کیوں انکار کریں۔ کیوں فطرت سے بغاوت کریں۔ ذہن اور طباع نقاد شاعر کی انفرادیت کی قدر نہ کر سکتا تو کیا کوئی احمق کر سکتا۔ ذہن اور طباع نقاد کسی شاعر کی انفرادیت نے گہرا اثر ڈالا تو اس

شاعر کی فصیلت ثابت ہوتی ہے کہ نگاہیں۔ اس کسی احمق پر اثر ڈالا ہو تا کوئی قابل لحاظ بات تھی۔ رفتار زندگی میں کون آگے کیا مجال طوفان ٹھہر چکی جاے تو دیر یا بہا کر یہ ہے آئین فطرت۔ یہ ہے عصر جدید کا سچا معیار غزل (جسکا نہ غزل نہ کہ ادب شائد) جس شاعر کا مرتبہ ثابت ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بیکانہ کی غزل زندگی سے علیحدہ کوئی غیر طبعی خیال آرائیوں کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر کہتا ہے اور غلط کہتا ہے۔

”نقاد کے جالیاتی نقطہ نظر کی رنگینی شاعر کو عام انسانوں سے بہت بلند بنا کر دکھتی ہے اور خالص وجدان کی کیفیت شاعر کے گرد و پیش خواب خیال کی خوبصورت دنیا باندیتی ہے۔ حسین پر اثر الفاظ میں کبھی معنویت کبھی لفاظی اور اسلوب بیان کی تعریف ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر غیر مرئی فضا تیار ہو گئی ہے جسکو مادیت کوئی تعلق نہیں۔“

پروفیسر کی یہ غلط انگیز عبارت رائی اور ابلہ غریبی نہایت قابل نفرت ہے۔ نقاد اگر شاعر کو عام انسانوں سے بلند پاتا ہے (بلند بنا کر دکھانا نہیں بلکہ بلند پاتا ہے) تو یہ کیا غلط ہے۔ نقاد کسی اعتبار سے شاعر کی بلندی ثابت کرتا ہے؟ ذہنی استعداد اور کسب کمال کے اعتبار سے یا ڈبل ڈول کے اعتبار سے یا دل گزار کا بنا کر دکھاتا ہے یا شاندار کو ٹھیلوں میں ہٹے اور شاندار موٹروں پر بلندے پھرنے کی وجہ سے؟ کیا ایک حقیقی شاعر اک ادبی صنف سے سنگدل ذہینوں کے مقابل میں بلند مرتبہ انسان نہیں ہوتا؟ کیا کوئی سچا شاعر اپنی ذہنی زندگی کو اک کر ڈرتی بننے کی زندگی سے بدل ڈالنا گوارا کر سکتا ہے۔ کیا وہ زندگی کے حقائق عالیہ کو چھوڑ کر صبح دشام بانڈار کے بھاؤ اور اسکے اٹار چڑھاؤ کی فکر میں دوبار ہٹا پسند کر سکتا ہے ہرگز نہیں۔ وہ اپنی ذہنی زندگی کی قدر کرتا اور اپنے مرتبہ کو سچا مانتا ہے۔ یقیناً وہ عام انسانوں سے بلند مرتبہ انسان ہے کیونکہ وہ دنیا کے تمام معلموں میں سب سے بڑا اور کامیاب معلم ہے۔

غزل کی معنویت، الفاظ اور اسلوب بیان کی اگر کوئی نقاد سچی تعریف کرتا ہے تو کیا برا کرتا ہے یہ نہ کرے تو کیا کرے۔ کیا معنوی حقایق پر روشنی ڈالنے سے سماج کی حالت پر روشنی نہیں پڑتی؟ کیا سماج ان معنوی حقایق سے فیض نہیں پاتا۔ اب اسلوب بیان یہ بڑی نعمت ہے۔ جو عام لوگوں کو عطا نہیں ہوتی معنوی حقایق کی قدر و قیمت اسلوب بیان ہی سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ انسانی ذہن طبعی طور پر بیان کی خوش اسلوبی سے متاثر اور بد اسلوبی سے متفرق ہوتا ہے۔ اسکی اہمیت سے نہ کوئی شاعر چشم پوشی کر سکتا ہے نہ کوئی نقاد۔ میرزا یگانہ کی نسبت کون یہ کہہ سکتا ہے کہ انکا شعر محض خواب خیال کی دنیا بسا دیتا ہے۔ یہاں تو سراپا حقایق زندگی کی تصویر ہے طوفان ٹھہر بھی جائے تو دیا بہا کرے۔ یگانہ آرٹ میں جو کچھ نظر آتا ہے کیا سچ ہے خواب خیال کی باتیں ہیں؟ کیا واقعی یہ آرٹ کوئی غیر مرئی فضا پیدا کرتا ہے کیا اسے مادی علمی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ذرا اگر بیان میں منہ ڈالکر دیکھو تو سہی۔ کیوں حقیقی آرٹ سے آنکھ پڑا کر غزل کو جھوٹ موٹ بدنام کرنے کیلئے گھٹیا قسم کی نقلی غزل بازیوں کو زربحت لاکر دھوکا دیتے ہو۔ یگانہ آرٹ کے زمانے میں غزل کو خواب خیال کی دنیا کہنا فتوریت نہیں تو اور کیا ہے؟ دلی خبر تو لے مے روشن دل و دست یہ اندھی روشنی ہی تہ الٹی دعا کرے مغربی تمدن کی نئی روشنی نے وہ اندھیرا یا کلا انسان پر عافیت تنگ ہو گئی۔ امن و اماں کا جنازہ نکل گیا۔ یہیں اندھی روشنی کی برکتیں۔ اب یاروں کو *change heart* کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

کیا پوچھتے ہو عشق کا جن پر وہ بدلا تم پر سوار ہو تو خدا جانے کیا کرے؟
تھیں عشق سے پالا نہیں پڑا۔ یہ تو وہ بدلا ہے کہ دنیا کا سب بڑا شہنشاہ تاج و تخت

چھوڑ کر الگ گیا۔
مذہب کے ساتھ ساتھ ہے شیطان کا بھی ڈر دیوانہ تیرا ایک نہ مانے خدا کرے
دیوانہ تو دیوانہ اور وہ بھی تیرا دیوانہ۔ نہ مذہب جانے نہ شیطان کو مانے اس *humour* کے کیا کہنے۔

آنکھوں کے آگے پھر کوئی پردہ سا اٹھ چلا شاید امید وہم میں پھر مبتلا کرے
تاکہ آگے کوئی چاند ستارہ تو جائے ہے عرش پر دماغ فلاطون ہو کرے
اس طنزیات کے کیا کہنے۔ یہ ہے علمی زندگی کیلئے اک درس عمل۔ شیخ چلی کے سے منصوبے
باندھنا اور بات ہے اور محسوس کام کر کے دکھانا اور بات ہے۔

جاتی ہے کسکی پیش تری بارگاہ میں؟ البتہ کوئی گونگی زباں التجا کرے
جہاں زبان کھل نہیں سکتی وہاں بے زبانی جادو کا کام کرتی ہے۔
میر کا رہا تھا اٹھائے سرے سلام سے اٹھے ہی دست شوق مبادی اخطا کرے
کس منہ سے منہ پر تھے ہم انجام حسن پر کون اس گناہگار کے قصص دعا کرے؟
انجام حسن پر منہ پڑتا واقعی کتنی بڑی بیدردی ہے۔ اس گناہ کی بخشائیں نہیں۔
ایسی جھکی اوھر کہ نہ آٹھی کسی طرف دزدیدہ وہ نگاہ کہانتک فاکرے

یہ ہے ہندوستان کی پاکیزہ نسوانیت کہ جس طرف جھکی جھکی بھی پھر اور کسی طرف نہیں جھکتی۔
شوہر پرستی عورت کی وہ فضیلت ہے کہ زندگی اپنی تمام تلخیوں کے باوجود خوشگوار رہتی ہے۔
پھر میری منہ کی نہ یگانہ کی صاحبی صاحب وہ کیا جو منہ سے اپنے دعا کرے؟
کس دم کی روشنی زندان آب گل میں ہے کونسا تنہا نشین وحدت سراے دلیں ہے
کونسا تنہا نشین وحدت سراے دلیں ہے کتنی دور کی بات ہے۔ اور کس اہمائی زبان میں

کہی گئی ہے جی تو یہ ہے کہ سب میں اس آرٹ کے سامنے اور کسی کے کلام کو (خواہ وہ کوئی ہو)
شعر سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔

سوچتا ہوں جب میں ہی میں لور کوئی نہیں ہونہ ہو کچھ بھید اس اندیشہ باطل میں ہے
فکر و نظر کا کیا پوچھنا۔ ہی تو وہ نعمت ہے جس کی بدولت پیغمبر یا شاعر مجرم اسرار ہو جاتا ہے۔
صبح و شام زندگی خواب پریشاں ہی سہی کچھ حقیقت کا بھی جلوہ جلوہ باطل میں ہے
غالب کی غزل سامنے رکھ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ یہ آرٹ کس ذہنی ارتقا کا نتیجہ ہے۔

کیسے کیسے دل زدہ آوارہ صحراب ہوئے رومی جی جسطرح محل میں تھا محل میں ہے
کھیل ہے جن نظر کا شمع کیا پروانہ کیا دل ہو جیتا ک ل جی جی تکی رشتی محفل میں ہے
اس جانتی جوت میں جو کچھ نظر آتا ہے اپنے ہی دم سے تو ہے۔ ورنہ آپ دو بے جگت
ڈوبا۔ یہ بھی بیگانہ کا اک لازوال شاہکار ہے ناقابل تقلید۔

الوداع اے ناخدا، نماحرم راز فنا گو ہر مقصود دیر یا میر یا ساحل میں ہے
باز آ ساحل یہ غوطے کھانے والے باز آ ڈوب مرنے کا مزہ دیر یا میر یا ساحل میں ہے
جب تک سچی لگن نہ ہو اقدام عمل نا حاصل۔ درس عمل تو ہر لڑر دیا کرتا ہے۔ مگر یہ وہ
الہامی آواز ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے۔ اس موضوع پر اتنا مکمل شعر اراد تو کیا فارسی دے
میں بھی نایاب ہے۔

شام غربت بھی ہے روشن آہری یاد وطن یاد کیا ہے اک اندھیرے کا اجالا دل میں ہے
یاد وطن کیا ہے ہاک ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا اک اندھیرے گھر کا اجالا جس نے
شام غربت کو روشن کر رکھا ہے۔ لکھنؤ کی یاد میں ایسا اچھوتا ایسا تسکین بخش شعر شاید ہی
کوئی کہہ سکا ہو۔ جب تک دل کو نہ لگی ہو ایسا شعر نکل ہی نہیں سکتا۔

انجمن میں چار وہ حاضر نہ ہوں غا۔ سہی دل یہ کہتا ہے بیکانہ کی جگہ ہول میں ہے
یہ ہے بعض نثر لیکھنؤ کے جذبات کی ترجمانی جو میرزا بیگانہ کے قد رشتاں ہیں
اور کبھی کبھی یاد کر لیتے ہیں

آ رہی ہے یہ صدا اکاں میں ویرانوں سے کل کی ہے با کربا د تھکے یوانوں سے
لے چلی جنت شل کھینچی صحر اک طرف ٹھنڈی ٹھنڈی ہو ہوا کی بیابانوں سے
یا دل پکڑے نہ کہیں کو چہ جہان کی زین خاک اڑتا جو نکل آوں بیابانوں سے
تکے چن جا کے کسی کو چیں اور دست جنوں کیوں الجھتا ہے عبت چاک گریبانوں سے
آج ہی کل میں چلنے کو تقسیم و شست تنگ آنے لگے دیوانے گریبانوں سے
نہیں معلوم ان آکھنوں کا اشارہ کیا تھا جنگ پرتل گئے تفرار مسلمانوں سے
آکھنوں کا اشارہ کسی سمت نفس سے دیکھا موسم گل کی خبر سنتے سے کانوں سے
چلتے چلتے تو گلے سے مل لیں آکھنوں سے اب سحر مونی کی کہدے کوئی پروانوں سے
کیا کوئی پوچھنے والا بھی اب اپنا نہ رہا درد دل دھننے لگے یا میں جو بیگانوں سے
نظر آئے جب آثار جدائی رنگ محفل سے نگاہ یاس بیگانہ ہوئی یا ران یکدل سے

تصویر لالہ گل کا خزاں میں بھی نہیں مٹتا نگاہ شوق و البتہ ہوا بتک نقش باطل سے
نہیں معلوم کیا لذت اٹھائی ہو اسیری میں؟ دل و شہی بھڑک اٹھتا ہے آواز سلسل سے
تعلقات کی بے خبر و خیر جگر سے ہو کر دنیا داروں کی زندگی بیکراں کستہ کھن ہو کر اسیر بھی
انسان زندگی کی دل آویزیوں پر بھڑک اٹھتا ہے ترک نہیں کر سکتا۔ خوف لذت اسیری!
کسی شے میں نہ ہوگی یاد و عرفان کی گنجائش اٹھلے ساغر چم کو بھی کوئی شیشہ دل سے
تصور نہ دیکھا یا شاہد مقصود کا جلوہ اتر آئی ہے طلیعی سبز زمین دل پہ چمیل سے
خیال کی کیسوئی سے خود لیلی کا سبز مینل پر اتر آنا۔ اس جذب و کشش اس اچھوتی جھیل کی

شال نظر سے نہیں گزری۔
 ابھرنے کے نہیں سحر فنا میں ڈوبنے والے
 کہا تک پردہ فالو سے سر کی بلا ٹپکتی ہے
 موت کا فلسفہ ایسی الہامی زبان میں بیان کرنا فانی سے بھی بن نہ پڑا حالانکہ موت
 میرزا صاحب کا پسندیدہ موضوع نہیں ہے *دعا و دعا* شعر کی
 معنویت اور الفاظ کا ترجمہ کمال پر پہنچ گیا ہے موضوع اتنا فخرناک اور شہرت اند لکھش
 سر کی بلا ٹپکتا اک عام روزمرہ ہے جیسے ایسا حکیمانہ تصوف کسی نے نہیں کیا۔
 ہر کسی چار دیواری غنا صبر و خیال کتنا ہے؟
 اسی فلسفہ کو غالب نے بھی بیان کیا ہے مگر کس بھونڈے طریقے سے؟
 مری تعمیر میں مضمر ہے اک تصور خرابی کی
 غالب کا شعر غزل خشک اور بے مزہ فلسفہ ہو کر رہ گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ
 جنگل سے پکڑ کر لائے گئے ہیں اور کٹھن سے میں بند کر دئے گئے ہیں۔ برخلاف اس کے
 میرزا بیگنہ نے اسی فلسفیانہ تخیل کو شعریت میں سمودیا ہے الفاظ کا ترجمہ کتنا دلکش ہے۔
 یہیں سے کبر لو یا اس اتنی دور کیوں جاؤ
 غم آباد کا دانا ملا ہو کوئے قاتل سے
 فریب نفس کا جب احتمال ہوتا ہے
 تو فرق عشق و ہوس بھی محال ہوتا ہے
 بقدر وصل ملتی ہو دو عشق و ہوس
 فرج حُسن میں کیا اعتدال ہوتا ہے
 غیب کے کہ ٹپکے سے مٹ نہیں سکتا
 وہ حُسن ہے جو سرِ برج الزوال ہوتا ہے
 یہاں تک کہ ایک ایک خاک کا تپلا
 چھینیں آپ ہی اپنی مثال ہوتا ہے
 عجیب سے یہ طلسم خیال ہوتا ہے
 نئی زمین نیا آسمان نئی دنیا

کتاب عمر ہے گویا انیس تنہائی
 نظریں قصہ ماضی و حال ہوتا ہے
 خراب ہو چلی زندان آب گل کی ہوا
 اب ایک سانس بھی لینا محال ہوتا ہے
 امید و بیم کا کو سو بپتا نہیں بلتا
 خراب جب طلسم خیال ہوتا ہے
 زلال و درد میں زونوں دوا درد خار
 بس ایک گھنٹ میں چہرہ کال ہوتا ہے
 خلا میں سانس تو ہو نہیں سکتا
 مشاہدہ میں کہیں احتمال ہوتا ہے
 بھر آتی جاتی ہے شوق فنا میں جمع کی کو
 نسیم صبح سے اور اشتعال ہوتا ہے
 فقس میں ذکر شمع گناہ بے لذت
 نہ ہر حال نہ کوئی تم خیال ہوتا ہے
 بہار عمر گزشتہ پہ پیچھے رخصت
 خزاں میں ذکر خزاں حُسن حال ہوتا ہے
 خزاں کی ضد پہ بیاندھی ہی باغیاں کھر
 چمن کو آگ لگا کر نہال ہوتا ہے
 کتنی غیب بات ہے کہ چل چلاو کے
 کتنی غیب بات ہے کہ غنیم فائدہ نہ اٹھا سکے
 جان بوجھ کر تباہ کر دیتا ہے کہ غنیم فائدہ نہ اٹھا سکے
 نگاہ یاس سے اوچل ہو کاروان حرم
 جس کے شہر سے دل پا کمال ہوتا ہے
 ارے پھیل ہیں یا شاہکار قید تھے؟
 مکمل سیکے نہ کوئی دیکھی ایک صورت کے
 دکھائی خواب پریشاں نے سیرِ سرنگ
 بھرم کھلے نہ فلسفہ استنباط حقیقت کے
 ہمیشہ منتظر انتظاب رہتے ہیں
 مزاجِ ادال ہیں جو ہر نگاہ رازِ فطرت کے
 بلند و پست برابر میں اپنی آنکھوں میں
 خیالِ رغام ہے یا دلوں میں ہمیت کے
 کھٹکتا ہے حرم و دیر کے دو پہر ہے
 خلاف جانہ سکے شاہراہ فطرت کے
 دکھائی موت نے تصویرِ وعدہ فردا
 ہوائے شوق نے پردے اٹھاے غفلت کے
 وطن تو کیا ہے ہوا وطن سے ہیں بیزار
 اپٹ ہے جو بکولوں سے شہرِ غربت کے

گمانہ کاٹ سکے اپنا دے ناکامی
 نہیں پہنچنے کے پتوں کے کیوں دھنی ہے
 سعادت اندی ہے مشیت ازلی
 اسی نے خاک کیا تھا اسی نے پاک کیا
 نگاہ یا نہیں ہے آئینہ غم و دا
 سلامت رہیں دلیں گھر کر نیوالے
 گلے چھری کیوں نہیں پھیر دیتے
 اندھیرے آجائے کہیں تو ملیں گے
 چھپے دامن ابر رحمت میں آخر
 گریباں میں منہ ڈالکر خود تو دیکھیں
 طلسم حوادث کی تہ کو نہ پہنچے
 اس آئینہ خانے میں کیا سراٹھاتے
 کھڑے ہیں دور رہے پیر و حرم کے
 سرخام گل ہو گئی شمع بالیں
 کجا صحن عالم کجا کنج مرقد
 بیکانہ دہی فاسخ نگھنوں ہیں
 آہ بیمار کارگر نہ ہوئی
 صبح تھن ہوئی شب تاریک
 شب امید کٹ گئی لیکن

پہاڑ کاٹتے ہیں روز و شب مصیبت کے
 کفن ملے تو سمجھنا دھنی تھے نصرت کے
 ہوں فضول بھروسے حسن خدمت کے
 خوش نصیب جو پالے پڑے محبت کے
 نظر کے سامنے سماں نہیں قیامت کے
 اس اجڑے مکان میں بسر کرنے والے
 اسیر و نکوبے بال پر کرنے والے
 وطن سے ہمیں در بدر کر نیوالے
 یہ کاریوں میں بسر کرنے والے
 برائی پر میری نظر کرنے والے
 زمانہ پر گہری نظر کرنے والے
 حقیقت پر اپنی نظر کرنے والے
 تری جستجو میں سفر کرنے والے
 سلامت ہیں اب تک گھر کر نیوالے
 بسر کر رہے ہیں بسر کرنے والے
 دل سنگ آہن میں گھر کر نیوالے
 چرخ کا نیا لکڑی ہوئی
 صورت یار جلوہ گر نہ ہوئی
 زندگی اپنی مختصر نہ ہوئی

دور سے اُن کو آج دیکھ لیا
 آنکھوں آنکھوں میں لے لیا وعدہ
 اُف رہی چشم عقاب رفیع جلال
 فکر انجام و حسرت آغاز
 کھلنے والا نہیں در توبہ
 ایسا رو نا کجی کوئی رو ناسے
 ہٹ کے بالیں کوک دے میں
 نیم جاں چھوڑ کر جلا قاتل
 مشعل بھی یاد کرتے ہیں تیرے مجھے
 ناخدا اپنی سی کر گزرا مگر مجھ پر تھا
 خواب آرزو تیرے خود اپنے تو کیا تو کیا
 دور سے مننے ہیں ظالم یا شکستہ جان کر
 مانگنے دیتا نہیں پانی دل اندا طلب
 درد سہی جستجو بھی درد دل حاصل ہوا
 بعض اوقات انسان جانا بوجھ کر گمراہ ہونا چاہتا ہے مگر فطرت اسے گمراہ ہونے
 نہیں دیتی۔ *Life governed by Divine influence*
 جلوہ بزرگ تھا پردے کے اندر کچھ تھا
 حق بجانب تھا جو اید نشہ تھا محل سے مجھے
 دیدہ دل بے نیاز جلوہ امید ہے
 یاس کیا دہی اس نقش بالیل سے مجھے

دلو تسکین ہوئی مگر نہ ہوئی
 کانوں کان ایک کو خبر نہ ہوئی
 برق سوزاں ہوئی نظر نہ ہوئی
 دو گھڑی چین سے بسر نہ ہوئی
 فکر انجام وقت پر نہ ہوئی
 استین آسویں تر نہ ہوئی
 جیسے بیمار کو خبر نہ ہوئی
 نگہ یاس کارگر نہ ہوئی
 فتح حق کی داد ملجائی اور باطل سے مجھے
 کھینچ لایا پھر مقصود ساحل سے مجھے
 غفلت امروز فرصت کی شکل سے مجھے
 خیر مقدم کی صدا دیتے ہیں منزل سے مجھے
 خوں بہا کیا مانگنے دیگیا یہ قاتل سے مجھے
 واہ کیا دولت ملی اس فکر باطل سے مجھے
 بعض اوقات انسان جانا بوجھ کر گمراہ ہونا چاہتا ہے مگر فطرت اسے گمراہ ہونے

مژہ گناہ کا جب تھا کہ با وضو کرتے
کبھی نہ پرورش نخل آرزو کرتے
سبب نہ دے تو پھر کیا پری تھی خار و کو
گناہ تھا بھی تو کیا گناہ بے لذت
بہانہ چاہتی تھی موت بس نہ تھا اپنا
دلیل راہ دل شب چراغ تھا تنہا
ازل سے جو کشش مرگزی کے تھے یا بند
فلک نے بھول جھلیوں میں ڈال رکھا تھا
اسی حال نہ مردوں میں ہیں نہ زندوں میں
پناہ ملتی نہ امید بے وفا کو کہیں
ازالہ لگی نجاست کا اور کیا ہوتا؟
یگانہ کم سے کم اتنی تو لاج رکھنی تھی
کہ لکھنؤ سے وفا اہل لکھنؤ کرتے!

نگاہ شوق ہوتی یا نگاہ واپس ہوتی
وہ محروم ازل میں دھیامیں لانا نہیں ہوتی
نہیں نہ کسی کی یا نہ نافرمان نہیں ہوتا
ازل سے شتی امید تھی بے گناہ ساحل
غصیب منہ چھپانا سجدہ تاقی کے پردہ میں
نگاہ مضطرب کی احد ہر نافرمان خیالی تک

نقطہ لگی بدولت گرم ہے پہلو جلاں دیر
خزاں پہاڑی کاش اپنی آنکھیں بند ہو جاتی
جو روکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی بجاتے
جسد میں روح اک یوانہ تنہا نشیں ہوتی
بہار واپس ہوتی نگاہ واپس ہوتی
شہر کی سبب و غم و امن سے پہلے آئیں ہوتی
دم آخر فریب جلوہ بے رنگ نے مارا
نگاہ یاس ورنہ کیوں گنہگار یقیں ہوتی

دیکھا دیکھی جو کوئی آپ کا دیوانہ بنے
دل وہی دل ہے جو ہو اپنی حرارت فنا
بچ گیا دل کا کنول کشمکش شوق کجا؟
کیوں اچلے کوئی ایسا جو مرا منہ سی د
آپ آتے تھے مگر موت کو پہلے بھیجا
لانڈن شوق رہائی میں کوئی سر پہلے
دل آگاہ یہ جادو نہ چلے گا کوئی
دوب کر دیکھئے تو انسان کہیں کا نہیں ہے
نا لیکر ترا بہزاد اٹھاتا ہے قلم

نہ چھپا پر نہ چھپا جو ہر عالی ظرفی
یاس مٹنے پہ بھی خاک درخشاں بنے

ہم جن شمع بنے یا ہم جن دل ہو جائے
حسن بہ رنگ کہیں رنگ پر کسکتا ہے؟
حسن وہ حسن بھی جسکی حقیقت نہ کھلے
جل کے ٹھنڈا کہیں پردہ محفل ہو جائے
پردہ جب تک نہ کوئی بیخ میں جا لے
رنگ وہ رنگ جو ہر رنگ میں شامل ہو جائے

خاک کا پتلا ہے زفرانہ سے مجبور
صلح جوئی نے گنہگار تجھے ٹھہرایا
بھولنا سہل گناہوں کا بھلا نا مشکل
حق میں اور دل کے تری ذات سہرا اچھا
کون بھڑکے پھر اس کشتی بے لنگر کو
نا خدا کو نہیں اتنا تیرا کیا خبر
ایک ہی سجدہ کیا دوسرے کا ہوش کیا؟

اپنی ضد اپنی مشیت پہ جو آجائے کوئی
پاس سب حُسنِ عمل دفترِ باطل ہو جائے

خداؤں کی خدائی ہو چکی بس
کہیں تیرے بھی ہو سکتا ہو پانی
کسی دھبے نیٹ لو جب مزہ ہو
بجھائے کون تو جس کو جلائے؟
ہوا میں اڑ گیا ایک ایک پتہ
بھلا اب کیا چوں اپنی نظریں؟
کہاں تک کیجئے خون تیرا؟
لگا ہیں ملتے ہی دونوں گھونٹ
رہا کیا جب تو نہیں فرق آیا؟
ہمت پہنچا تو نادیدہ پہ رہی بھلا

ہمت تن گنت یا ہمت تن دل ہو جائے
جرم ثابت ہو کیا چاہو تو مشکل ہو جائے
تو جو یاد آئے تو آساں مشکل ہو جائے
وائے قسمت کہ مری ضد تو عادل ہو جائے
دل اگر درو خدا داد کی منزل ہو جائے
دوب کر دیجئے تو بیگانہ ساحل ہو جائے
ایسے سجدہ کا یہ انجام کہ باطل ہو جائے

کیسے چوتے ہی گال کاٹا؟
کہو یا آشنا کی ہو چکی بس
پڑے ہو کون سے گوشے میں تنہا
بیگانہ کیوں، خدائی ہو چکی بس

موت آئی آنے دیجئے پروانہ کیجئے
تہ کی خبر بھی لائے ساحل کے شوقین
نا آشنا حُسن کو کیا اعتبار عشق؟
دیوانہ وار دوسرے کوئی کیٹ نہ جائے
پلٹتی ہے بہت یاد وطن جب ان دے
برابر بیٹھے والے بھی کتنے دُور تھے دل سے
ارادے نے عمل کی راہ پائی کتنی مشکل
مشیت اپنی تو جانے کوئی گم گشتہ کیا جا
اسی کو مان لوں رقی زمانہ ساتھ دے جا؟
تمام انسان تو کیا دو بھی برابر ہو نہیں سکتے
نہ ترک اختیار آساں نہ ضبطِ اعظم آراں
ہوا غیبِ اہلِ ہر دلوں دیکھ کیا ہو
سنگر کتنے دے بیٹھے اس اندازِ بغاوت پر
ریا کاری مستلما ہاتھ بچا پڑتے ہیں سکتا
ہو سکتی انوکھی اقتضا کتنا جدا گانہ

لے دو اب دلی الدولہ پہاڑ کا انجام نیک حیدر آباد میں یادگار رہے گا۔

کمال عشق کس دھن میں آنا ایسی پکار اٹھا
گر بیان بچا کر وہ بھی نکل آئے مجھ سے
مناجرت میں بھی درد پیدا ہو چلا شاید
پھر کمال عشق تھا عالم پہلے کیا کس قبل
خونے خیرے اللہ اس دیرینہ دشمن کو
بلا سے زبردگی لپٹی ہو آفتاب نیم نسل سے
تمیز رنگ تو بھی حیرت دیدار صدے
کوئی کیا جاساں اس حاضر ہوں باغ ہو محفل سے
دل طوفان کن تنہا ہوا گئے تھا سو اب بھی
بست طوفان کھنڈ پر گئے مگر اسے ساحل سے
گھر جانا اشارے پر نہیں آگئے نکل جانا
یگانہ سے تجھے مطلب کہ راہ و رسم منزل سے

یگانہ کی شاعری انجہ کی شاعری ہے۔ لفظ نہیں میں جس مقام پر آیا ہے اس سے
انجہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

نظارہ پہ کیا گزری آشوب تماشا سے
ہوش آتے ہی ہوانے کھوئے گئے دنیا سے
دیوانے ہوں شرمندہ کیوں شرم تھا سے
اللہ ری خود مٹی باز آگئے سیلی سے
دن بھر تو یہ پر داتے جیتے تھے نہ مرنے تھے
کیا کیا نہ تھے فتنے اک شعلہ تنہا سے
دل اپنا جلا تا ہوں کعبہ تو نہیں ڈھاتا
اور آگ لگاتے ہو کیوں ہمت بجا سے
لے رہن بے پروا مشکل مری آساں کر
کیوں آنکھ پر تاپ ہے گم گشتہ تنہا سے
فرہ بھی ہے اک عالم انوار الہی کا
ادنیٰ ہی سہی لیکن نسبت تو ہر اعلیٰ سے
حیران ہیں نظر والے میناب میں دل والے
کچھ رنگ تماشا سے کچھ بولے تمنا سے
کیوں دلکا کنول آخر لہر تاپ سے رہ رہ کر
جھنڈکا کوئی آپہنچا کیا عالم بالا سے
کیا اپنے تئیں دیکھیں کیا ہو گئے اور کیا تھو
زقار نظر عاجز رفتار تماشا سے
جو دم ہے غنیمت ہو یا جاسے کل کیا ہو
اک دور کی سبت ہے امر و زکو فرما سے

تہ چاٹا جاتا ہے یہ زور دھالے کا
مگر کے پلٹ آئیں موجیں لبِ ریا سے
دنیا کی ہوا کھا کر کیا دند چاٹی تھی
بیٹھے ہو یگانہ اب کیوں نہ میں تنہا سے

انوکھی معرفت اندھوں کو حاصل ہوتی جاتی ہے
انوکھی معرفت اندھوں کو حاصل ہوتی جاتی ہے
بلندی کیا ہو سکتی کیا ہو لی کا فرمائی
برائی میں بھلائی دیکھتا جاؤں مگر کتبک
کہاں لجا نیکی یہ وسعت آفاق کیا جانے
نہ کترے نہ بل کھائے تو پھر دھاراکہ دھاراکہ
نحبت کا فرہ بگڑا کہ نہیت بھری اپنی
گناہ عشق امر اضطراری کے سوا کیا تھا
تجھے دیکھو تو سمجھو حسن کے منی و جدا نی
زہے شانِ خداوندی گنہگاروں پر یہ
نظر کرنے لگی میری بھی اپنے شیشہ دل پر
مے و ملیں لگا کر آگ آگھیں سینے والے
چلو تم بھی سنو شور و لا نرم یگانہ میں

یگانہ لکھنؤ کی سیر کرتے تو اچھا تھا
طبیعت سان پر چڑھنے کے قابل ہوتی جاتی ہے

مناجرت کا دنیا سے کچھ کشیدہ سہی
فریب کھاؤ گے پھر بھی فریب یہ سہی
یہ غنچہ کیا کہ دیکھے سے دل دھڑکتا ہے؟
ارے یہ ایک ہی فتنہ ہے نو میدہ سہی

یہ نیرباغ کا عالم یہ رنگ بیل و نہار
نگاہ شوق کی گری خدا کی قدر سے
کھٹکتی رہتی ہے دل میں نگاہ درویدہ
نگاہ جن سے ابتک فاطمہ کی ہے
فریب اب کرم بھی بڑا سہارا ہے
قریب ہوں مگر اتنا کہ جیسے کوسوں دور
ہو جو بگڑی تو خدا ہی کہے چھوڑی
پتے کی کہیے تو ظالم کا رنگ اڑتا ہے
خدا کی بات خدا جانے کوئی کیا جانے
مکمل ہی جاتا ہے مطلب تری قسم کھا کر
انسان ظالم و جاہل انسان ایسے کیسے گندے کام کرتا ہے اور پھر یہ دھناتی کہ
مسیح میں جا کر بھولی قسم کھا لیتا ہے۔ اپنی ضرورت سے خدا کے نام کا کتنا گندہ مصروف
لیتا ہے۔ الہی تو بہ! شعر پر غور کرہ تو رنگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
مری نظر کی خطا ہوگی یا لگوں کی خطا
یگانہ ٹھن گئی یہی صفت سوچتے کیا ہو
شریک کار نہیں تو نہیں جریدہ ہی

سنت چشم دید مگر خطا عشق کہے کون چشم دیدہ ہی
کہ جریدہ یعنی تنہا۔

کیوں کسی سے وفا کرے کوئی دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
ایسے بھی تو انسان اسی سماج میں موجود ہیں جو راستبازی و وفاداری کا تلخ تجربہ
کر لینے کے بعد بھی وفا سے باز نہیں آتے۔ شعر جس حقیقت کا حامل ہے اس پر نظر
کرتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ محض خواب و خیال کی باتیں ہیں یا کسی ذہن نقاد
کے "خلاق دماغ کی خود رو تحریک کا نتیجہ ہے"۔ یہ وہ فیسر کہتا ہے کہ ایسی خیالی تنقیدیں
اُن لوگوں کو آسودہ نہیں کر سکتیں جو ادب کو اجتماعی کشمکش حیات کا منظر مانتے
ہیں اور ادیب کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کشمکش حیات کے کسی نہ کسی پہلو کا ترجمان
خیال کرتے ہیں۔

کتنی فضول ہے یہ کہ اس کوئی شاعر کوئی ادیب ایسا نہیں پیدا ہوا جس نے
کشمکش حیات کی ترجمانی کسی نہ کسی پہلو سے نہ کی ہو۔ خصوصاً یگانہ آرٹ جو سراسر
کشمکش حیات کی ترجمانی کا حق ادا کرتا ہے۔ اس شعر کو دیکھو، ایک طرف بھادوسری
طرف وفا آخر یہ کشمکش حیات کا منظر نہیں تو اور کیا ہے؟

مفلسی میں مزاج ششماہانہ کس مرض کی دوا کرے کوئی
ایک تو مفلسی اس پر مزاج ششماہانہ جو بجائے خود اک بڑا مرض ہے۔ کیا ٹھکانا
ہے اس طنز کا۔ شعر ضرب المثل کی حد کو پہنچ گیا۔

درد ہو تو دوا بھی ممکن ہے وہم کی کیا دوا کرے کوئی
وہم کی دوا القمان کے پاس بھی نہیں۔ اس قولے کو شعری زندگی یگانہ کے ہاتھوں ملی۔
مصرع پر مصرع لگا کر کس سادگی کے ساتھ حکیمانہ فکر کا ثبوت دیا ہے۔ سبحان اللہ۔
موت بھی آسکی نہ منہ مانگی اور کیا التجا کرے کوئی

درد دل پھر کہیں نہ روٹ لے
اب نہ چونکے خاکرے کوئی
عشق بازی کی انتہا معلوم
شوق سے ابتدا کرے کوئی
کیا سمجھتا ہے بیان اللہ شعر ضرب المثل ہو گیا۔

کو کہن اور کیا بسنا لیتا؟
بن کے بگڑے تو کیا کرے کوئی
سعی و تدبیر کی ابتدا کھادی ہے۔ یہاں آرٹ اپنی منتہا کمال کو پہنچا لا زوال ہو گیا جو
ایسے دم کی ہے روشنی ساری
دیدہ دل نو واکرے کوئی
شمع کیا طمع کا اُجالا کیا؟
دن چڑھے سامنا کرے کوئی
عصر حاضر میں اتنا جیتنا تسلط و غلبہ شعر کہنا بیکانہ کے سوا اور کسی کی بات نہیں
دن چڑھے کئے کو عارف و مرید سے مگر یہاں الہامی بان و جبریت اس مقام پر کوئی بلفظ نہ تھا گیا۔
غالب اور میرزا بیگانہ کا
آج کیا فیصلہ کرے کوئی؟
غیر دن چڑھے تو دو ٹوٹا قی شمع کا اُجالا کب تک؟
کس کی آواز کان میں آئی
دور کی بات دھیان میں آئی
کتنا معلوم ہو سکتا ہے کس کی آواز کان میں آئی؟ اس قدر وسیع المعنی ہوا
ہے کہ خیر و شر نیک و بد دونوں پہلوؤں سے مختلف متضاد معنی پیدا ہوتے ہیں۔

ایسی آزاد روح اس تن میں؟
کیوں پر اسے سکال میں آئی
شاہد یہ بھی وہ آواز جسے دور کی بات دھیان میں آئی میرزا بیگانہ کو جو اسیر طعنا ہوئی
ہے اس کے لئے موجودہ قالب موزوں نہ تھا۔ غالباً فطرت کا سہو ہے کہ ان کی آزاد روح کو
کسی آئینے قالب میں داخل کر دیا۔ ایسی آزاد روح اس تن میں؟
آپ آتے رہے بلاتے رہے
آنے والی اک آن میں آئی

ہاے کیا کیا نگاہ بھٹکی ہے
جب کبھی امتحان میں آئی
یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی؟
کہیے کیا بات دھیان میں آئی
علم کیا علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے کمان میں آئی
وہ دیکھو کنارہ بھاگتا ہے۔ واہے فریب نظر واہے فریب علم ہر خیال خوش
کون جانے نہاے حق کیا ہے
کس خدا کی زبان میں آئی
آخر نہاے حق کو چھپائیں تو کیونکر؟ کس خدا کی زبان میں نہاے حق آئی؟ وہ
خدا جو عربی بولتا ہے یا وہ جو عبرانی بولتا ہے یا وہ جو سنسکرت بولتا ہے؟ سب
اپنی اپنی بات کہتے ہیں کوئی بیوقوف اپنے میں بیوقوف نہیں جاتا
ایسی بات خطا کہ اف نہ کرے
ڈھیل جس کی زبان میں آئی
انشاء اللہ خدا کی سرگزشت تو معلوم ہی ہے۔ زبان کی ڈھیل سے بیچارہ پر کیا
آفت آگئی۔

حسن کیا خواب ہوا بیدار
جان تازہ جہان میں آئی
آپ کی یہ آکر ارے توبہ
کب کسی نوجوان میں آئی
اللہ سے بان بیکن۔ خدا معلوم میرزا صاحب نے شعر خود اپنی شان میں کہا ہے یا
کسی..... حضرت بخود دہلوی شعر نہ کرنا لے لے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب
بول رہے ہیں۔

جان لیوا ہے یہ چڑھی توری
یہ کشش کس کمان میں آئی
بات ادھوری مگر آخر دونا
اچھی لکنت زبان میں آئی
اس موضوع پر بیسیوں شعر مل جائیں گے مگر اس شعر کو شاید ہی کوئی پہنچ سکے

سادگی و برکاری ختم ہے میرزا یگانہ پر۔
 آنکھ نہی ہوئی اسے یہ کیا کیوں غرض دریاں میں آئی
 نفسیات کا اک دردناک مرقع ہے اچھوتا اور ناقابل تقلید۔

میں پیمر نہیں یگانہ سہی

اس سے کیا کسر شان میں آئی

کسر نفس کے ساتھ خود شناسی کا امتزاج، اس طنز لطیف کا دنیا میں جواب نہیں۔

جذبہ عاشقانہ دیکھ، حکمت بندگانہ دیکھ

بن کے یگانہ میں نے خود نقش دولی سٹاویا

جل جلالہ

مردے از غیب بروں آید و کاسے بکند

جس کی سعی مشکور کی بدولت یہ کار محمود ہے نیاز نام و نمود انجام پا گیا۔

زندہ یاد حیدر آباد زندہ یاد

اللہم صل علی محمد و آل محمد

میرزا امجد سیگ چغتائی

میرزا یگانہ
 چنگیزی لکھنوی
 غریب منزل حیدر آباد

رباعی

ہاں فکر سادہ دیکھ بڑا بول نہ بول
 گنجینہ راز اندھی تگری میں نہ کھول

جب کی غیبی ضرورت اپنی قیمت
 بڑا کھجی لکھا ہے کبھی ہے انمول

کارنامہ یگانہ

(۱) آیات وجدانی (جدید) بیسویں صدی کی فلسفیانہ
وجدانی غزل گوئی کا شاہکار جدید جس کی بڑی خصوصیت ہے زندگی کا سچا

کس بل جواب کے کسی دور میں پایا نہیں جاتا..... ص ۷

(۲) غالب شکن۔ اسم با سہمی جس نے غلجیوں کا بنا بنایا گھر وندا

بگاڑ دیا۔ بیسویں صدی کا حیات انگیز تنقیدی شاہکار وہ گنجینہ صداقت

جسے بھلانا چاہو بھی تو بھول نہیں سکتا..... عرصہ

میرزا حیدر بیگ چنگیزی سلطان بہادر روڈ لکھنؤ

ملنے کا پتا
میرزا یگانہ چنگیزی۔ بیوی و خانہ نظام شاہی حیدر آباد دکن

حب ڈوبہ (جسٹو)

چھوٹے بچوں کے تمام امراض کی مجرب دوا ہے
دلیسی دوا خانہ۔ فون ۲۹۸۴ نظام شاہی روڈ
حیدر آباد دکن

کارنامہ لیگانہ

(۱) آیات وجدانی - بیسویں صدی کی فلسفیانہ و وجدانی

شاہکار جدید جس کی بڑی خصوصیت ہے زندگی کا سچا

کے کسی دور میں پایا نہیں جاتا۔

(۲) ترانہ - مجموعہ رباعیات حسین فلسفہ حیات کے حقائق زندگی

حیرت انگیز سادگی و پرکاری، فلسفیانہ و شاعرانہ قوت کے

ڈال گئی ہے جس پر عمر خیا کی چھاؤں تک نہیں پڑی۔ خود مصنف کی ان

(۳) غالب مسکن - ہم بستی جس نے غلیچون کا بنا بنا یا گھر و نیا گھر

کا حیرت انگیز تنقیدی شاہکار۔

(۴) خرافات عزیزی - اک تنقیدی رسالہ پڑھنے کے قابل

(چراغ سخن - علم عروض و قوافی کا مستند و کارآمد رسالہ سلیجی ہوئی زبان میں

مسلنے کا پتہ: میرزا حمید ریگ چنگیزی سلطان